ترجمہ میں مداخلت: ایک اطلاقی مطالعہ

(اردو میں عربی ادب کی ترجمہ کردہ منتخب کتابوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے

پی ایچ ڈی

2015-2019

تحقیق کار

محمد طارق

رول نمبر A161122

نگران کار

ڈاکٹر سید محمود کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ترجمہ

شعبہ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

500032

فہرست

اظہار تشکر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء والمرسلین۔

اللہ تعالی کا بے پایاں شکر و احسان ہے کہ اس نے مجھے ''ترجمہ میں مداخلت ایک اطلاقی مطالعہ (اردو میں عربی ادب کی ترجمہ کردہ منتخب کتابوں کے حوالے سے)'' کے موضوع پر تحقیقی کام کرنے کی توفیق بخشی۔

تحقیقی کام شروع ہوا اور اللہ تعالی راستے ہموار کرتا گیا۔ بحث جس طرح آگے بڑھتی گئی موضوع سے مانوسیت میں اضافہ ہوتا گیا، گرہیں کھلتی گئیں اور کام آسان ہوتا گیا۔ خدائے بزرگ و برتر کی عنایتوں کے سہارے یہ مقالہ پایہ تکمیل تک پہنچ سکا۔ مقالہ کی تکمیل پر میں بارگاہ ایزدی میں سجدۂ شکر بجالاتا ہوں۔

بعدازاں میں اپنے نگراں، مشفق و مربی، استاد محترم ڈاکٹر سید محمود کاظمی صاحب (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ترجمہ) کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے ہر ہر قدم پر ہر طرح میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ہر گام مجھے ان کا مخلصانہ تعاون حاصل رہا۔ ان کے مفید و گراں قدر مشورے میرے لیے مشعل راہ بنے۔ انہوں نے پوری وسعت قلبی کے ساتھ علمی نہج پر بحث و گفتگو کی مکمل آزادی فراہم کی اور جب بھی ضرورت ہوئی اپنی مصروفیات کے باوجود وقت فارغ کیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان کو صحت و تندرستی سے نوازے اور ان کی علمی شخصیت سے تادیر ہم جیسے طالب علموں کو استفادہ کا موقع عنایت فرمائے۔ آمین، ثم آمین

میں صدر شعبہ ترجمہ ڈاکٹر محمد خالد مبشر الظفر صاحب (پروفیسر، شعبہ ترجمہ) کا بھی خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اولاً ان کے درس سے ہی اس موضوع کی طرف توجہ مبذول ہوئی۔ ان کی رہنمائی اور مشورے ہمیشہ شامل حال رہے۔ ساتھ ہی میں ڈائرکٹر ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلی کیشن و سابق صدر شعبہ ترجمہ پروفیسر ظفر الدین صاحب کا بھی سپاس گزار ہوں جنہوں نے تحقیق کے مختلف مراحل سے روشناس کرایا۔

میں شعبہ کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹرفہیم الدین احمد صاحب کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہوگا۔ جنھوں نے دوران تحقیق گراں قدر رہنمائی فرمائی۔تمام تر مصروفیات کوپس پشت ڈال کروقت دیا اور مفید مشوروں سےنوازا۔علاوہ ازیں ڈاکٹرمحمد جنیدذاکر صاحب (اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ ترجمہ) کاشکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے انتہائی اہم نکات کی طرف رہنمائی فرمائی۔ ڈاکٹر کہکشاں لطیف صاحبہ(اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ ترجمہ) کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے ہمیشہ نیک تمناؤں کا اظہار کیا، دعائیں دیں اور ہمیشہ افزائی فرمائی۔اس کے علاوہ شعبہ سے منسلک عملہ شکریہ کا مستحق ہے؛ کہ بہت سے انتظامی امور انہیں کی توجہات کے طالب ہوتے ہیں۔

میں اپنے ان تمام اساتذہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اپنا خون جگر صرف کیا،کورے کاغذ پرعلم وحکمت کےگل بوٹےنقش کرنے کی سعی پیہم کی۔جن کی دعائیں میرے لیے باعث افتخاراور سرمایہ نجات ہیں۔

اسی کے ساتھ میں اپنے تمام محبین کاشکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ہمیشہ عزم وحوصلہ کی تلقین کی اورکام کرنے کی طرف مجھے رغبت دلاتے رہے۔ میں اپنے ہردلعزیز ومخلص دوست محمد عدنان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے علمی ذوق سے مجھے کافی مدد ملی جومواد کی تلاش سے لے کرمقالہ کی ترتیب تک ہرگام میرے ساتھ رہے۔ میں اپنے تمام احباب بالخصوصڈاکٹرمحمد رفیق قاسمی، جرار احمد، دلشاد احمداور افروزظہیر، احمد نورعینی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔

اسی کے ساتھ میں اراکین مولانا آزاد لائبریری کاشکریہ ادا کرتا ہوں ، کہ ترجمہ سے متعلق بیش قیمتی کتابوں سے استفادہ کا موقعہ ملا،اس موقع پرخاص طور پر یونیورسٹی کے ذمہ داران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی توجہ سے ریسرچ کے لیے بہترسہولیات دستیاب ہوئیں۔علاوہ ازیں دیگر لائبریروں کے ذمے داران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جہاں سے بہ آسانی مواد کی حصولیابی ہوئی۔

اخیر میں اپنے والدین کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں، کہ ان کا شکریہ ادا کیا ہی نہیں جا سکتا ہے اور نہ ان کے احسانات شکریہ کے مختصر مفہوم میں سما سکتے ہیں۔خاص طور میں والدمحترم کو یاد کرتا ہوں جوتھوڑے عرصہ میں

ہم سے جدا ہو گئے، جن کی علالت اور پھر رحلت کا غم میرے لیے نا قابل بیان تھا۔ کاش مجھے ان کی خدمت کا موقع ملتا۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے اور تربیت اولاد کا اپنے شایان بدلہ عطا فرمائے۔ آمین۔ کائنات میں آنے کے بعد اولین درسگاہ اور اولین استاد والدہ محترمہ کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کا سایہ تاعمر میرے سر پر قائم رکھے۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں یہ محض ان کی دعاؤں کا صدقہ ہے۔ برادرم محترم فیاض احمد صاحب کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں جن کا تعاون اور جن کی نیک خواہشات میرے تعلیمی سفر کے لیے مشعل راہ ہیں۔ علاوہ ازیں تمام اہل خانہ شکریہ کے مستحق ہیں جو ہمیشہ میرے روشن مستقبل کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ بطور مسک الختام میں اپنی شریک حیات شگفتہ پروین کو گل تشکر پیش کرتا ہوں۔ اگر ان کی ترغیب شامل حال نہ ہوتی تو شاید اس کام کی تکمیل میں مزید تاخیر ہوتی۔ ان کی رفاقت اور معاونت شکریہ سے زیادہ کی مستحق ہے۔

والسلام

محمد طارق

تعارف مقالہ

ترجمہ کا وجود تاریخ کے نامعلوم دور سے ہے۔ ہر دور میں اس عہد کی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے اور قوموں کی ترقی کی رفتار بڑھ رہی ہے مختلف زبانوں کے افراد ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں ترجمہ کی ضرورت اور اس کا تقاضا بڑھتا جارہا ہے۔

ترجمہ دو نامانوس اور غیر معروف زبان بولنے والے افراد کو ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے۔ ان کے خیالات اور مافی الضمیر دوسرے کے سامنے ظاہر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ ضرورت عام حالات میں تو روزانہ کی زندگی میں پیش آنے والی ضروریات، لین دین و معاملات تک محدود رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اس کی اہمیت وضرورت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ قوموں کی ترقی کا مکمل انحصار اسی پر مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے۔

تاریخ میں مختلف قوموں پر یہ مراحل آئے جب قوموں نے اس راستے پر اپنے قدم بڑھائے اور یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور علمی وسعتوں میں اضافہ کا سبب بنے، تصنیف وتالیف کے جدید اسلوب وآہنگ میسر ہوئے۔ انہیں ترجموں کی بدولت ان قوموں نے ترقی کے اعلی مدارج طے کئے جس کی واضح مثال عہد عباسی کے تراجم اور یورپی نشاۃ ثانیہ میں راجر بیکن کی کوششوں سے پیدا ہونے والی ترجمہ کی تحریک ہے۔

ترجمہ کی اہمیت گو کہ مسلم ہے، اس نے قوموں کی تاریخ بدل دی، ان کو شناخت فراہم کی، ان کو دنیا کے منظر نامے پر منفرد وممتاز مقام عطا کیا۔ عروج وزوال کی تاریخ میں ترجمہ کا کردار بہت اہم رہا ہے؛ لیکن آج سے نصف صدی قبل تک ترجمے کی جانب اس طرح توجہ نہیں دی گئی تھی جیسی توجہ اس کو مطلوب و درکار تھی؛ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مترجمین کو تکلیفیں اور سزائیں تک برداشت کرنی پڑیں، ان کی شاہکار اور جانکاہ کوششوں کو ناقابل توجہ اور ثانوی حیثیت کا کام سمجھا گیا۔ اب صورت حال قدرے تبدیل ہوئی ہے، ترجمے کے تعلق سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی رونما ہوئی ہے، ترجمہ ایک مستقل شعبۂ علم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں میں مطالعات ترجمہ کے عنوان سے کورسس دستیاب ہیں۔ ترجمہ پر مختلف زاویوں اور گوشوں سے

بحث ہورہی ہے۔ نئے نئے نظریات جنم لے رہے ہیں، قدیم نظریات کو اکٹھا کیا جارہا ہے ان کی وضاحت و تشریح کی جارہی ہے۔ موجودہ دور میں ترجمہ کے جو ابھرتے ہوئے نئے نظریات سامنے آئے ہیں ان میں ایک نظریہ ''مداخلت'' بھی ہے۔

نظریہ مداخلت اپنے واضح تصور کے ساتھ سب سے پہلے انگریزی اور مغربی زبانوں میں سامنے آیا۔ مداخلت دراصل شمولیت ہے۔ جب کسی متن کا ترجمہ ہوتا ہے تو بہت سی چیزیں اس میں شامل ہوجاتی ہیں۔ شمولیت کے پس پردہ بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً ترجمہ کی پالیسی، مترجم کی ذات، موضوع، وقوفی ماحول، زبان وقواعد ولسانیات وغیرہ۔ مداخلت خواہ مترجم کی جانب سے ہو، زبان کی تبدیلی کے تقاضے کے پیش نظر ہو یا کسی اور وجہ سے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ شعوری مداخلت اور غیر شعوری مداخلت۔

تمام ماہرین مطالعات ترجمہ اور فن ترجمہ نگاری کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ترجمہ میں مداخلت، عمل ترجمہ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ کسی بھی متن کا صد فی صد ترجمہ ممکن ہی نہیں ہے اور نہ ہی صد فی صد ترجمہ بہتر اور قابل رسا ہوسکتا ہے۔ لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کس قسم کی مداخلت جائز ہے اور کس حد تک جائز ہے۔ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں مترجم کو یہ آزادی فراہم کی جاسکتی ہے کہ وہ اس میں کچھ اصلاح وترمیم کرسکتا ہے، وقوفی ماحول، موضوع اور زبان کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے ہم آہنگی کی خاطر مترجم کچھ عمل کرسکتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اگر بر بنائے مصلحت ایسا کیا جارہا ہے تو کیا مترجم کو آزادی فراہم کردی جائے یا اس پر اصول، حدود وقیود کی لگام لگائی جانی ضروری ہے۔

نظریہ مداخلت ترجمہ کے میدان میں بالکل نیا تصور ہے۔ مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی میں اس موضوع چیدہ چیدہ مضامین پائے جاتے ہیں لیکن ان مضامین میں سے اکثر میں براہ راست مداخلت پر گفتگو نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں ابھی تک کا سب سے اہم کام مونا بیکر کی کتاب Intervention as Translation ہے۔ لیکن اس کتاب میں بھی دیگر دستیاب مضامین کی طرح ہی مغربی زبانوں کو مدنظر رکھ کر گفتگو کی گئی ہے۔ جس سے مشرقی زبان بولنے والے افراد کا استفادہ قدرے مشکل ہے۔ ضرورت ہے اس موضوع پر کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی جس میں ہندوستانی ادب وثقافت کو مدنظر رکھ کر گفتگو کی گئی ہو، جب

کہ مداخلت کو سمجھنے کے لیے ثقافت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ضرورت ہے کہ اس موضوع پر اس انداز سے کام کیا جائے جس میں ہندوستانی ثقافت اور زبانوں کو مدنظر رکھا گیا ہوتا کہ اس جدید نظریہ سے واقفیت ہو سکے اور ترجمہ کے میدان میں اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس تحقیق میں اردو زبان کو بنیاد بنایا گیا ہے اور اس پر گفتگو کرنے کے لیے عربی سے اردو ترجمے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک زبان اپنے ارتقائی مراحل میں دوسری زبانوں سے کسی نہ کسی حد تک ضرور متاثر ہوتی ہے، اس کا اثر قبول کرتی ہے، اس سے اخذ و استفادہ کرتی ہے، بعض تاریخی، تمدنی اور سیاسی اسباب وعلل ایک زبان کو دوسری زبان کے قریب لے آتے ہیں اور اس کی بہت سی خصوصیات دوسری زبان میں گھل مل کر اس کا جزو بن جاتی ہیں۔ دوسری زبانوں کی طرح اردو نے بھی دیگر زبانوں سے استفادہ کیا ہے جس میں فارسی، عربی اور انگریزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فارسی اور انگریزی تو ہندوستان میں ایک عرصہ تک سرکاری زبانیں رہی ہیں اس لیے اردو کا ان زبانوں سے متاثر ہونا ایک فطری بات ہے اردو میں اس کی واضح جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے تو عربی محدود علاقے اور مخصوص عرصے کے علاوہ کبھی بھی اقتدار کی زبان نہیں رہی البتہ یہ ضرور ہوا کہ عوام کا ایک بڑا طبقہ ہمیشہ اس سے متعلق رہا جس کی وجہ یہ تھی کہ عربی کی حیثیت ایک مذہبی زبان کی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی زبان بھی ہمیشہ سے عربی ہی ہے کیوں کہ تمام تر مذہبی مراجع ومصادر عربی میں ہی موجود ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد اس آفاقی مذہب اور نظام زندگی کو دنیا کے دیگر لوگوں تک پہنچانے کے لیے داعیان اسلام نے عرب سے نکل کر دیگر ملکوں کا رخ کیا، کہیں انفرادی طور پر چند افراد پہونچے، کہیں باضابطہ فوج روانہ کی گئی، ان فوجوں نے فتح کے پرچم لہرائے اور حکومتیں قائم کیں، خواہ فوجیں ہوں یا چھوٹے قافلے عموما ایسا ہوا کہ ان میں سے بہت سے لوگ جہاں گئے رہ گئے اور مذہب کی نشر واشاعت میں اپنی زندگی گزار دی۔ دیگر علاقوں میں بسنے والے لوگوں نے جب اپنے قدیم مذاہب کی چھوڑ کر اسلام قبول کیا تو مذہب کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف گوشوں میں واضح تبدیلی رونما ہوئی، اسلام نے ان کے پورے طرز زندگی پر نمایاں نقوش مرتب کئے حتی کہ زبان پر بھی اس کے اثرات قائم ہوئے، بہت سے ملکوں میں تو علاقائی زبان کے بجائے عربی زبان ہی

لوگوں کی عام بول چال کی زبان بن گئی۔ کچھ جگھوں پر گوکہ زبان تبدیل نہیں ہوئی لیکن عربی زبان نے وہاں کی رائج زبان کے پورے ڈھانچے کو متاثر کیا جس کی واضح مثال فارسی زبان ہے۔

ہندوستان کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جن کا عرب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ یہ رشتہ قبل از اسلام بھی قائم تھا جو تجارتی نوعیت کا تھا۔ اسلام کی آمد کے بعد اس میں تبلیغی مقصد کا اضافہ ہو گیا۔ ابتدا میں ہی یہاں مسلمان آئے، سندھ میں ان کی حکومت بھی قائم رہی۔ دوسری طرف بعد کے زمانے میں ہندوستان میں فارسی سرکاری زبان رہی۔ دلی اور اس کے گرد ونواح میں رائج کھڑی بولی نے جب بولی سے زبان کا سفر کیا تو ان دونوں زبانوں سے کافی استفادہ کیا اور ان زبانوں کے گہرے اثرات اس پر مرتب ہوئے۔ جہاں تک عربی کے اثرات کا تعلق ہے تو کچھ اثرات تو براہ راست عربی سے منتقل ہوئے اور کچھ فارسی کے واسطے سے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو کا لسانی مطالعہ کرتے ہیں تو زبان کے مختلف پہلوؤں پر اس کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ لسانی اعتبار سے اردو کا عربی سے قریبی تعلق رہا ہے، زبان کے تحریری، صوتی، لغوی، قواعدی عناصر سب پر اس کا گہرا اثر ہے، زبان کی ادبی صورت یعنی نثر و نظم اور ان کی اقسام پر اس کے واضح اثرات ہیں۔ اقسام نظم میں قصیدہ براہ راست عربی سے اردو میں منتقل ہوا، قابل ذکر امر یہ ہے کہ اردو کی سب سے طاقتور ترین ادبی صنف غزل بھی اپنے موضوع اور معنی کے لحاظ سے قصیدہ سے ہی ماخوذ ہے، معنوی لحاظ سے مرثیہ بھی عربی سے ہی ماخوذ ہے۔ نثری اصناف میں داستان عربی سے فارسی کے واسطہ سے اردو میں منتقل ہوئی۔ ادبی جملے، کہاوتیں، ضرب الامثال، محاورے، تلمیحات، استعارات وغیرہ زبان میں گل بوٹوں کا کام کرتے ہیں، زبان کی تزئین میں ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اردو میں مستعمل ادبی جملے بڑی تعداد میں براہ راست عربی سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح اگر غور کیا جائے تو لسانی اعتبار سے اردو کا عربی زبان سے کافی گہرا رشتہ ہے۔ اردو کو معیاری زبان بنانے میں عربی زبان کا بڑا دخل رہا ہے۔ خصوصا قدیم اردو ادب عربی سے بہت حد تک متاثر رہا ہے۔

اردو کو معیاری زبان بنانے میں ترجموں کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔ اردو میں زیادہ تر ترجمے مذہبی اور ادبی نوعیت کے ہی ہوئے ہیں۔ چناچہ قرآن، حدیث، فقہ اور ان سے متعلق بہت سے فنون کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ مذہبی سرمایہ زیادہ تر عربی میں ہی موجود ہے اسی وجہ سے اردو میں مذہبی تراجم کی ایک وقیع روایت

رہی ہے،اور یہ کام زیادہ تر انفرادی طور پر انجام دیا گیا۔ جہاں تک ادبی ترجموں کا تعلق ہے تو اردو میں زیادہ تر ادبی ترجمے فارسی سے اور بعد میں انگریزی سے کیے گئے۔ جس کی باضابطہ ابتدا فورٹ ولیم کالج سے ہوئی۔ جب کہ انفرادی طور پر اس سے پہلے بھی ادبی ترجمہ کی کوشش جاری تھی اور آج بھی قائم ہے۔ عربی ادب کے ترجمے کی ایسی باضابطہ کوشش تو نہیں ہوئی کیوں کہ ہندوستان میں فارسی اور انگریزی کی طرح عربی کا با اقتدار تسلط کم و محدود رہا؛ لیکن انفرادی طور پر یہ کام انجام دیا جاتا رہا ہے۔ اور اس میدان میں قابل قدر خدمات انجام دی گئیں۔

عربی ادب کی بہت سی معروف کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، خصوصا قدیم عربی ادب کے ترجمہ پر خاص توجہ دی گئی جن میں نثر اور شاعری دونوں کے ترجمے شامل ہیں۔ عربی کے مشہور قصائد سبع معلقات کے کئی تراجم منظر عام پر آ چکے ہیں۔ متنبّی کے دیوان کا کئی دسیوں نثری تراجم کیے جا چکے ہیں۔ ایک ترجمہ نثری اور منظوم دونوں ہے۔ مترجم نے پہلے نثر میں ترجمہ کیا پھر اس مفہوم کو شعر میں پرو دیا۔ دیوان امام شافعی اور دیوان حضرت علی دونوں کے دو دو تراجم دستیاب ہوئے۔ دیوان حماسہ اور مقامات حریری کے ہندوستان و پاکستان دونوں جگہوں پر کئی کئی ترجمے ہوئے۔ مشہور و معروف داستان الف لیلیٰ کے ترجمے کی رویت نہایت قدیم ہے۔ قابل قدر ادبی شہ پارہ عبداللہ ابن المقفع کی ''کلیلہ و دمنہ'' کے دو ترجمے اب تک دستیاب ہوئے۔ کلیلہ دمنہ کے ایک ترجمے فرد افروز کو ارشد رازی نے مرتب کیا ہے؛ لیکن اس کی ترتیب دستیاب متن سے مختلف ہے۔ قدیم کتابوں کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے مصنفین کی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے جیسے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب روائع اقبال کا اردو ترجمہ نقوش اقبال کے نام سے کیا گیا، مولانا کی سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا ترجمہ ''دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کے اثرات'' کے نام سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ کچھ متفرق نظموں کے ترجمے بھی ہوئے جیسے عربی کے معروف نعتیہ قصیدہ ''قصیدۂ بردہ'' کے کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ جدید افسانوں، ناولوں ڈراموں کے ترجمے بھی کیے گئے۔

موضوع کی اہمیت

عربوں کو اپنی زبان دانی پر بڑا فخر تھا وہ دوسروں کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ عربی زبان اور اس پر قدرت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عربی دنیا کی ثروت مند ترین زبان ہے۔ زبان کے

اندر جوتنوع اور نیرنگی ہے اس پر کسی کو بھی فخر ہوسکتا ہے۔اس پر عربوں کی زبان پر توجہ نے اس کو اور چار چاند لگا دیا۔عربی زبان میں ادب کا رواج بہت قدیم ہے گو کہ قدیم عربی ادب میں چند محدود موضوعات کا ذکر ہوتا تھا،لیکن اسلام کی آمد،قرآن کے نزول اور اہل عرب کے دوسرے علاقوں کے ساتھ روابط وسیع ہونے کے بعد عربی ادب نئی جہتوں سے روشناس ہوا۔اور ادب میں گراں قدر خدمات انجام دی گئیں،اس طرح عربی ادب زبان وموضوع کے لحاظ بلند ترین معیار کو پہونچ گیا۔یہی وجہ ہے کہ دوسری زبانوں نے اس سے خوب خوب استفادہ کیا جس کا اہم ذریعہ ترجمہ تھا۔اردو لسانی اعتبار سے عربی سے بہت قریب تھی ہی اس کی تشکیل میں بھی عربی کا اہم رول تھا چناں چہ اردو نے بھی اس ادبی سرچشمہ سے خاطر خواہ سیرابی حاصل کی،اہل اردو نے اپنے ادبی ذخیرہ کو مالا مال کرنے کے لیے عربی ادب کا ترجمہ کیا۔

اردو پر عربی زبان کا گہرا اثر ہے۔ثقافتی اعتبار سے دونوں زبانیں بہت قریب مانی جاتی ہیں۔بالخصوص ادب اور مذہب کے موضوع پر اخذ واستفادہ کا تعلق سب سے گہرا ہے۔لسانی سطح پر حروف، الفاظ،قواعد، محاورے،ضرب الامثال،کہاوت، واقعات وغیرہ اکثر لسانی میدان میں اردو عربی کی رہین منت ہے۔دلچسپ امر یہ ہے کہ مختلف ناحیوں اور نوعیّتوں سے ایک دوسرے سے قریب کی زبان میں جب ترجمے کا عمل انجام دیا جاتا ہے تو کس قسم کے مسائل درپیش آتے ہیں۔ترجمے میں مماثلت کی تلاش یا ترجمے میں مماثلت کا مرحلہ کتنا آسان ہوتا ہے۔کیا لسانی اور ثقافتی اشتراکات ترجمے کے عمل کو کتنا آسان بناتے ہیں،یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہاں ہمارا مطمحِ نظر ادبی ترجمے کا مطالعہ ہے اور ادب کسی بھی زبان کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے۔زبان،ثقافت، معاشرت کے تمام تر داخلی نکات اس میں مندرج ہوتے ہیں۔وہ مخصوص زبان بولنے والے افراد کی طرزِ فکر، خیالات،احساسات،تصورات، وقوفی ماحول بہر حال دوسری زبان سے مختلف ہوتا ہے،خواہ کوئی دو زبانیں کتنی ہی قریب ہوں۔حتیٰ کہ اندرون ملک بولی جانے والی زبانوں میں بھی فرق ہوتا ہے چہ جائیکہ جغرافیائی بعد کی حامل زبانیں۔اردو اور عربی میں اشتراکات کے ساتھ افتراقات بھی موجود ہیں مثلاً دونوں کا لسانی خاندان الگ ہے،دونوں کی صوتیات جدا ہیں،عربی قواعد اردو قواعد سے بہت مختلف اور وسیع ہیں۔اشتراکات کے ساتھ ساتھ افتراقات کی حامل ان دو زبانوں میں ترجمے کے عمل کا مداخلت کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

مطالعہ کی ضرورت

اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ ''نظریہ مداخلت'' ترجمہ کے میدان میں بالکل نیا موضوع ہے۔مفہوم کی معمولی تبدیلی سے بڑے خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں اور آئے ہیں۔ ہر زبان کی لسانی ساخت بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔زبان کا ثقافتی ورثہ اس کی روح ہوتی ہے؛لیکن ترجمہ کے میدان میں ابھی تک ایسا کوئی پیمانہ نہیں تھا جس کے ذریعہ اصل متن اور ترجمہ شدہ متن کا اس نوعیت سے جائزہ لیا جا سکے کہ ترجمہ شدہ متن میں مفہوم کی منتقلی کس حد ہوئی ہے،کس حد تک منتقلی ہونی چاہئے،ثقافت کے کن امور کو ترجمہ میں ملحوظ رکھنا چاہئے،وہ کون سے مقامات ہیں جہاں ترجمہ کی پالیسی کے تقاضے کے پیش نظر مصنف سے انحراف کیا جا سکتا ہے،لسانی تبدیلی سے مفہوم کس حد تک متاثر ہوتا ہے،مترجم کی ذات ترجمہ پر کس حد تک اثر انداز ہوتی اور ہوسکتی ہے،وقوفی ماحول،موضوع،اسلوب اور ہیئت وغیرہ کا کس حد تک لحاظ رکھنا ضروری ہے۔نظریہ مداخلت ان تمام امور کی نشان دہی میں ہماری معاونت کرتا ہے۔نظریہ مداخلت سے واقفیت کسی بھی ترجمہ کے معیار کو پرکھا جا سکتا ہے۔اس اعتبار سے یہ تحقیق اپنے آپ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اس تحقیق سے ترجمہ کے میدان میں کام کی ایک نئی راہ کھلے گی۔نئے مترجمین کی معیاری تربیت کے لیے رہنمائی بھی حاصل کی جا سکے گی۔

تحقیق کے مقاصد

(۱)اردو میں عربی ادب کے ترجمے کے پس منظر میں نظریہ مداخلت کو متعارف کرانا۔

(۲)عربی ادب کے اردو تراجم میں مداخلت کے مختلف اسباب وعوامل کا جائزہ لیتے ہوئے مثالوں سے واضح کرنا۔

(۳)عربی ادب کے اردو تراجم میں مداخلت کی مختلف صورتوں کو مثالوں سے واضح کرنا۔

تحقیق کا طریقہ کار

زیر نظر تحقیق کا بنیادی مقصد مداخلت کے نظریات، اس کے اسباب وعوامل اور مواقع مداخلت کو مثالوں سے مزین کو مدلل کرنا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے عربی ادب کی منتخب کتابوں کا انتخاب کیا گیا۔انتخاب کتب میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا کہ قدیم وجدید دونوں ادب کی کتابیں شامل کی جائیں۔اسی طرح ادب کی

دونوں اقسام نظم ونثر سے اعتنا کیا گیا۔اصناف ادب میں بھی تنوع قائم رکھنے کی کوشش کی گئی مثلاً قصیدہ،منتخب اشعار، داستان، ڈرامہ اور ناول سب کو شامل کیا گیا ہے۔البتہ مثالیں کیف ما اتفق تلاش کی گئیں، جہاں جیسے مثالیں ملتی گئیں ان کو درج کر دیا گیا؛ چنانچہ اس بات کا امکان ہے کہ کسی کتاب سے زیادہ مثالیں درج ہوں اور کسی سے کم۔ نیز یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس تحقیق میں کسی مکمل کتاب کا مطالعہ کرنا نہیں ہے۔دوران تحقیق یہ اندازہ ہوا کہ مثالوں کی کثرت مقالے کو نہایت ضخیم کر سکتی ہے۔ ہر صفحہ پر کوئی نہ کوئی مثال موجود ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی جملے میں مداخلت کی صورتیں موجود ہیں۔ایسے موقعوں پر کوشش کی گئی ہے کہ ایک اقتباس کو ایک ہی مثال کے لیے ذکر کیا جائے ؛ البتہ اس کا مکمل التزام نہیں کیا گیا ہے۔بعض مثالیں ایک سے زائد جگہوں پر بھی ذکر کی گئی ہیں ؛لیکن ہر جگہ گفتگو کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ایسے متون کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے جن کے ایک سے زائد ترجمے موجود ہوں ؛ کیوں کہ اس سے تقابلی مطالعہ آسان ہو جاتا ہے اور بات زیادہ واضح انداز میں کھل کر سامنے آتی ہے۔مداخلت کی مثال کے طور پر درج کردہ اقتباس کا تجزیہ کرنے کے بعد صحیح وغلط اور مثبت ومنفی کا حکم لگانے سے احتراز کیا گیا ہے؛ کیوں کہ اس تحقیق کا مقصد صرف مداخلت کو بیان کرنا اور واضح کرنا ہے،اس پر حکم صادر کرنا بالکل الگ موضوع ہے۔

ابواب کی تفصیل

اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے،ابواب کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

باب اول :''ترجمہ اور ادبی ترجمہ'' کے نام سے معنون یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے۔پہلے حصے میں ترجمے کی تعریف،اس کی اقسام اور ترجمے کی ضرورت،اہمیت اور روایت کا جائزہ لیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں ادب کی تعریف، ادبی ترجمہ نیز ادبی ترجمہ کی تعریف، اس کی اقسام اور ادبی ترجمے کی ضرورت واہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔اردو میں ادبی ترجمے کی روایت پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

باب دوم :اس باب کا عنوان''ترجمے میں مداخلت ایک تعارف'' ہے۔باب ہذا مداخلت کی لغوی واصطلاحی تعریف اور ان کے درمیان انطباق پیش کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مداخلت ترجمہ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔مداخلت کی دو قسم ہے:شعوری اور غیر شعوری۔

باب سوم :''عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ کتب میں ترجمے کے نظریات مداخلت کے پس منظر میں''۔اس باب کی ابتدا میں زبانوں کے درمیان تاثیر وتاثر کے اسباب، عربی اور اردو کے درمیان تعلقات کی نوعیت اور عربی زبان عربی زبان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعدازاں اردو میں عربی ادب کے ترجمے کی روایت کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے ترجمہ شدہ کتابوں کی ایک فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ پھر ان ترجمہ شدہ کتابوں میں ترجمے اور ترجمے کے نظریات کی بابت مذکور باتوں کی روشنی میں مداخلت کے پس منظر میں گفتگو کی گئی ہے۔ گفتگو کو مدلل کرنے کے لیے مثالوں سے مزین کیا گیا ہے۔

باب چہارم: کا عنوان''مداخلت کے اسباب وعوامل (اردو میں عربی ادب کے ترجمے کے حوالے سے)'' ہے۔ اس باب میں مداخلت ان اسباب ووجوہات کو بیان کیا گیا جن کی وجہ سے ترجمے میں مداخلت ہوتی ہے۔اس میں جملہ چار اسباب ذکر کیے گئے ہیں: وقوفی ماحول،تسہیل، ڈسکور، ثقافت۔ ایک سبب کے کئی کئی حصے ہیں۔تسہیل اور ثقافت مداخلت کے اہم ترین اسباب ہیں۔اس پوری بحث کو عربی ادب کے اردو تراجم کی مثالوں سے مزین ومدلل کیا گیا ہے۔

باب پنجم: اس باب کا عنوان''مداخلت کی مختلف صورتیں (اردو میں عربی ادب کے ترجمے کے حوالے سے)''۔ یہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے؛ کیونکہ جب کسی بھی سبب سے مداخلت وقوع پذیر ہوگی تو اس کا اظہار زبان کی ہی کسی نہ کسی سطح پر ہوگا۔ اس میں صوتیات فونیمیات، الفاظ،معنی ،قواعد، جملے کی ترکیبی ساخت ، اسلوب، اصناف و ہیئت مختلف مختلف سطحوں پر مداخلت کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ صورتوں میں ایک ایک صورت کے کئی کئی حصے ہیں۔ ہر حصے پر گفتگو کی گئی ہے اور مثال کی روشنی میں بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

حوالہ جات و کتابیات: ہر باب کے آخر میں حوالہ جات کی تفصیل دی گئی ہے؛ جب کہ مقالہ کے آخر میں کتابیات ترتیب دی گئی ہے جس میں کتابیں،مضامین اور ویب سائٹس شامل ہیں۔

باب اول

ترجمہ اور ادبی ترجمہ

ترجمہ

ترجمے کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود انسانی تاریخ۔ چنانچہ جب ہم دنیا کے مختلف ملکوں وخطوں کی زبان اوراس کے ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً تمام زبانوں میں ترجمے کی روایت رہی ہے۔ تراجم کی ہی دین ہے کہ علوم وفون کے بیش بہا خزانے یونان و ہند سے نکل کر عرب پہنچے اور پھر وہاں سے یورپ۔ عرب وعجم کے علما نے یونانی اور ہندوستانی فلسفے، طب، ہیئت، نجوم اور داستانوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد عربی اور دیگر زبانوں میں موجود علوم کو بڑی تیزی کے ساتھ لاطینی زبان میں منتقل کیا گیا۔ یورپی اقوام نے ان تراجم کی روشنی میں اپنی صلاحیتوں کو نکھارا اوران علوم کو مزید آگے بڑھایا۔ سقراط اور افلاطون جیسے مفکرین کے خیالات ہم تک صرف اس وجہ سے پہونچ سکے کہ سیکڑوں برس پہلے عربی زبان کے اسکالروں نے انہیں اپنی زبان میں ترجمہ کرکے تمام دنیا کوان سے متعارف کروایا تھا۔ اسی طرح بوعلی سینا، ابن رشد، اور ابونظر فارابی کے کارناموں کو عرب ممالک کے حصار سے نکالنے کا کام لاطینی زبانوں نے کیا پھران کے فلسفے اور افکار سے یورپی اقوام نے استفادہ کیا۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی علوم کی ارتقا اوران کے فروغ میں تراجم کے اہمیت مستقل اور مسلم ہے اور یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے سے ہی ترجمے کا رواج رہا ہے۔

ترجمہ جہاں الفاظ کے ذریعہ انسانی علوم میں اضافہ کرتا ہے اور ذہن کی سرحدوں کو کشادہ کرنے میں معاون ہوتا ہے وہیں زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے، خیالات وجذبات کو بیان کرنے کے لئے نئے اسلوب مل جاتے ہیں، نئے الفاظ وضع کرنے پڑتے ہیں، پرانے الفاظ کو دوبارہ استعمال کرنے سے ان میں وسعت پیدا ہوتی ہے، نئے محاورے، نئے محرکات دستیاب ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں نئی اصناف سے تعارف ہوتا ہے۔ فکر وتحقیق کے نئے سانچے اور نئے اسالیب ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ کی ہر زمانے میں اہمیت رہی ہے۔ عصر حاضر میں اس کی ضرورت میں مزید اضافہ ہوا ہے تیز رفتار ذرائع حمل ونقل اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے بڑھتے ہوئے اثر ونفوذ اور عالم کاری نے فن ترجمہ کو مستقل و باضابطہ مضمون کی حیثیت عطا کردی ہے۔

ترجمہ بڑا مشکل کام ہے، یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔ایک زبان کے معانی اور مطالب کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اصل عبارت کی خوبی اور مطلب برقرار رہے بڑی ہنرمندی اور ریاضت کا طلبگار ہے۔

ترجمہ کی تعریف چند الفاظ میں کی تو جاسکتی ہے لیکن وہ ہرگز جامع نہیں ہوسکتی۔ترجمہ بظاہر ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا نام ہے؛ لیکن اس کے عملی اطلاق کے دوران اس کی تعریف وتوضیح اور بھی وسیع ہوجاتی ہے۔اچھے مترجم کے لئے ترجمہ کے مکمل مفہوم کو سمجھنا ضروری ہے۔

ترجمہ کی لفظی تعریف: لفظ Translation لاطینی لفظ Translatio سے مشتق ہے، Trans کے معنی ''پار'' کے ہیں۔جدید مغربی زبانوں میں لفظ Translation لاطینی سے آیا ہے جس کا معنی ہے ''پار لے جانا''۔اردو اور فارسی میں ترجمہ کا لفظ عربی زبان سے آیا ہے۔لغت میں اس کے معنی ایک زبان سے دوسری زبان میں نقل کلام، تفسیر وتعبیر، دیباچہ، کسی شخص کا بیان احوال یا شخصی تذکرہ کے ہیں اردو لغات میں ترجمہ کے معنی دوسری زبان میں بدلنا یا دوسری زبان میں مطلب بدلنا ہے۔فیروز اللغات میں ترجمہ کا معنی ''ایک زبان سے دوسری زبان میں بیان کی ہوئی عبارت، گفتگو یا تقریر'' ہے۔(فیروز اللغات، ص ۳۸۱)

ترجمہ کی اصطلاحی تعریف: ایک زبان میں لکھی ہوئی تحریر جو ایک جملے سے لے کر ایک مکمل کتاب تک کو محیط ہوسکتی ہے، کو کسی دوسری زبان میں اسی معنی اور مفہوم کے ساتھ منتقل کرنا ترجمہ (Translation) کہلاتا ہے۔

ترجمہ کی اقسام: جہاں تک ترجمہ کی اقسام کا تعلق ہے ان کو دو اجزا میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلے جز میں ترجمہ کی وہ اقسام جن کا تعلق ترجمہ کے موضوع سے ہے؛ جب کہ دوسرے جز میں وہ اقسام جن کا تعلق ترجمہ کی تکنیک یا طریقہ کار سے ہے۔

ترجمہ کی اقسام باعتبار موضوع: بہ اعتبار موضوع ترجمہ کی تین قسمیں ہیں

۱۔علمی ترجمہ ۲۔ادبی ترجمہ ۳۔صحافتی ترجمہ

علمی ترجمہ: علمی ترجمہ کے ذیل میں تمام سائنسی علوم وفنون کی کتابیں آتی ہیں جن میں جغرافیہ، تاریخ، ریاضیات، معاشیات، قانون، طبیعات، سیاسیات، انجینئرنگ اور میکانیات کی کتابیں شامل ہوتی ہیں۔

ادبی ترجمہ: ادبی ترجمہ کے ذیل میں کسی بھی زبان میں موجود نثر ونظم کی تمام اصناف شامل ہوتی ہیں جو ادب کے دائرے میں آتی ہیں جیسے ناول، افسانے، قصے، کہانیاں، ڈرامے، ناولٹ، مختصر افسانے اور شاعری کی تمام اصناف جیسے غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مرثیہ، نظم، آزاد نظم، نظم معری، نثری نظم وغیرہ۔

صحافتی ترجمہ: ترجمہ کی اس قسم میں پرنٹ والیکٹرانک میڈیا سے متعلق تحریریں آتی ہیں۔

ترجمہ کی اقسام باعتبار تکنیک: باعتبار تکنیک بھی ترجمہ کی تین ہی قسمیں ہیں۔

۱۔ لفظی ترجمہ ۲۔ آزاد ترجمہ ۳۔ بامحاورہ ترجمہ

لفظی ترجمہ: جب ہم ان تصورات کے ساتھ ترجمہ کرتے ہیں کہ مترجم اصل مصنف کی تصنیف کا امین ہے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اصل متن میں موجود متن کو ایک لسانی گروہ سے دوسرے لسانی گروہ تک من وعن پہنچادے تو ایسی صورت میں لفظی ترجمہ کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ اس قسم کے ترجمہ میں دیانت داری کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں اس لئے لفظی ترجمہ کو دیانت دارانہ ترجمہ کہتے ہیں۔ بہت سے ماہرین ترجمہ نگاری اس قسم کے ترجمہ کی حمایت کرتے ہیں۔ لفظی ترجمہ کے ذیل میں عام طور پر علمی ترجمے آتے ہیں، جن میں تمام سائنسی و عمرانی علوم وفنون کی کتابیں شامل ہیں۔ علوم وفنون میں عام طور سے مخصوص اور متعین لفظیات اور اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں اس لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا اصطلاح کا جو ترجمہ ایک جگہ کیا گیا ان کا انہیں معنوں میں ہر جگہ استعمال کیا جائے تاکہ ترجمہ میں یکسانت برقرار رہے اور قاری کا ذہن کہیں بھی الجھنے نہ پائے۔ ترجموں میں سب سے بڑا مسئلہ اصطلاحات کے ترجموں کا ہوتا ہے۔ اصطلاحات کو وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ اصطلاحیں مسلمہ اصولوں کے مطابق وضع کی جائیں۔ تمام شرائط کے علاوہ ایک اہم بات یہ ہے کہ علمی وفنی کتابوں کا ترجمہ متعلقہ علم وفن کا ماہر ہی انجام دے اور اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم ترجمہ کے بعد اس فن کے ماہر کو ضرور دکھالیا جائے، تاکہ مضمون میں کوئی سقم نہ آجائے۔ مزید یہ کہ لفظی ترجمہ سے مراد لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں ہے بلکہ حتی المقدور لفظ بہ لفظ ترجمہ کی اس حد تک کوشش کہ اصل کا مفہوم مجروح نہ ہو۔ اگر ہدفی زبان میں اس لفظ کا مترادف موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں مترجم کو یہ آزادی حاصل ہے کہ یا تو اصطلاح کا بدل وضع کرے یا دیگر مناسب الفاظ کے ذریعہ اس کا مفہوم بیان کرے۔

آزاد ترجمہ: اس تکنیک کا استعمال صحافتی ترجمہ میں ہوتا ہے۔ اسے کھلا ترجمہ بھی کہتے ہیں اور یہ مفہوم کے ترجمہ کے ذیل میں آتا ہے۔ مفہوم کا ترجمہ کرنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ ایسے ترجموں میں کسی پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مترجم کے لئے یہ آسانی ہوتی ہے کہ اصل مفہوم کو سمجھ کر اپنی زبان میں اپنے طریقے سے بیان کر دے۔ اس میں سادگی، سلاست اور فقروں کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے؛ کیوں کہ اس طرح کے تراجم کا مقصد عوام کے حالات سے حکومت کو اور حکومت کے کام سے عوام کو باخبر کرنا ہوتا ہے اور قارئین ،سامعین یا ناظرین کی دلچسپی لسانی گتھیوں کو سلجھانے یا سنوارنے سے نہیں ہوتی بلکہ اصل بات کو جاننے سے ہوتی ہے اس لئے اسلوب بیان، طرز وادا عام فہم اور چھوٹے چھوٹے سادہ جملوں پر مشتمل ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ آسان سے آسان زبان و بیان استعمال کرنا صحافت کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

بامحاورہ ترجمہ: محاوراتی اظہار بیان پر مشتمل ترجمہ کو بامحاورہ ترجمہ کہتے ہیں۔ بامحاورہ ترجمہ کے طریقہ کا رکا استعمال ادبی تراجم میں کیا جاتا ہے۔ بامحاورہ ترجمہ میں زبان کی باریکیوں، نزاکتوں، الفاظ کی ترتیب میں مفہوم کی ادائیگی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اصل زبان کے اسلوب نگارش کو ترجمہ کی زبان کے مزاج کو سمجھتے ہوئے ترجمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ترجمہ پورے لسانی شعور کے ساتھ کیا جاتا ہے، زبان و بیان اور قواعد کا خاص خیال رکھا جاتا ہے، متن کی تہہ تک پہنچتے ہوئے مصنف کے جذبات واحساسات کی دوسری زبان میں بازیافت کی جاتی ہے۔ زبان کے روزمرہ، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات وکنایات، تلمیحات اور رموز و علامات سے کام لیا جاتا ہے تاکہ ترجمہ میں ادبی رنگ آجائے اور ترجمہ تخلیقی نوعیت اختیار کر لے ۔دراصل ادب کی ادبیت اور اثر انگیزی مذکورہ صنعتوں میں مضمر ہوتی ہے اور انہیں کے باوصف وہ اپنے فن پارے کو تابدار بناتے ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ تخلیق کار کی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ اصل حیثیت مسخ بھی نہ ہو اور ترجمہ بامحاورہ اسلوب کے ساتھ بھی ہو۔

ترجمہ کی ضرورت

زبانوں کا اختلاف اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ قرآن کی آیت ہے:

﴿و من آیاته خلق السماوات والارض و اختلاف السنتکم و الوانکم ان فی ذلك

لآیات للعالمین﴾ 1ے

(اوراس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اورزمینوں کی پیدائش، اور تمہاری زبانوں
اورتمہارے رنگوں کااختلاف ہے یقیناًاس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانشمندوں کے لیے)

زبانوں کا یہی اختلاف درحقیقت ترجمہ کی بنیادی ضرورت ہے؛ کیوں کہ ترجمہ دو الگ الگ زبان بولنے اور سمجھنے والے انسانوں کے درمیان خیالات کی منتقلی اور مافی الضمیر کی ادائیگی کا واحد ذریعہ ہے۔زبان کی غیریت ترجمہ کے وجود کے لیے لازم ہے۔مرزا ادیب لکھتے ہیں:

''ایک ایسے علاقے میں جہاں لوگ ایک لسانی وحدت ہوں وہاں ترجمہ کا سوال
ہی پیدا نہیں ہوتا۔لہذا جب تک دولسانی وحدتیں باہم سامنے نہ ہوں اور دونوں
کے درمیان رابطہ نہ ہو ترجمہ کا عمل ظاہر نہیں ہوسکتا'' 2ے

جارج اسٹینر نے لکھا ہے:

"the translation is a bilingual mediating agent
between monolingual communication
participants in to different lnaguage systems"3ے

(ترجمہ مختلف لسانی نظاموں میں یک لسانی ترسیلی مشارکین کے درمیان ذولسانی
ثالثی ایجنٹ ہے)

ترجمہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کی خود تاریخ انسانی کیوں کہ خالق کائنات نے انسانوں کو اپنے تجربات ومشاہدات، اپنے افکار وخیالات دوسروں تک پہنچانے کے لیے صرف قوت گویائی ہی نہیں دی؛ بلکہ اس میں تنوع بھی پیدا کیا، نیز دوسروں کے خیالات وافکار سے واقفیت ہونے اور اپنے افکار و خیالات دوسروں تک پہنچانے کی بے پناہ خواہش بھی عطا کی ، دراصل یہی لسانی تنوع اور ترسیلی وتفہیمی خواہش ترجمہ کا اولین محرک ہے۔ ہر دور میں اس عہد کی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا ہے ترقی کی رفتار بڑھ رہی ہے، مختلف زبانوں کے افراد ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں ترجمہ کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے۔

ترجمہ وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعہ دوسری زبانوں اور تہذیبوں سے متعارف ہونے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ یہ دو نامانوس اور غیر معروف زبان بولنے والے افراد کو ایک دوسرے سے قریب کرتا ہے۔ ان کے خیالات اور مافی الضمیر دوسرے کے سامنے ظاہر کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ترجمے نے ایک قوم کے علمی ذخیرہ سے دوسری قوم کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے وسیلہ سے ایک انسانی گروہ کے تجربات سے دوسری جماعتوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ شہباز حسین لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ وہ کنجی ہے جس کے ذریعہ علوم وفنون کے دروازے سب کے لیے کھل جاتے ہیں'' 4؎

انسانی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون کے فروغ میں جہاں دیگر اسباب وعوامل کارفرما رہے ہیں وہاں ترجمہ سب سے اہم سبب رہا ہے۔

> ''نئی زبانیں قدیم زبانوں کی انگلی تھام کر چلنا سیکھتی ہیں، اور قدیم وجدید زبانیں اپنی ہم عصر، زیادہ دولت مند زبانوں کا سہارا لیتی ہیں۔ یہ عمل تاریخ تمدن کے ایک باب کی طرح ہمیشہ سے جاری ہے اور ترجمہ ہمارا سب سے اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت یہ عمل آج تک جاری ہے، چراغ سے چراغ جلتا ہے اور کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے'' 5؎

ترجمہ کثیر لسانی دنیا میں بسنے والے انسانوں کے درمیان رابطہ کی لازمی بلکہ ناگزیر ضرورت ہے۔ اس کے بغیر دو الگ الگ زبان بولنے والے افراد ایک دوسرے کے خیالات سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ کثیر لسانی معاشرے میں ترجمہ کی اہمیت کا اندازہ اس رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو افریقی ممالک کے متعلق پیش کی گئی ہے۔ افریقی زبانوں پر یونیسکو کی بریف پالیسی کے مطابق:

> ''افریقہ میں دنیا کی آبادی کا تقریباً دس فیصد حصہ یعنی تقریباً ایک عرب لوگ رہتے ہیں۔ یہاں چھ بڑے لسانی خاندانوں سے مشتق دو ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ذرائع ابلاغ میں 242 افریقی زبانیں استعمال کی جاتی ہیں، عدلیہ میں 63 زبانیں استعمال کی جاتی ہیں، عوامی انتظامیہ کے شعبہ میں 56 زبانیں

استعمال ہوتی ہیں۔صرف نائیجریا میں 500 سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں'' 6

جہاں اتنی بڑی تعداد میں زبانیں بولی اور استعمال کی جاتی ہیں وہاں ایسے مقام اور ایسی صورتحال میں ترسیل وتفہیم کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہوگا۔ چنانچہ افریقہ میں بڑی تعداد میں مترجمین مقرر کیے جاتے ہیں جو مختلف شعبہ جات میں ترجمہ کا کام انجام دیتے ہیں۔

ہمارا ملک ہندوستان سرفہرست کثیر لسانی ممالک میں شمار کیا جاتا ہے۔

'' 2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں 122 بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، جب کہ 1599 دوسری زبانیں ہیں، 30 زبانیں ایسی ہیں جنہیں ایک ملین سے زائد افراد اپنی مادری زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ 122 زبانیں ایسی ہیں جنہیں 10 ہزار سے زیادہ لوگ بولتے ہیں۔ان میں 22 زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے'' 7

یہ بات بھی یادرکھنی چاہیے کہ گنیش دیوی کی نگرانی میں کیے جانے والے سروے میں کہا گیا ہے کہ:

"220 Indian languages have disappeared in the last 50 years" 8

(گزشتہ پچاس سالوں میں 220 ہندوستانی زبانیں ناپید ہوچکی ہیں)

آپ خود اندازہ کریں کہ جہاں زبانوں کی یہ کثرت ہو کیا وہاں ترجمہ کے بغیر ارسال وترسیل، معاملات زندگی، لین دین، کاروبار، انتظامی امور، عدالتی کارروائیاں، سماجی سرگرمیاں انجام دی جاسکتی ہیں۔

عام حالات میں تو ترجمہ کی ضرورت روزانہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات، لین دین و معاملات تک محدود رہتی ہے؛ لیکن کبھی کبھی اس کی اہمیت وضرورت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ قوموں کی ترقی کا مکمل انحصار اسی پر مرکوز ہوکر رہ جاتا ہے۔مقدمہ تاریخ یونان میں ڈاکٹر عبدالحق رقم طراز ہیں:

''جب قوم کی نوبت یہاں تک پہونچ جاتی ہے اور وہ آگے قدم بڑھانے کی سعی کرتی ہے تو ادبیات کے میدان میں پہلی منزل ترجمہ ہوتی ہے۔۔۔ایسے میں ترجمہ تصنیف سے زیادہ قابل قدر، زیادہ مفید اور زیادہ فیض رساں ہوتا ہے'' 9

ترجمہ ایسا فن ہے جس کے بغیر دوسری زبانوں کے علوم وفنون سے آشنائی نہیں ہوسکتی اور اس کے بغیر کوئی بھی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعوی نہیں کرسکتی۔ ترجمہ ہی وہ فن ہے جس کے ذریعے سے ایک قوم دوسری قوم کے ذخیرۂ علم وادب سے آشنا ہوتی ہے:

''ترجمے ہی کے ذریعہ ایک مخصوص ملک، ایک جغرافیائی علاقے اور ایک خاص قوم کی تحقیقات، اس کے علوم وفنون تمام انسانیت کی ملکیت بنتے ہیں'' 10؎

عہد حاضر میں دنیا کا دائرہ سمٹ رہا ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں وسعت آجانے کی وجہ سے دنیا کی مختلف زبانیں بولنے والے لوگوں میں ارتباط و اختلاط روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضرورتاً ایک دوسرے کی زبان سیکھنی پڑتی ہے۔ یہ عہد سائنس وٹکنالوجی کے عروج کا عہد ہے۔ اب فضائے بسیط کی طرح انسان کا علم بھی بے کراں ہوگیا ہے۔ علمی وسعتوں میں اضافہ اور سکڑتی انسانی دوریوں کے درمیان توازن پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ترجمہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ترجمہ کی ضرورت بھی روز افزوں ہو رہی ہے۔ اب تو اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ زندگی کے دیگر شعبہ جات کی طرح ترجمہ کو بھی مشینی اور خودکار کردیا جائے تاکہ ہزاروں افراد کا کام مشین کے ذریعے بہ آسانی انجام دیا جاسکے۔

ترجمہ کی اہمیت

گوئٹے کا قول ہے:

''جملہ امور عالم میں، جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے'' 11؎

عظیم مورخ ڈینیل بروسٹن نے ترجمہ کی اہمیت اس طرح بیان کی ہے:

"Translation is a great device of exploration" 12؎

ترجمے کی اہمیت اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ اگر ترجمہ نہ ہوتا تو ہماری زندگی کنویں کے مینڈک کی طرح سمٹ کر رہ گئی ہوتی۔ ترجمہ ہمیشہ سے ایک ناگزیر ضرورت رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاہے اس کے تئیں

جتنے بھی منفی نظریات قائم گئے ہوں اور ترجمہ کی راہ میں کتنی ہی دشواریاں پیش آتی رہی ہوں لیکن ترجمے کا عمل تاریخ کے کسی بھی دور میں بند نہیں ہوا؛ کیونکہ ترجمہ انسان کو انسان سے قریب کرتا ہے۔ ترجمہ ترسیل کا ایک اہم ذریعہ بن کر ہمیں نامعلوم سے معلوم کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک شخص کے خیالات ونظریات کو دوسروں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ترجمہ انسانی تہذیبوں اور قوموں کے درمیان پائی جانے والی متعدد رکاوٹوں کو دور کر کے درمیان میں حائل خلیج کو ختم کرتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس رقمطراز ہیں:

''انسانوں کے درمیان باہمی ارتباط، اتحاد اور یگانگت کی راہ میں جو سب سے اہم فطری رکاوٹ حائل رہی ہے، شاید وہ زبانوں کا فرق ہے۔ اس فرق کو مٹانے اور انسانوں کے علم وعرفان اور ادب کو بنی نوع انسان کی مشترک میراث بنانے میں ترجمہ نے جو اہم کردار ادا کیا ہے انسانی تہذیب کی تاریخ کا ہر ورق اس کا گواہ ہے۔'' 13؎

ترقی یافتہ اقوام کی محنت وکاوش علوم وفنون کی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ ترقی پذیر اقوام بھی اپنی محنت و کاوش سے علوم وفنون کو ترقی دے سکتی ہیں لیکن اگر ترقی یافتہ اقوام کے تحقیقی نتائج سے آگہی ہو جائے تو اسی کام کو دوبارہ کرنے کے بجائے سابقہ نتائج سے استفادہ کرتے ہوئے اس کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور اس طرح ترقی پذیر اقوام ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ ترقی کی منزلیں طے کر سکتی ہیں۔ ترجمہ اس عمل میں بے حد معاون ہوتا ہے؛ کیوں کہ علوم وفنون کو اپنی زبان میں منتقل کر کے مترجم اپنی قوم کو نئی راہوں پر گامزن کرتا ہے۔ اردو میں ترجمے کے اولین دور کے نظریہ ساز ناقد حاجی احمد فخری کہتے ہیں:

''یہ امر مسلم الثبوت ہے کہ جب کوئی قوم علوم وفنون میں ترقی کا پہلا قدم اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے علمی زبانوں کے تراجم سے اپنی زبان کو سرمایہ دار بناتی ہے اور اپنے خزانوں کو معمور کرتی ہے۔'' 14؎

ترجمہ ہر دور میں، ہر زبان میں قوموں کے اندر انجام پانے والی ترقیوں، مختلف علاقوں میں بسنے والی اقوام کے طرز معاشرت اور ثقافت سے واقفیت کا اہم ذریعہ رہا ہے۔ اس قسم کی قدیم وراثتیں ایک عہد سے

دوسرے عہد، ایک علاقہ سے دوسرے علاقے، ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک نسل سے دوسری نسل تک ترجمہ کے سہارے ہی منتقل ہوتی رہی ہیں۔ کیتا کری کوشاری ڈائسن لکھتا ہے:

> Without it (translation) we would be imprisoned in a monocultural world, knowing neither our own ancient heritage, nor the heritage, ancieant or modern, of other cultures, near or far. Without translation we cannot understand the cultures of either our nearby neighbours or of our far-flung neighbours thousands of miles away. 15ؔ
>
> (ترجمہ کے بغیر ہم یک ثقافتی دنیا میں قید ہو جائیں گے نہ ہمیں اپنے قدیم وجدید ورثہ سے واقفیت ہوگی نہ آس پاس اور دور دراز کی ثقافت سے۔ ترجمہ کے بغیر نہ ہم اپنے گرد و نواح میں بسنے والے انسانوں کی ثقافت سے آشنا ہو سکیں گے نہ ہزاروں میل دور بسنے والے انسانوں کی ثقافت سے)

مذہب ہمیشہ اور ہر دور میں ترجمہ کا اہم ترین محرک رہا ہے۔ نیز یہ کہ مذہب کی ترویج واشاعت کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ نئے نئے علاقوں اور خطوں کے افراد تک مذہب کو پہنچانے کے لیے ترجمہ کی مدد لی جاتی ہے۔ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور وہ لوگ جو عربی سے ناواقف ہیں ان کے لیے براہ راست قرآن مجید کے مفاہیم کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ ایسے افراد کو اس کے معانی ومطالب کو سمجھنے کے لیے ترجمہ کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ترجمہ سے خوب استفادہ کیا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں مذہبی کتابیں خصوصاً بائبل کے بے شمار ترجمے کئے گئے۔

اسی طرح نظریات وخیالات سے واقفیت کے لیے بھی ترجمہ ایک اہم وسیلہ ہے۔ سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

''اقوام کے درمیان لین دین اور افہام وتفہیم محض معاشی وسیاسی سطح پر نہیں ہوتی،

فکری اور تہذیبی سطح پر بھی ہوتی ہے۔اس سطح پر دیکھا جائے تو ترجموں کی اہمیت و وقعت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔'' 16؎

افلاطون وارسطو کے خیالات ونظریات بھی ترجمے ہی کے ذریعہ دنیا بھر میں پھیلے۔ مارکس نے جو سماجی نظریہ پیش کیا تھا وہ بھی ترجمہ کے ذریعہ ہی ساری دنیا میں مقبول ہوا۔ دنیا کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں مارکسی نظریات کو ترجمے کے ذریعے ہی منتقل کیا گیا۔ڈاکٹر ظ۔انصاری لکھتے ہیں:

''سقراط'' دی مقراطیس'' اور افلاطون کی دو ہزار سال سے زیادہ پرانی کاوشیں روما اور یونان کے قدیم کھنڈروں میں دب دبا کر رہ گئی ہوتیں۔ اگر عربی زبان کے ذی علم مترجمین انھیں وہاں سے نکال کر یورپ اور ایشیا کی آخری سرحدوں تک کھلی ہوا میں نہ لے گئے ہوتے۔ بوعلی سینا، ابن رشد، ابونصر فارابی کے کارنامے یروشلم، غرناطہ اور بغداد کے محاصرے میں دم توڑ چکے ہوتے اگر بعد کی لاطینی زبانوں نے انہیں اپنے یہاں منتقل کر کے تاریخ وفلسفے کے اگلے ورق کے لیے محفوظ نہ کرلیا ہوتا۔'' 17؎

ترجمہ زبان کی ترقی میں بھی معاون ہوتا ہے۔ اس میں اظہار کے نئے اسالیب، نئے محاورے، نئے استعارے اور علامتیں، نئی لفظیات واصطلاحات داخل ہوتی ہیں جس سے زبان کی قوت اظہار میں اضافہ ہوتا ہے۔

''کسی ادب کا دور تراجم فکری وسعت اور اسالیب بیان کے نزع کا دور ہوتا ہے۔ یہ دور ذہنوں کے افق وسیع کرتا ہے، پیرایۂ بیان میں رنگارنگی پیدا کرتا ہے اور جس طرف دیکھا نہ تھا اس کی طرف دیکھنے کی رغبت دلاتا ہے۔'' 18؎

ترجمہ زبان کی ساخت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ادب نئی اصناف اور نئی ہیئتوں سے روشناس ہوتا ہے جو تخلیقی سطح پر فنکاروں کی توجہ اور نئی تخلیقات کے لییت حریک کا سبب بنتا ہے۔

''نوزائیدہ اور ترقی یافتہ دونوں زبانوں میں علمی وفلسفیانہ ابلاغ واظہار میں ترجمے بڑے معاون ہوتے ہیں۔ ترجموں ہی کی مدد سے کوئی زبان ابتدا میں گردو پیش کی زبانوں کا اثر ونفوذ قبول کرتی ہے۔ نئے الفاظ کا اخذ وانتخاب کرتی ہے

اور ترجموں ہی کی مدد سے اس میں بلحاظ ہیئت و معنی علمی و ادبی مباحث کے اظہار
کا ذریعہ بننے کی صلاحیت وقوت پیدا ہوتی ہے۔'' 19؎

ترجمہ کے وسیلہ سے ہی ایک زبان دوسری زبان کے رجحانات وتخیلات اور افکار ومزاج نیز اس کی صرفی ونحوی ساخت سے آگاہ ہوکر زبان کے رنگ وروپ کو اپناتی ہے اور اپنی تنگ دامنی کو وسعت میں تبدیل کر لیتی ہے۔ دوسری زبانوں کی اعلیٰ تخلیقات کا ترجمہ بارہا قلمکاروں کو نئے ادبی رجحانات، تہذیبوں اور فنی معیاروں سے متعارف کرا کر جدید احساسات وتجربات اپنانے پر آمادہ کرتا رہا ہے۔ تاریخ میں مختلف قوموں پر یہ مراحل آئے جب انھوں نے اس راستے پر اپنے قدم بڑھائے اور یہی ترجمے خیالات میں تغیر اور علمی وسعتوں میں اضافہ کا سبب بنے، تصنیف وتالیف کے جدید اسلوب و آہنگ میسر ہوئے۔ اس کی سب سے واضح مثال ہماری اردو زبان ہے۔ جس کم مدت میں اردو نے ترویج وترقی کے یہ مراحل طے کیے اس میں ایک اہم سبب ترجمہ رہا ہے۔ بلکہ اردو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اردو ایک مکمل زبان بنی ہی ترجمہ کے ذریعہ۔

''اردو تو ایک باقاعدہ زبان بنی ہی ترجموں کی بدولت ۔۔۔۔ بولی سے زبان تک کا
فاصلہ طے کر لینے میں ترجموں کا بڑا ہاتھ ہے۔'' 20؎

ترجمہ کے سہارے اردو نہ صرف ایک زبان بنی بلکہ اسے وہ مقام ملا کہ وہ دنیا کی دوسری زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اردو کو ایک جدید زبان بنانے، ملک گیر سطح پر اسے
مقبولیت بخشنے اور ہندوستانی زبانوں میں اسے ایک امتیازی شان عطا کرنے میں جہاں
چند دوسرے عوامل رہے ہیں وہاں ۔۔۔۔ تراجم نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔'' 21؎

ترجمہ کے ذریعہ اردو کی لسانی ساخت اس قابل ہوئی کہ اس میں پیچیدہ سے پیچیدہ مضامین بھی بیان کیے جا سکیں۔ اردو میں تقریباً تمام علوم کہیں نہ کہیں ترجمہ کے مرہون منت ہیں۔ ابتدا میں یہ تراجم عربی اور فارسی سے ہوئے اور بعد میں انگریزی استعماریت کے زمانے سے انگریزی زبان سے ترجمہ کا رجحان پیدا ہوا۔ جس کی بنا پر اردو میں مختلف سائنسی علوم منتقل ہوئے۔ مرزا حامد بیگ رقم طراز ہیں:

''اردو میں مغربی زبانوں سے تراجم کا جائزہ اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ اردو زبان کی وسعت اور گہرائی و گیرائی میں اخذ و ترجمے کا خاصا اہم کردار رہا ہے: مثلاً یہ کہ ادبی تراجم نے نئے اسالیب بیان کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرایۂ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال پیدا کیا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کیے۔ نیز یہ کہ نئی نئی اصناف سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان اصناف کو فنی وقار بھی بخشا۔'' 22

ترجمے صرف زبان پر ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ قوموں کی تقدیر کی تشکیل میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اقوام عالم پر ترجمے نے کیسے اثرات ثبت کیے ہیں اس کا اندازہ عہد عباسی کے تراجم اور یورپی نشاۃ ثانیہ میں راجر بیکن کی تحریک ترجمہ سے کیا جا سکتا ہے۔انسانی تاریخ کے ہر دور میں ایک نہ ایک قوم نے زندگی کے مختلف شعبوں میں دیگر اقوام کی قیادت کی ہے۔یونانی دور سے اب تک کی تاریخ یہی بتاتی ہے۔اپنے عروج میں مسلمانوں نے یونان اور سلطنت رومہ کا علمی سرمایہ ترجمے کے ذریعہ عربی میں منتقل کیا اور اس سے بیش بہا فائدہ اٹھایا۔تاریخ نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا اور مغربی یورپ کی اقوام نے عربی سے تمام علمی سرمایہ اپنی اپنی زبانوں میں ترجمہ کر دیا۔

ترجمہ کی روایت

ترجمہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود تاریخ انسانی۔مختلف ادوار میں مختلف ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ترجمہ کا عمل ہوتا رہا ہے۔مشرق و مغرب ہر دو اطراف میں ایک زبان سے دوسری زبانوں میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے۔ تراجم کی ابتدا مذہبی ترجموں سے ہوئی کیوں کہ ہر مذہب کا پیروکار اس بات پر کامل یقین رکھتا ہے کہ اس کا مذہب سچا اور ذریعہ نجات ہے چنانچہ وہ اپنے مذہب کے پیغام کو دوسروں کی ہدایت کے لیے ان تک پہنچانا چاہتا ہے جس کے لیے ترجمہ کی ضرورت پڑتی ہے۔چنانچہ ندا (1959-1998:12-23) کے مطابق ترجمہ کا آغاز Septuagint کی تخلیق سے ہوا جو کہ عہد نامۂ عتیق کا عبرانی زبان سے یونانی زبان میں اولین ترجمہ تھا۔

بدھ مذہب کی اشاعت کے لیےبھی ترجمے کیے گئے۔اشوک نے بدھ مت کے پرچار کے لیے پالی اور پراکرت زبانوں کا استعمال کیا تاکہ عام لوگوں تک بدھ مت کی تعلیمات پہنچائی جاسکیں۔مختلف مقامات پر ہمیں جو کتبے اور لاٹیں ملتی ہیں ان پر گوتم بدھ کے اقوال اور بدھ مت کے اصول درج ہیں۔یعنی یہ تحریریں گوتم بدھ کی تعلیمات کا پالی یا پراکرت میں ترجمہ ہیں۔

مذہب اسلام جب عرب سے نکل کر دنیا کے دوسروں خطے تک پہنچا۔داعیان اسلام پیغام خداوندی کو لے کر دوسرے علاقوں میں پہنچے اس وقت افہام وتفہیم اور اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے ترجمہ کی ضرورت پیش آئی۔یہی وجہ ہے کہ ابتدائے اسلام سے ہی ترجمے کی روایت ملتی ہے۔پیغمبر اسلام جناب محمد الرسول اللہﷺ نے حضرت زیدؓ کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا۔انہوں نے بہت جلد زبان سیکھ لی۔یہ بھی ذو لسانیت کی طرف ایک قدم تھا۔حضرت سلمان فارسیؓ نے قرآن کریم کے کچھ حصوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اسلامی مملکت حدود میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور بہت جلد عراق،ایران،شام،مصر اور شمالی افریقہ اس نئے نظام حکومت کا حصہ بن گئے۔جب اسلام عرب مما لک سے نکل کر دیگر مما لک میں پھیلا تو ایک نیا تہذیبی ماحول پیدا ہوا۔نئی اسلامی مملکت نے اس دور کی تمام متمدن تہذیبوں کو یک جا کر دیا تھا جس میں یونانی، ہندوستانی، ایرانی اور مغربی تہذیبیں شامل تھیں۔عربوں نے ان تمام تہذیبوں کی خصوصیات اور ان کی علمی کاوشوں سے استفادہ شروع کیا۔سیکھنے کے اس عمل میں ترجمہ نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔

تاریخ میں عربوں کے سر ہی یہ سہرا بھی جاتا ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے ترجمہ کے کام کو منظّم اور ادارہ جاتی شکل میں انجام دیا۔یہ کام خلافت بنوامیہ میں شروع ہوا اور خلافت عباسیہ میں اپنے عروج کو پہنچا۔ عباسی خلیفہ مامون الرشید کا دور ترجمہ کے لیے سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔ترجمہ کا مرکز بغداد تھا۔عربوں نے سنسکرت، فارسی،شامی، رومی اور دیگر کئی زبانوں کے متون کو عربی میں منتقل کیا۔انہوں نے ریاضی،فلکیات، فلسفہ،منطق،طب، کیمیا اور سیاسیات یعنی اس وقت تک مروج تمام علوم کی طرف توجہ دی۔البتہ ادب پر ان کی توجہ نسبتاً کم رہی،اس کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ایک تو اس دور کے ادب میں اکثر ایسی باتیں ہوتی تھیں جو اسلام کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہوتی تھیں یا یہ کہ خود عربی زبان میں اعلی پائے کا ادب موجود تھا اس لیے ان کو

ادب کے تراجم کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

اسلامی مملکت میں ترجمہ کی اس کوشش کو حکمرانوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔ دوسرے عباسی خلیفہ المنصور نے دنیا میں پہلی مرتبہ ایک دارالترجمہ قائم کیا اور پوری دنیا سے مختلف زبانوں کے عالموں اور مترجمین کو مدعو کیا۔ بعدازاں مامون الرشید نے اس ادارہ کو مزید توسیع دی۔

217ھ/832ء میں بغداد میں دارالحکمت کا قیام عمل میں آیا۔ اس میں 65 مترجمین کا تقرر ہوا۔ ان مترجمین میں 45 مترجمین یونانی اور شامی زبانوں کے، 17 فارسی کے، 2 سنسکرت کے اور 1 رومی زبان کے مترجم تھے۔ اس دور کے معروف مترجمین میں سرجیوس راس جس نے جالینوس کی طب واخلاقیات سے متعلق کتابوں، اور ارسطو کی منطق سے متعلق کتابوں کا سریانی میں ترجمہ کیا۔ عبداللہ بن المقفع جس نے کلیلہ ودمنہ کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا، حنین بن اسحاق جس نے یونانی سے سریانی اور عربی میں ترجمہ کیا، اس کا بیٹا اسحاق بن حنین، اس کا بھتیجا حبیش بن الحسن، یحیٰ ابن البطریق، عبدالمسیح بن عبداللہ بن ناعمہ الحمصی اور قسطا بن لوقا البعلبکی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

عربوں کے علاوہ ترجمہ کی ایک مضبوط روایت چین میں بھی ملتی ہے۔ چین میں ترجمہ کی روایت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کی پہلی لہر بدھ مت کی اشاعت کی غرض سے شروع ہوئی۔ یہ کام دوسری صدی عیسوی کے درمیانی حصہ میں شروع ہوا۔ بدھ مت کے سوتروں کا چینی زبان میں ترجمہ ہوا۔ بڑے پیمانے پر ترجمہ کی تحریک چلی جسے حکومت کی سرپرستی بھی حاصل رہی، سنسکرت سے چینی زبان میں بدھ مت کے سوتروں کے ترجمے کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا دور:	148-265 عیسوی	شرقی ہان سلطنت کے تین بادشاہوں کا دور
دوسرا دور:	265-589 عیسوی	جن سلطنت اور شمالی وجنوبی سلطنتیں
تیسرا دور:	589-1100 عیسوی	سوئی سلطنت اور شمالی سانگ سلطنت

پہلے دور کے مترجم زنجیانگ اور وسطی ایشیا سے تعلق رکھنے والے راہب تھے۔ جو اپنی مذہبی شناخت کے باعث محترم سمجھے جاتے تھے لیکن چینی زبان پر انہیں مکمل عبور نہیں تھا۔ یہ بیرونی راہب اپنے چینی معاونین کی

مدد سے ترجمے کرتے تھے۔ یہ تراجم راست سنسکرت سے نہیں بلکہ ان راہبوں کی مادری زبان کے ذریعہ ہوئے۔

دوسرے دور میں ترجمہ کا کام مختلف سرکاری منصبوں پر مقرر بیرونی راہبوں کے ذریعہ انجام پایا۔ یہ ترجمہ زبانی کیا جاتا تھا جس کو بعد میں ضبط تحریر میں لایا جاتا تھا۔ تیسرے دور میں چنندہ لوگوں نے ترجمہ کا کام انجام دیا۔

ترجمے کی دوسری لہر بھی پہلی لہر کی طرح مذہبی سرگرمیوں کے متعلق تھی۔ ان میں خاص طور پر ان عیسائی مشنریوں کی وجہ سے عروج ہوا جو چینی سلطنتوں کے دربار میں سولھویں صدی عیسوی کے دوران آئے تھے۔ چینی دربار میں کئی عیسائی مشنریوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس دور کی ترجمہ شدہ کتابیں خاص مقصد کو ذہن میں رکھ کر تیار کی گئی تھیں۔ 1628ء سے 1635ء کے دوران جان آدم شل نے فلکیات کی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس دور میں ریاضی، علم نجوم، جغرافیہ، طبیعات اور بائبل وغیرہ کے تراجم قابل ذکر ہیں۔

یورپ میں ترجمہ کی روایت نہایت قدیم ہے۔ ابتدا میں یہ کوشش انفرادی نوعیت کی تھی۔ یورپ میں ترجمہ کو بعد میں فروغ حاصل ہوا کیوں کہ دیگر اقوام کے مقابلے میں وہاں مذہبی جمود زیادہ تھا۔ چوں کہ چرچ کا غلبہ تھا اس لیے اس قسم کی کاوشوں کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ بہت سے مترجمین کو اس جسارت کے لیے سزا سے بھی گزرنا پڑا؛ لیکن پندرہویں اور سولھویں صدی میں یورپ میں ترجمہ کے تعلق سے انفرادی اور ادارہ جاتی دونوں سطحوں پر زبردست کام ہوا۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ میں ان تراجم نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

جس طرح نویں صدی عیسوی سریانی، یونانی، لاطینی اور سنسکرت سے عربی زبان میں تراجم کی صدی شمار ہوتی ہے بعینہٖ اس طرح 12ویں اور 13ویں صدی (1280-1125) کا زمانہ عربی سے لاطینی زبان میں ترجمے کا زمانہ ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اسپین میں عربی، لاطینی اور فرانسیسی زبانیں خوب پھل پھول رہی تھیں۔ اس دور میں اطالوی عالم اور مفکر جرارڈ آف کری مونا (1187-1114) نے 80 ضخیم کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں منتقل کیں۔ جن میں خوارزمی کی کتاب الجبر والمقابلہ، بطلیموس کی المجسطی، ابوبکر رازی کی سر الاسرار، بوعلی سینا کی قانون الطب، جابر ابن افلاح کی کتاب، کتاب الحیات، ابوبکر رازی کی الطب

المنصوری،(10 جلدیں)،الخوارزمی اورالبتانی کی الذیج یادگار ہیں۔یہی وہ زمانہ ہے جب ابن ماجہ اورابن بیطارعربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ابوبکر رازی کو لاطینی زبان میں سب سے زیادہ قابل توجہ سمجھا گیا۔ یہاں تک کہ اطالوی مفکر جرارڈ کے تراجم کے بعد بادشاہ وقت چارلس آف آنجو کے حکم خاص سے 13ویں صدی میں بھی رازی کے افکار کا ترجمہ کیا گیا۔

ہندوستان میں آرین اقوام سے لے کر انگریزوں کی آمد تک تراجم کے ذریعہ یہاں کی تہذیب وثقافت میں بہت سی روایتوں اور ثقافتی عناصر کا انجذاب ہوتا رہا ہے اور وہ آج ہماری تہذیب کا جز ولاینفک بن گئے ہیں۔ اسلام کی آمد کے ساتھ قرآن کریم اوراحادیث کی کتابوں کے تراجم مقامی زبانوں میں کیے گئے جو ہندوستان کے لیے نئی روشنی ثابت ہوئے۔عربی وفارسی سے علمی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے۔اس طرح انگریزوں کی آمد کے ساتھ انگریزی زبان میں موجود جدید مغربی سائنسی علوم کے تراجم واشاعت نے ترقی کی نئی راہیں دکھلائیں۔

اردوزبان میں ترجمے کی روایت بہت قدیم ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو میں ترجمے کا آغاز اردوزبان میں شعروادب کے آغاز کے ساتھ ہوگیا تھا۔کیونکہ جن افراد نے اردو میں شعروادب کی تخلیق شروع کی ان کی اصلی زبان اس وقت فارسی تھی اور جن اولین ادیبوں اور شاعروں نے فارسی اثرات کے تحت اردو شاعری اور نثری ادب کی تخلیق کی انھوں نے بے شمار فارسی اشعار اور کئی فارسی تصانیف کو بھی اردو میں منتقل کیا۔اس طرح اردو کے اولین مترجمین وہی ہیں جنہوں نے اردو میں ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔

ہندوستان میں یورپیوں کی آمد کے بعد عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے اپنی مذہبی کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کیا۔اس طرح اٹھارھویں صدی کے وسط میں انجیل وتوریت کے اردو ترجمے شائع ہونے شروع ہوئے۔ مذہبی کتابوں کے اردو ترجموں کے سلسلے میں سب سے پہلے جس مترجم کا نام سامنے آتا ہے وہ بنجامن شلٹز ہے جو ڈنمارک کا ایک پادری تھا۔اس نے 1739ء میں انجیل کا ترجمہ شروع کیا اور 1741ء میں مکمل کیا۔ یہ ترجمہ 1848ء میں شائع ہوا۔ادبی و مذہبی تراجم کے علاوہ اردو میں علمی وسائنسی کتابوں کے ترجموں کا کام بھی فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوگیا تھا۔جس میں خالص علمی بنیادوں پر اردو زبان میں دیگر زبانوں کی سائنسی وعلمی تصانیف کا ترجمہ ہونے لگا تھا۔فورٹ ولیم

کالج،فورٹ سینٹ جارج کالج، دارالترجمہ شمس الامرا،نوابین اودھ کے زیراہتمام ہونے والے تراجم، دلی کالج، ورنیکلرٹرانسلیشن سوسائٹی، سائنٹفک سوسائٹی، مہاراجہ رنبیرسنگھ کا دارالترجمہ اورسب سے اہم ادارہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ترجمہ کے میدان میں نہایت شاندارروایت رہی ہے۔فورٹ ولیم کالج سے لےکرآج تک ہندوستان میں ترقی اردو بیورو(موجودہ قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان)،ادارہ ادبیات اردو،انجمن ترقی اردو ہنداور پاکستان میں مقتدرہ قومی زبان کراچی واسلام آباد کے مترجمین تک اردومترجمین کی ایک طویل فہرست ہےجنھوں نے اپنی گراں مایہ خدمات سےاردومیں ترجمہ کی روایت کوگہربارکیا ہے۔

دنیا کی تدریجی ترقی میں تراجم نے تازہ دم ہواؤں کا کام کیا ہےجس سے پژمردہ سماجی گروہوں نے نئی زندگی اورنئی روشنی حاصل کی ہےاورخودکوعصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا ہے۔تراجم کے ذریعہ ایک متمدن گروہ نے دوسرے متمدن گروہ سے تہذیب وثقافت اورعلمی میدانوں میں بہت کچھ سیکھا اورحاصل کیا جس کا تسلسل ہنوز قائم ہے۔اس اکتساب اورآگاہی کےعمل میں سب ہی شامل ہیں، دنیا کا کوئی سماجی ولسانی گروہ اس سے مبرانہیں ہے۔ یونیورسٹی آف حیدرآباد کے ڈاکٹر بی آر باپو جی نے اپنے ایک مضمون A Short History of Transltaion Studies میں 3000 سال قبل مسیح سے لےکر 20ویں صدی تک کے ترجے کی مختصرتاریخ کوسمیٹنے کی کوشش کی ہے۔23؎

ادب

کوئی بھی گفتگو یا تحریر کسی زبان کے پیکر میں ظاہر ہوتی ہے۔ بامعنی گفتگو کا نقطہ آغاز آوازوں یا حروف کے ایسے مجموعے سے ہوتا ہے جو ایک گروپ کے لوگوں کے درمیان مشترکہ مفہوم رکھتا ہو جسے ہم زبان سے تعبیر کرتے ہیں۔

زبان کی تعریف: ڈاکٹر محی الدین قادری زور زبان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پس زبان کی واضح تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے کہ زبان انسانی خیالات اور احساسات کی پیدا کی ہوئی ان تمام عضوی و جسمانی حرکتوں اور اشاروں کا نام ہے جن میں زیادہ تر قوت گویائی شامل ہے اور جن کو ایک دوسرا انسان سمجھ سکتا ہے اور جس وقت چاہے اپنے ارادہ سے دہرا سکتا ہے۔ 24ؔ

سید احتشام حسین نے ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از جان بیمز کا ترجمہ پیش کرتے ہوئے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:

''زبان آوازوں کے ایک ایسے مجموعے کا نام ہے جسے انسان اپنا خیال دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے ارادتاً نکالتا ہے اور ان آوازوں کے معنی معین کر لئے گئے ہیں تاکہ کہنے اور سننے والے کے یہاں تقریباً ایک ہی جذبہ پیدا ہو، الفاظ ان ذہنی تصویروں کی ملفوظی علامتیں ہیں۔'' 25ؔ

ادب کی تعریف:

قدرت نے انسان کو سوچنے، غور وفکر کرنے کا ملکہ عطا فرما کر دیگر حیوانات سے ممتاز کیا مزید اسے اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانے کی بے پناہ خواہش بھی ودیعت فرمائی، جس کی تکمیل کا ذریعہ زبان ہے۔ اسی کے ساتھ انسان کے اندر تخلیقی صلاحیت بھی موجود ہے۔ وہ اپنی تخیلاتی حس کو بروئے کار لا کر ایسے شاہکار تخلیق کرتا ہے جو اسے اور دوسرے انسانوں کو سامان تسکین فراہم کرتے ہیں۔ اس عمل کو ہم آرٹ یا فنون لطیفہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ادب آرٹ کی ہی ایک شاخ ہے۔

ادب کیا ہے؟ اس کی تعریف اسی طرح مشکل ہے جس طرح دوسرے فنون کی۔ خاص طور پر ایسی تعریف جس پر سب کو اتفاق ہو۔ یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ''ادب'' کیا ہے؟ لیکن اس سے قبل یہ سوال پوچھا جائے کہ ''زندگی'' کیا ہے؟ تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سوال کا جو بھی جواب دیا جائے گا وہ جامع و مانع نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کے تجربات و مشاہدات مختلف ہوتے ہیں۔ زندگی یک رنگ گزرتے لمحوں کا نام نہیں، نیرنگیوں میں ڈوبی صبح وشام کو مرمر کر جیئے جانے کا عمل ہے۔ زندگی درحقیقت امید وبیم کے محور، خوشی وغم کے منظر، جزا، سزا، امکان، ناامیدی اور ان تمام انسانی جذبات واحساسات، تجربات و کیفیات سے مملو ومزین ہے جس کے استقصا سے لسان عاجز اور لغات قاصر ہیں۔

زندگی ہر انسان کے سامنے الگ رنگ وروپ دھار کر آتی ہے۔ اس لیے وہ زندگی کے اسی رخ سے آشنا ہوتا ہے؛ یہ وجہ ہے کہ زندگی کی کیفیت ونوعیت کی بابت ایک شخص کے جواب سے دوسرے کا مطمئن ہونا قدرے مشکل ہے۔ ادب زندگی کا عکاس وغماز ہے اس لیے 'ادب کیا ہے؟' اسی نوعیت کا مشکل سوال ہے جیسے 'زندگی کیا ہے؟'۔

لفظ ادب مختلف النوع مفہوم کا حامل ہے۔ ماقبل اسلام عربی میں اس لفظ کو ضیافت اور مہمان نوازی کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ بعد کے زمانے میں اس کے اندر شائستگی کا مفہوم بھی شامل ہوگیا۔ عربوں میں مہمان نوازی کو بہت احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اسے شرفاء کی علامت شمار کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں شرافت، حسن سلوک اور خوش بیانی جیسے معانی بھی داخل ہوگئے کہ یہ سب لازمۂ مہمان نوازی ہیں۔ عہد بنو امیہ میں زبان کے تحریری سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ صحت بیان کو قائم رکھنے کے لیے صرف ونحو کی جانب توجہ دی گئی۔ بعد کے ادوار میں ادب کو مخصوص معنی دے دیا گیا۔ تخیل، جذبات، احساسات اور کیفیات سے پُرتحریر کو ادب کہا گیا۔ وقیع، عمدہ، دل پسند نثری وشعری تخلیقات کو ادب کے زمرے میں شامل کیا گیا۔

ادب عربی زبان کا لفظ ہے جس انگریزی متبادل Literature ہے۔ عربی اردو لغت القاموس الوحید میں ادب کا معنی ہے:

سلیقہ، تہذیب، شائستگی، اچھا طریقہ، کسی علم وفن یا صنعت وحرفت کے آداب، قواعد وضوابط، ادبی کلام، عمدہ نظم یا نثر، ہر وہ علم ومعرفت جو عقل انسانی کی تخلیق ہو۔26

آکسفورڈ ڈکشنری میں Literature کا معنی ہے:

pieces of writing that are valued as works of art 27

(ایسی تحریریں جو فن کا درجہ رکھتی ہیں)

مشہور اردو لغت فیروز اللغات میں ادب کا معنی ہے:

ہر چیز کی حد کو نگاہ رکھنا، حفظ مراتب، کسی بزرگی یا عظمت کا پاس، تہذیب، شائستگی، تمیز، احترام، علم زبان جس میں نحو، لغت، عروض، انشا، معانی اور بیان وغیرہ داخل ہیں۔ پسندیدہ طریقہ، زبان کا سرمایہ (لٹریچر)۔ 28

مختلف ماہرین نے ادب کی الگ الگ تعریف بیان کی ہے۔ ان تعریفات یا ان کے اطلاق میں کسی قدر افراط وتفریط نظر آتی ہے۔ میتھو آرنلڈ نے اس کو اتنا عام کر دیا کہ وہ تمام علوم کو محیط ہو گیا۔

وہ تمام علم جو کتب کے ذریعے ہم تک پہنچتا ہے، ادب کہلاتا ہے۔29

آرنلڈ کی تعریف کو اگر درست مان لیا جائے تو معاشیات، سیاسیات، سماجیات، ارضیات، ریاضی وغیرہ مضامین کے بشمول اصول وقواعد سب ادب کا حصہ قرار پائیں گے؛ جبکہ ایسا نہیں ہے۔

نارمن جودک کہتا ہے:

''ادب مراد ہے اس تمام سرمایہ خیالات واحساسات سے جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔'' 30

اس تعریف کی رو سے جو کچھ مکتوب ہے وہی ادب کا حصہ ہے۔ غیر مکتوب زبانی ادب، ادب کا حصہ نہیں ہے۔ حالانکہ زبانی ادب کی قدیم روایت موجود ہے۔ عرب میں بہت سے ایسے شعرا گزرے ہیں جو زبانی اشعار کہتے تھے۔ یہ اشعار بڑی بڑی محفلوں اور بادشاہوں کے درباروں میں سنائے جاتے تھے۔ اس پر انہیں

داد و دہش سے نوازا جاتا تھا۔تحریر کے عام ہونے سے پہلے یہ اشعار سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے۔ بہت بعد کے زمانے میں انہیں ضبط تحریر میں لایا گیا۔ظاہر ہے کہ زیب قرطاس ہونے سے پہلے ہی سے ان کو ادب کا حصہ مانا جائے گا۔

کارڈ ڈینل نیومین نے ادب کی تعریف اس انداز سے کی ہے:

''انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے ادب کہلاتا ہے۔''31

''غبار کارواں'' کے مصنف یوں رقم طراز ہیں:

''انسان کا کلام جب تک ضروری اور معمولی دائرے میں رہتا ہے تو اسے زبان کہتے ہیں، اور اگر اس کلام میں وسعت پیدا کر کے ایک مضمون کوئی اسلوب میں ڈھال دیا جائے تو اسے ادب کا نام دے دیا جاتا ہے۔''32

سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

وہ تمام تحریریں ادب کے دائرے میں داخل سمجھی جائیں گی جن کے مطالب کو ذوق سلیم معیاری تصور کرے گا اور جن کا اسلوب نگارش صناعانہ اور فنکارانہ ہوگا کہ حسن صنعت یا فن کی صنعت لازم ہے۔33

ادب کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے ایسا معقول وحتمی کلّیہ ہے جس پر مشرق ومغرب کے تمام مفکرین کا اجماع ہو۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے ادب کی تمام قابلِ لحاظ تعریفات کو یکجا کر کے ایک جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

''ادب وہ فن لطیف ہے جس کے ذریعے ادیب جذبات وافکار کو اپنے خاص نفسیاتی وشخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی وتنقید بھی کرتا ہے اور اپنے تخیل اور قوتِ مخترعہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے ایسے موثر پیرائے اختیار کرتا ہے جس سے سامع وقاری کا جذبہ وتخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا

ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل اور جذبہ متاثر ہوا۔‘‘ 34؎

ادب کی ان تمام تعریفات سے یہ بات واضح ہے کہ حسین لہجہ اور خوبصورت پیرایہ میں مقصود کے بیان کو ادب کہا جاتا ہے۔ ادب کی تخلیق ایسے الفاظ کے ذریعے ہوتی ہے جن میں جذبہ وفکر شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کی لفظوں کے ذریعے جذبے، احساس یا فکر و خیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔ ادب ایسا ’’اظہار‘‘ ہے جو زندگی کا شعور وادراک حاصل کرنے کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں انسان کے تخیلی تجربے کو اُبھارنے کی ایسی زبردست قوت ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس تجربے کا ادراک کر لیتا ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں۔

ادب ایسا لطیف فن جس کے وسیلے سے ایک ادیب اپنے جذبات واحساسات اور افکار و خیالات کو اپنے نفسیاتی وشخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنی تخیلاتی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جس سے سامع اور قاری بھی جذبے وتخیل میں ادیب کے ہم سفر ہو جاتے ہیں۔

ادب کسی ایک زبان کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اس کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔ دنیا کی تمام ہی زبانوں میں ادب تخلیق کیا جاتا ہے؛ کیونکہ ادب کا راست تعلق زندگی اور اس میں رونما ہونے والے واقعات سے ہے۔ اظہار خیال کا کوئی بھی مرحلہ ہو ادب کا دامن تھامے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔

> ’’ادب کے لئے زبان کی حیثیت گہوارہ کی ہے جس میں ادب پرورش پاتا ہے اور زبان ادب کے علاوہ زندگی کی دیگر ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے اور اپنی طاقت واثر پذیری کے لئے ادب کو ذریعہ بناتی ہے۔‘‘ 35؎

ادب زندگی کے اندر نئے معنی کی تلاش جستجو کا نام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ادب کی تعبیر شعور زندگی سے کی جاتی ہے۔ ایک ایسا شعور جو ہماری ذات میں تبدیلی لاتا ہے، ہماری قوت فکر وعمل کو تحریک دیتا ہے۔ ایسے واقعات، حادثات وتجربات جو کہیں اور رونما ہوئے کسی اور پر گزرے وہ ہماری ذات کا حصہ بن جاتے ہیں، ہم خود کو اسی کردار کے مقام پر رکھ کر ذہنی طور پر اسی تجربے سے گزرتے ہیں۔

ادبی ترجمہ

انسان کے اندر قدرت نے جو فطری جبلتیں رکھی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر ، اپنے احساسات، تجربات اور مشاہدات سے دوسروں کو باخبر کرنا چاہتا ہے اور خود دوسروں کے احوال و افکار سے واقف ہونا چاہتا ہے۔ جب یہ مرحلہ زبان و بیان کے مطلوبہ لوازمات کے ساتھ وجود پذیر ہوتا ہے تو ادب تخلیق پاتا ہے اور جب دو اجنبی زبانوں کے ادب میں افادہ واستفادہ کے عمل شروع ہوتا ہے تو ادبی ترجمے وجود میں آتا ہے۔

معلومات کی ترسیل و تحصیل کی خواہش لامحدود ہے اور زبانوں سے واقفیت کا دائرہ بہت محدود۔ ایک فرد بیک وقت عموماً ایک یا دو زبان جانتا ہوتا ہے۔ کثیر اللسان افراد بہت کم ہوتے ہیں اور اگر ہیں تو چند زبانیں ہی جانتے ہوں گے جب کہ دنیا بھر میں بے شمار زبانیں موجود ہیں۔ ادبی جواہر پارے کی حامل ایسی کئی زبانیں ہوتی ہیں جن سے ہم استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس منزل کو سر کرنے کا اہم ترین وسیلہ ترجمہ نگاری ہے۔ جس طرح کسی زبان میں تخلیقی ادب کا پیدا ہونا اور اس عمل کا جاری رہنا اہمیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح زندہ زبانوں کے اندر دوسری زبان کے ادب سے ترجمے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ایزرا پاؤنڈ کا ماننا ہے کہ:

> ''جو دور تخلیقی ادب کے لحاظ سے عظیم ہوتا ہے وہ ترجموں کے لحاظ سے بھی عظیم ہوتا ہے۔ یا تخلیق کا دور ترجمے کے دور کے بعد آتا ہے''۔36؎

اردو زبان میں موجود ادب اس کی بہترین مثال ہے۔ اردو زبان کی نشو ونما اور ترقی میں تراجم کا بہت اہم کردار رہا ہے؛ بلکہ اردو کے تعلق سے یہاں تک کہا گیا کہ یہ باضابطہ زبان ہی ترجمے کے ذریعے بنی۔ اردو کے ابتدائی زمانے سے لے کر تراجم ہو رہے ہیں اور اب بھی جاری ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں یہ کام قدرے رفتار کے ساتھ انجام دیا گیا۔ اردو میں ترجمے کی روایت پر تفصیلی گفتگو آگے کی جائے گی۔

ادبی ترجمے میں تخلیقیت کی تلاش اس کو دیگر تراجم سے ممتاز بناتی ہے۔ ادبی ترجمہ بڑا مشکل کام ہے کیونکہ اس میں صرف متبادل الفاظ ہی کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ شعر و ادب کی تخلیقی روایات اور تاریخی پس منظر سے واقفیت بھی بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ادب سراسر وجدان سے عبارت ہوتا ہے، اس لیے تخلیقی

ادب کے تراجم میں وجدانی کیفیت کا شامل ہونا ضروری ہے اور جذبات کا ترجمہ میکانیکی عمل سے بروئے کار نہیں لایا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی ادب کے تراجم کو ماہرین نے ایک مشکل امر سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا کہ شاعری کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے شعر و شاعری کے ترجمے کو اس شاخ سے تعبیر کیا ہے جسے چھوتے ہی اہلِ علم کی انگلیاں جل جاتی ہیں۔

ترجمے کے عمل میں یہ بحث بہت ہی قدیم ہے کہ آیا ادب کا ترجمہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں موافق و مخالف دونوں نظریات موجود ہیں۔ دونوں موقف کے حامل افراد نے اپنے موقف کی تائید میں اس موضوع پر الگ الگ انداز سے گفتگو کی، اپنے اپنے نظریات اور نقطۂ ہائے نظر پیش کیے اور ان کو ثابت کرنے کے لیے مضبوط دلائل پیش بھی کیے ہیں؛ لیکن جن لوگوں نے اس موضوع پر گفتگو کی ہے وہ یا ان کی آرا اپنی آخری انتہا پر ہیں۔

جو لوگ ادبی ترجمے کے امکان کی حمایت کرتے ہیں ان کی اہم اور بنیادی دلیل ترجمے کی سرگرمی ہے۔ اپنے نظریے کے اثبات میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ زبانوں کا لسانی تعامل ہمیشہ سے رائج رہا ہے۔ زبانیں ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتی ہیں، دوسری زبانوں کے اندر موجود علمی، مذہبی اور ادبی ہر قسم کے سرمایے کو اپنے اندر جذب کرتی ہیں۔ کسی بھی زبان کا بہترین سرمایہ صرف اسی زبان کی حد تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسری زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو، تہذیبی خلیج میں کمی واقع ہو، نئے نظریات و افکار سے واقفیت کا موقع ملے، دوسری زبان کے رجحانات، تخیلات، مزاج نیز لسانی خوبیوں سے اپنے اندر مزید وسعت پیدا کی جائے، نئی ادبی اصناف کا اضافہ ہو اور دیگر زبانوں کے فنی معیارات سے واقفیت کا موقع نصیب ہو۔ چنانچہ شیکسپیر کی تخلیقات کا دنیا کی بہت ساری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ غالبؔ کی آفاقی شاعری صرف اردو تک ہی محدود نہیں ہے۔ موپاساں فرانسیسی اور چیخوف روسی ادب کی ہی جاگیر نہیں رہے۔ خلیق انجم نے اس حوالے سے بڑی عمدہ رائے پیش کی ہے:

''ترجمہ ناممکن ہے؛ لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔''[37]

پروفیسر محمد حسن لکھتے ہیں:

''ضرورت اکثر برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دیتی ہے۔ ایسی ہی ایک برائی ترجمہ بھی ہے۔'' 38؎

اردو زبان میں ادبی ترجمے کی جانب بہت توجہ دی گئی، بے شمار مترجمین نے دلجمعی و دلچسپی کے ساتھ اس کار دشوار کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ یہاں تک کہ مذہبی کتب جو ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں ان کے نہ صرف نثری ترجمے ہوئے بلکہ منظوم تراجم بھی خوب کیے گئے۔ بھگوت گیتا اور رامائن کے علاوہ قرآن کریم جو کہ عربی ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے، سب کے معیاری منظوم ترجمے ہوئے جن میں سیماب اکبرآبادی، کیف بھوپالی اور شان الحق حقی کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگریزی سے اردو میں ادبی تراجم کا آغاز مولانا محمد حسین آزادؔ اور الطاف حسین حالیؔ نے کیا، جس کا سلسلہ انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا، بیسویں صدی، خاص طور پر اس کے ربع اوّل میں تراجم کو بے حد فروغ ملا۔ تراجم کو مقبول بنانے میں اس عہد کے ادبی رسائل نے بھی اہم کردار ادا کیا، جن میں ''مخزن''، ''دکن ریویو''، ''افادہ''، ''تمدن''، ''تجلی''، ''ادیب''، ''زمانہ''، ''ہمایوں'' اور ''ادبی دنیا'' متعدد انگریزی نظموں کے ترجمے شائع کرنے میں پیش پیش رہے۔ مترجمین میں علامہ اقبال کے علاوہ ضامن کشوری، عزیز لکھنوی، ظفر علی خان، غلام نیرنگ، حسرت موہانی، علی حیدر زیدی، غلام محمد طور، صادق علی کشمیری، شاکر میرٹھی، تلوک چند محروم، طالب بنارسی، محمد شفیع اور کرشن چندر کے نام معروف ہیں۔ یہ تمام کاوشیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ادب کا ترجمہ نہ صرف ممکن ہے بلکہ اس کی بہت قدیم و روشن روایت چلی آرہی ہے۔ مرزا حامد بیگ کی کتاب ''مغرب سے نثری تراجم'' اور حسن الدین احمد کی ''ساز مشرق'' اور ''ساز مغرب'' میں اسی روایت کو مدون کیا گیا ہے۔ تقریباً تمام غیر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبانوں کی صورت حال کم و بیش یہی ہے، ترقی یافتہ زبانوں میں دوسری زبان کے ادب کے ترجمے پر کم توجہ مرکوز کی جاتی ہے لیکن ایسا صرف ادب کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ وہاں تمام علوم کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔

ادبی ترجمے کے مخالفین کا یہ کہنا ہے کہ کسی بھی زبان کا ادب اس زبان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتا ہے۔ زبان کی تمام تر نزاکتیں، باریکیاں، خوبیاں، لطافت اور حسن درحقیقت ادب کا ہی حصہ ہیں اور ادب میں ہی ان کو

بدرجۂ اتم برتا جاتا ہے۔کثیر لسانی دنیا میں ہر زبان کسی نہ کسی خاص علاقے سے تعلق رکھتی ہے، کسی خاص مقام پر اس کی خصوصی نشو نما ہوتی ہے (گو کہ بعد میں اشاعتی و دیگر عوامل کے پس پردہ زبان کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے)۔یہی وجہ ہے کہ ہر زبان پر واضح علاقائی اثر ہوتا ہے زبان اسی خاص علاقے کی تہذیب، ثقافت، تمدن، رہن سہن، مذہب، عقائد، نظریات اور فطرت میں رچی بسی ہوتی ہے۔اسی سے زبان کی شناخت بھی بنتی ہے اور زبان کے اجزا بھی تشکیل پاتے ہیں۔زبان کو بلند ادبی معیار عطا کرنے والے عناصر: استعارے، تشبیہات، تلمیحات، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال، مخصوص اشارے و کنائے ان سب کی جڑیں زبان کی اپنی تہذیب میں اس طرح پیوست ہوتی ہیں کہ اگر ان کو ذرا بھی الگ کرنے کی کوشش کی جائے تو زبان کی ممتاز وجداگانہ شناخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ترجمے میں ایک زبان دوسری زبان کے پیکر میں ڈھلتی ہے۔ترجمہ کلی طور پر منتقلی کا عمل ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ جب بھی ایک زبان کے علائم کو دوسری زبان میں منتقل کیا جائے گا تو اس میں تبدیلی واقع ہونا یا پہلی سی جامعیت و کاملیت باقی نہ رہنا ایک فطری و لازمی امر ہے۔لہٰذا ترجمے کے بعد ہدفی زبان میں تیار شدہ متن میں اصل زبان کا سا حسن اور ویسی خوبی باقی نہیں رہ سکتی، ادبی چاشنی، اسلوبی تنوع، زبان کی لفظی، معنوی و صنعتی نیرنگیاں باقی نہیں رہیں گی؛ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس کو منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر صفت و علائم اور اسلوب وطرز ادا کی انفرادیت و جاذبیت کسی بھی صورت میں منتقل نہیں کی جا سکتی ہے تو پھر ترجمہ شدہ متن ادبی و شعری اوصاف سے یکسر خالی ہوگا، ایسی صورت میں کیا اسے ادبی کہا جا سکتا ہے؛ کیونکہ ان کا تعین تو مندرجہ بالا ادبی عناصر کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ فکر و خیال اور موضوع وغیرہ کی بنیاد پر۔

ان دونوں گروپوں کی آرا اور دلائل پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ادبی ترجمے کے امکان و عدم امکان کے متعلق کچھ بھی کہنے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم ترجمہ کس چیز کا کرتے ہیں؛ لفظ کا یا معنی کا۔جو شخص بھی ترجمے کے میدان و عمل سے واقفیت رکھتا ہوگا وہ یہی کہے گا کہ جب ہم ترجمے کا عمل انجام دیتے ہیں تو اس کے ذریعہ ہمارا مقصد مفہوم یعنی معنی کو منتقل کرنا ہوتا ہے نہ کہ الفاظ کو اور الفاظ کا ترجمہ تو دور کی بات ہے ہم الفاظ کی بہت زیادہ پابندی و پیروی بھی نہیں کرتے۔یہ جواب بہت ہی خوبصورت اور مناسب معلوم

ہوتا ہے لیکن صرف علمی، سائنسی اور صحافتی تراجم کی حد تک ہی اس کی خوبصورتی برقرار رہ سکتی ہے ادبی ترجمے میں نہ اس جواب سے کام چلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ جواب فٹ آسکتا ہے؛ کیونکہ ادب صرف خیالات یا اس سے اوپر اٹھ کر صرف جمالیات، احساسات ووجدان کا ہی نام نہیں ہے؛ بلکہ زبان کی صنعتوں، نزاکتوں اور باریکیوں کا بھی نام ہے۔ ادب میں اہل زبان کے لیے جو چاشنی ولذت ہوتی ہے اس کی اہم وجہ الفاظ کا محل استعمال، ترتیب، غنائیت، آہنگ اور جملوں کی ترکیب ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مضائقہ نہیں ہوگا کہ ادب میں بہت حد تک لفظوں کی بازی گری ہوتی ہے۔

ادب خواہ نثر ہو یا نظم دونوں کا ترجمہ انتہائی دقت طلب کام ہے۔ ترجمے کی اس مشکل سے سابقہ زیادہ تر کلاسیکی ادب میں پڑتا ہے۔ نثری ادب میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ہر مصنف کا اسلوب اس کے اپنے تخلیقی تجربے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لیے ایک زبان کے فن پارے کے اسلوب کو دوسری زبان میں منتقل کرنا از حد دشوار ہے۔ ہر زبان کے ادب کا خاص مزاج ہوتا ہے، لہجوں اور بولیوں کا جداگانہ آہنگ ہوتا ہے، لکھنوی رنگ میں رچے بسے ناول 'امراؤ جان ادا' کا ترجمہ اس لطیف ونزاکت آمیز ماحول سے نابلد زبان میں کیوں کر ممکن ہوسکتا ہے، رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' کے مسجع ومقفی اسلوب کو عربی وفارسی میں تو منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن کیا انگریزی و دیگر زبانوں میں اس کا نعم البدل مل سکتا ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی مکمل ہندوستانی دیہی فضا، ان کے کرداروں کا ٹھیٹھ دیہی عوامی لہجہ مغربی زبانوں میں کہاں تک منتقل کیا جاسکتا ہے؟

جب نثری ادب کا ترجمہ مشکل ہے تو شعری ادب کے ترجمے کی مشکلات کا از خود اندازہ کیا جاسکتا ہے؛ کیونکہ یہ ادب کی سب سے اعلیٰ قسم ہوتی ہے۔ اشعار کی اہم خوبی یہی ہے کہ اس میں معنوی تہہ داری ہو، وہی شعر زیادہ اچھا مانا جاتا ہے جس میں کئی معنی پوشیدہ ہوں اور مختلف لوگوں کے لیے اس میں معنوی لذت موجود ہو۔ غالب کو ہم اسی لئے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان کے اشعار کا معنوی افق بہت وسیع ہوتا ہے، اس میں نیرنگی، جدت اور تنوع ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق اس میں سے معنی اخذ کر لیتا ہے۔ جب بھی کوئی مترجم اس کا ترجمہ کرے گا تو وہ اس کی موجودہ تشریحات میں سے کسی ایک کا انتخاب کرے گا یا کوئی نیا معنی پیدا کرے گا دونوں صورتوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس شعر کی معنوی تہہ داری ختم ہوجائے گی اور اس

طرح شعر کا معنوی افق سمٹ جائے گا۔شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دانستہ ابہام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے،ترجمے میں اس ابہام کو برقرار رکھنا کس حد تک ممکن ہے؟

کسی بھی زبان کے الفاظ اس کے تہذیبی خمیر سے تیار ہوتے ہیں۔اہل زبان کے مزاج،آب وہوا، سماجی ومعاشی پس منظر،سیاسی صورت حال اور مذہبی وابستگی ہر ایک کا ان پر اثر ہوتا ہے۔جیسے ہندی زبان کا لفظ 'کلش' سراسر ہندو مذہب اور ہندوستانی تہذیب کا عکاس ہے۔اس کے ساتھ جو تہذیبی لگاؤ یا مذہبی عقیدت وابستہ ہے کسی دوسری تہذیب یا زبان کے فرد کے لیے اس کو پوری طرح سمجھنا انتہائی مشکل ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں کا حال یہی ہے کہ اس میں لفظوں کا جو کھیل ہوتا ہے اسے اہل زبان ہی کما حقہ سمجھتے ہیں اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ایسے افراد جن کی مادری زبان وہ نہ ہو،انھوں نے بعد میں ثانوی زبان کی حیثیت سے اس کو سیکھا ہو،خواہ ان کو اس پر کتنا ہی عبور ہو جائے ان کے اندر زبان کا وہ ذوق یا ٹیسٹ نہیں پیدا ہو پائے گا جو اہل زبان کے اندر ہوتا ہے۔مثال کے طور محبت،الفت،پیار اور عشق تقریبا ہم معنی لفظ ہیں۔ڈکشنری میں اگر دیکھا جائے تو تقریباً یکساں معنی ہی ملیں گے۔لیکن اہل زبان اچھی طرح واقف ہوتے ہیں کہ کس مقام پر کون سا لفظ استعمال کرنا ہے۔کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے اپنی ماں سے عشق ہے؛ حالانکہ اس میں معنوی اعتبار سے زیادہ شدت ہے۔لفظوں کا محل استعمال اور ان کی معنوی قوت سے اہل زبان ہی واقف ہوتے ہیں جیسے کسی معمولی پڑھے لکھے شخص کے بارے میں یہ کہا جائے کہ آپ افلاطونِ وقت ہیں،تو بجائے تعریف کے ذم شمار کیا جائے گا۔

اسی طرح بعض ادبی شہ پارے اہل زبان کی نظر میں تو قابل مسرت و قابل لطف ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے وہ انتہائی بے معنی اور بے وقعت ہوتے ہیں۔ان کے لیے اس میں نہ کوئی معنویت ہوتی ہے نہ کوئی لذت۔جیسے امرءالقیس کے معلقہ کا شعر ہے:

ترى بعر الآرام فى عرصاتها و كيعانها كانه حب فلفل

(اس کے صحن اور آنگن میں اونٹ کی مینگنیاں ایسے نظر آتی ہیں گویا کہ کالی مرچ کے دانے ہوں)

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی خاص معنویت نظر نہیں آتی لیکن اس کے باوجود یہ شعر نہ صرف اپنے عہد

میں پر لطف تھا بلکہ آج بھی عربی زبان وادب کا طالب علم اس کو بڑھتا ہے اور اس سے محظوظ بھی ہوتا ہے۔

غالبؔ کا مشہور مصرعہ ہے ''چلمن ہو یا نقاب سرکتی ضرور ہے''۔ اہل اردو اس مصرعے پر جھومتے ہیں ان کو اس سے خاص غنائی سرور ملتا ہے، ایک خاص منظر کی فلم ان کے ذہن میں کھنچ جاتی ہے۔ اس میں مستعمل الفاظ 'چلمن' اور 'نقاب' کا مخصوص ثقافتی پس منظر ہے، پھر لفظ سرکنا سے خاص معنویت پیدا کی گئی ہے۔ اب اگر اس مصرعے کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوگا کہ کیا انگریزی ادب یا تہذیب میں 'چلمن' اور 'نقاب' کا وہی تصور ہے جو مشرقی تہذیب میں ہے، دوسری بات یہ کہ انگریز قارئین کے ذہنوں میں یہ احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ اس شعر میں ایک عام سی بات کہی گئی ہے، کپڑا ہے تو سرک ہی سکتا ہے۔ داغؔ کا یہ شعر:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ظاہر ہے کہ ترجمے میں یہ لطیف نکتہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ مومنؔ کی غزل کا یہ مقطع ملاحظہ ہو:

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

اس شعر کا مفہوم تو دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے؛ لیکن مومن، بت خانہ، پارسا اور گمرہی کے درمیان صفت تضاد کو برت کر جو لطف پیدا کیا گیا ہے اس سے صرف اہل زبان ہی محظوظ ہو سکتے ہیں۔ دوسری زبان میں ایسے بہت کم لوگ ہوں گے جو ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کریں اور امتیازی تہذیبی شناخت کو پہچاننے کی کوشش کریں۔ اسی طرح بہادر شاہ ظفرؔ کا شعر ہے۔

رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا　　　صبح کو خوف شب تار نے سونے نہ دیا

اس شعر میں کوئی گہری معنویت تو نہیں ہے البتہ مخصوص صنعت کا التزام کیا گیا ہے، پہلے مصرع میں موجود لفظ 'رات' کی مناسبت سے مصرع ثانی میں اس کے بالکل برعکس حروف والے لفظ 'تار' کا استعمال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس کا ترجمہ کیا جائے گا تو اس کے مفہوم کو تو منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن اس لفظی صنعت کو کیسے اور کہاں تک برتا جا سکتا ہے؟ جب کہ شعر کی اصل جان یہی ہے۔ میر تقی میر کا شعر ہے۔

سرہانے میؔر کے آہستہ بولو　　　　ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سوؔدا نے اس شعر کو سننے کے بعد اسے میر کی والدہ کا شعر قرار دیا تھا۔ ان کے بقول ایسا لگتا ہے کہ کوئی ماں اپنے بچے کو بڑی مشقتوں سے سلانے میں کامیاب ہونے کے بعد وہاں موجود افراد سے خاموش رہنے کی درخواست کر رہی ہو؛ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے شعر میں بڑی لطیف نزاکت پوشیدہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ میؔر کے چند مشہور اشعار میں شامل ہے۔ اس شعر کے ترجمے سے کیا مقصد حاصل ہوگا نیز یہ کہ دوسری زبان میں میؔر کی یہ آہ کس حد تک سلامت رہے گی۔

اس نہج پر غور کیا جائے یا جائزہ لیا جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی ادب عالیہ بالخصوص شاعری کا ترجمہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے جیسے کلاسکیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ترجمے کی راہ میں دشواری بڑھتی جاتی ہے۔ مفہوم کی منتقلی تک تو معاملہ ٹھیک ہے لیکن متن کی صفات وشعریات کی منتقلی نہ صرف دشوار بلکہ کسی حد تک ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں مترجم ہی عاجز نہیں ہوتا، زبان بھی مجبور ہو جاتی ہے۔ جو تراجم ہمارے یہاں معروف مانے وسمجھے جاتے ہیں اور ادب عالیہ کا حصہ ہیں ان میں اولاً تو اکثریت نثری تراجم کی ہے، شعری ادب کے معروف ومقبول منظوم تراجم کی مثالیں بہت خال ہی نظر آتی ہیں، دوسرے یہ کہ ان تراجم کو معیاری قرار دیے جانے کے معیارات مجہول ہیں نیز ترجمے پر تنقید کے نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ کس حد تک لیا گیا ہے یہ بھی محل نظر ہے۔

لیکن ان تمام تر خدشات کے درمیان یہ حقیقت بھی رواں دواں ہے کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے کی قدیم روایت نہ صرف زندہ ہے؛ بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ توانا تر ہوتی جارہی ہے۔ یہ ترجمے اس لیے ضروری ہیں؛ کیونکہ زبانیں، خصوصاً غیر ترقی یافتہ وترقی پذیر زبانیں، ترقی یافتہ زبانوں سے مختلف طرح کا اخذ واستفادہ کرتی ہیں جن میں ادب بھی شامل ہے اور یہ استفادہ ترجمہ کی بدولت ہی ممکن ہوتا ہے۔ اگر اردو ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس کی ترقی اور نشو ونما میں ترجموں کا کافی اہم اور بنیادی کردار رہا ہے۔

لہذا یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ناممکن سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہوگا؛ ہاں ادب خصوصاً شاعری کا ترجمہ بہرحال اصل زبان میں تخلیق کی مانند جامع اور حسین نہیں ہوگا اس کی ادبی جہتوں اور خصوصیات میں ضرور کمی آئے گی، نہ اس میں ویسی گہری ومتنوع معنویت ہوگی جو اصل زبان کے قارئین کے

لیے اس متن میں موجود ہے اور نہ ہی وہ اس سے ویسا حظ اٹھا سکتے ہیں جیسا اصل زبان کے قارئین اٹھا سکتے ہیں ۔سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ ترجمہ ہدفی زبان کے قارئین کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اصل زبان کے قارئین کے لیے۔ان تمام نظریات واصول کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جس طرح اصل کے ہم پلہ ومماثل ترجمہ ممکن نہیں ہے اسی طرح ترجمے سے مفر بھی ممکن نہیں ہے۔اس لیے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ان دونوں انتہاؤں میں توازن قائم ہو اور راہ اعتدال اپنائی جائے۔ ادب کے ترجمے میں نہ تو اصل زبان کا مکمل حسن تلاش کیا جائے اور نہ ہی ایسا ہو کہ ترجمہ کو ہی ناممکن قرار دے دیا جائے۔

ادبی ترجمے کی تعریف

ادب انسان کے جذبات وخواہشات اور خیالات کا مظہر اور انسان و کائنات کے باہمی رشتوں کی تفہیم کا بہترین ترجمان ہوتا ہے۔ یہ ایک طرف تہذیب وثقافت کا علم بردار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کی تعمیر وتشکیل کا ایک بہترین وسیلہ۔اس لیے کسی تہذیب کے بہترین خیالات واحساسات کے اعلیٰ پیرایہ اظہار سے مستفیض ہونے کے لیے اور وجدانی و جمالیاتی ارتقاع کے لیے ادبی ترجمے کی اہمیت وافادیت مسلم ہے۔ادبی ترجمہ بڑی حد تک تخلیقیت کا حامل ہوتا ہے۔

> ''ادبی ترجمہ ایک خیال یا تصور کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی فضا اور روایت کو دوسری تہذیب وروایت سے ہم آہنگ کرنے کا عمل ہے۔''39؎

ایک اور تعریف ملاحظہ ہو:

> Translation is a genre of literary creativity in wich a work written in one language is re-reated in another.40؎
>
> (ترجمہ ادبی تخلیقیت کی ایک قسم ہے جس میں ایک زبان میں تحریر کیے گئے مواد کی دوسری زبان میں بازتخلیق کی جاتی ہے)

درحقیقت صحیح اور کامیاب ترجمے اسی صورت میں ممکن ہیں جب ہم لکھنے والے کے ذہن میں نہ صرف سفر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں بلکہ ان کیفیات اوراحساسات سے بھی گزر سکیں جو تصنیف کا ذریعہ بنی ہیں۔ترجمہ محض ایک جسم کو دوسرا لباس پہنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک جسم کے مقابلے میں بالکل ویسا ہی جسم تراش کر اسے دوسرے لباس میں اس طرح لے آنا ہے کہ دونوں قالبوں میں ایک ہی روح ہو۔یہاں لباس، جسم اور روح سے مراد ترجمے کی زبان، اصل عبارت کا مرکزی خیال اور وہ تاثر ہے جو پڑھنے کے بعد دل ودماغ میں قائم ہوتا ہے۔

ادبی ترجمے کی اقسام

ادبی ترجمے کی ادبی کو ہم دو اعتبار سے دیکھ سکتے ہیں۔اول متن کی نوعیت یعنی اس کے قابل ترجمہ اور نا قابل ترجمہ ہونے کے لحاظ سے، دوم اس کے ترجمے کے طریقے کار کے اعتبار سے۔پہلی صورت کے اعتبار سے ایزرا پاؤنڈ نے شاعری کے ترجمے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔شاعری ادب کی سب سے اعلیٰ مثال ہوتی ہے؛ لیکن اس پر نثر کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے۔عناصر کے ارتباط سے مسائل کا انطباق کیا جا سکتا ہے۔ ایزرا پاؤنڈ کی بیان کردہ اقسام ہیں:

(۱)فونا پوئیا (PHONA POEIA) (ایسی شاعری جس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے)

(۲)میلو پوئیا (MELO POEIO) (ایسی شاعری جس کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا ہے)

(۳)لوگو پوئیا (LOGO POEIO) (من وعن نہیں کیا جاسکتا، جھلک آسکتی ہے)41

اس تقسیم کی بنیاد متن کی تفہیم اور اس کی ترسیل پر منحصر ہے۔ پہلا مرحلہ ترجمے کے منتخبہ ادبی متن کو مترجم کے لیے سمجھنے کا ہے۔اس منزل کو سر کرنے کے بعد اس کو ہدفی زبان میں پیش کرنے کا۔یہیں ساری مشکلات شروع ہوتی ہیں۔ یہاں جتنے امکانات ہوتے ہیں اسی اعتبار سے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ منتخبہ متن کس قدر قابل ترجمہ ہے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی ایسی دو زبانیں نہیں ہوسکتیں جن کے درمیان یہ رکاوٹ نہ ہو۔ ایسا ضرور ممکن ہے کہ جغرافیائی، سماجی، ثقافتی اور لسانی قربت کی وجہ سے مسئلہ کی سنگینی کم وزیادہ ہو؛ لیکن بالکل ہی نہ ہو ایسا نہیں ہوسکتا۔مثال کے طور پر اردو میں فارسی اور عربی سے ترجماتی تعامل میں کم دشواری پیش آئے گی جب کہ انگریزی سے ترجمہ کرنے میں کئی طرح کی رکاوٹیں حائل ہوں گی۔

ادبی اصناف خواہ نثر ہو یا شعر دونوں میں اس طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے، شاعری میں زیادہ نثر میں کم۔ ادب کے ترجمے میں کیا ترجمہ ہوسکتا ہے اور کیا نہیں ہوسکتا اس کو بڑی سطح یعنی ایک پوری کتاب، مکمل نظم کے ساتھ ہی بہت ہی چھوٹی سطح ایک شعر اور ایک جملے وفقرے تک بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ایک ہی شعر کے دو مصرعوں میں ایک ترجمہ ہوسکتا ہے ایک نہیں ہوسکتا۔ ایک ہی مصرعے، ایک جملے کا ایک حصہ ترجمہ ہوسکتا ہے دوسرا نہیں ہوسکتا۔

ترجمہ نہیں ہوسکتا سے قطعی یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ترجمہ ہوگا لیکن متن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مطلوب ترجمہ نہیں ہوگا، ایسا ترجمہ نہیں ہوگا جو ترجمہ کے مخصوص ومحدود تعریف کے تابع ہو، یا وہ ترجمہ ہدفی زبان وقارئین کے قابل استفادہ ہو۔ ادب کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کو بارہا اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے ترجمے کے لیے کسی ادبی متن کا انتخاب کیا۔ ابلاغ مفہوم کے مرحلے میں اسے یہ معلوم ہوا کہ اس میں مذکورہ بالا بیان کردہ تینوں شکلیں موجود ہیں۔ جو حصہ ترجمہ نہیں کیا جاسکتا کیا اس کو چھوڑ دیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ اس مشکل سے نمٹنے کے لیے مترجم کئی راستے اختیار کرتا ہے۔ اور اسی سے ادبی ترجمے کے طریقہ کار کے اعتبار سے تقسیم ہوتی ہے۔

لفظی ترجمہ: یہ طریقہ شعری ترجمے کے لیے بہت کار آمد نہیں ہوسکتا، نثری اصناف کے لیے کسی حد تک مفید ہوسکتا ہے کہ کیونکہ لفظ کی جگہ متبادل لفظ رکھ دینے سے مفہوم تک رسائی تو ہو جائے گی، جب کہ شاعری میں مفہوم سے آگے بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔

آزاد ترجمہ: اس طریقہ میں مترجم کسی فن پارے کے مرکزی خیال اور اس کے مجموعی تاثر کو قائم رکھتے ہوئے ترجمے کا عمل انجام دیتا ہے۔ اس میں مترجم اصل زبان کے بجائے ہدفی زبان اور ہدفی قارئین کے تقاضوں کو زیادہ ملحوظ رکھتا ہے۔ اردو زبان میں اس قسم کے تراجم کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ خلیق انجم نے اپنے ایک مضمون میں طنزیہ تبصرہ کا ذکر کیا ہے:

> ''شکنتلا کے ایک مترجم سے کسی نقاد نے بہت صحیح کہا تھا کہ آپ اپنے ڈرامے کے کرداروں کے نام بدل دیجیے۔ اس سے کبھی کبھی کالی داس کی شکنتلا کا دھوکہ ہوتا ہے۔''42

ماخوذ ترجمہ: یہ آزاد ترجمے کا ہی جز ہے۔اس طرز ترجمہ میں اصل متن کے مرکزی خیال کو برقرار رکھنے کے بعد مترجم اپنے افکار و خیالات بھی شامل کر دیتا ہے۔ادب اطفال کے تراجم میں اس طریقہ پر بہت عمل کیا جاتا ہے۔

تخلیقی ترجمہ: ادبی ترجمے کی یہ سب سے اعلیٰ قسم ہے۔اس قسم کے ترجمے میں مترجم اصل متن کے اندر موجود جذبات، احساسات، کیفیات، تاثرات، مشاہدات و احوال کو من و عن پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل یہ ایک طرح سے بازیافت کا عمل ہوتا ہے۔

ادبی ترجمے کی ضرورت و اہمیت

ادب کے ترجمے کی ضرورت و اہمیت سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ادب کی کیا ضرورت و اہمیت ہے، اس کی افادیت کیا ہے؟ انسانوں کے اندر کچھ فطری ضروریات و خواہشات رکھی گئی ہیں بطن و فرج کی خواہش کے ساتھ اس میں ایک خاص طلب احساس جمال کی بھی رکھی گئی ہے، جس کی تسکین فنون لطیفہ سے ہوتی ہے اور فنون لطیفہ میں سے سب اہم ادب کا ایک جز شاعری ہے۔

ادب انسان کے جذبات و محسوسات کا سب سے خوبصورت، دلکش اور موثر ذریعہ اظہار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بہت سی قوموں اور بہت سے ملکوں میں انقلاب لانے کا اہم سبب شاعری ہی بنی، جس کی ایک بہترین مثال ہمارے ملک کی تحریک آزادی ہے۔

انسان اپنی زندگی میں جن چیزوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے اس میں سے ایک ادبی شاہکار ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ادب میں انسان کے خارجی و باطنی دونوں جذبات و احساسات کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ادب میں مذکور کیفیت کا ادراک ہر شخص اپنی زندگی میں کرتا ہے لیکن وہ اس کے لطیف و پر کیف و پر اثر اظہار پر قادر نہیں ہوتا ہے؛ لیکن جب کسی ادبی تخلیق کو دیکھتا ہے تو اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہے جو اس کے دل میں تھی، یہ تو اس کے اپنے تجربات ہیں، یہی جذبات تو وہ خود بھی محسوس کر رہا ہے۔

دنیا کی تمام زبانوں میں ادب کا ایک خاطر خواہ حصہ موجود ہوتا ہے۔جس طرح علوم و فنون کے سرمائے سے زبانیں وسیع و ثروت مانی جاتی ہیں۔ دنیا کی دیگر قومیں اور زبانیں اس سے استفادہ کرنا چاہتی ہیں۔ اپنے

خزانہ علم کو معمور کرنا چاہتی ہیں۔ بالکل یہی صورت حال ادب کے ساتھ بھی ہے۔ دنیا کی بے شمار زبانوں کی بقا اور شہرت اس لیے ہے کہ ان میں اعلیٰ پایہ کا ادب تخلیق کیا گیا۔ یونانی زبان کے عظیم شاعر ہومر کی شعری تخلیقات ''ایلیڈ'' اور ''اوڈیسی'' کو آج بھی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ فارسی کے شیخ سعدی، حافظ، عمر خیام اور رومی، عربی میں امراؤالقیس، متنبّی، جاحظ، عبداللہ ابن المقفع، اردو میں غالب، میر، اقبال اور فیض کے تخلیقی کارنامے دنیا کی کئی زبانوں میں موجود ہیں۔

ادب کے ترجمے کی ضرورت اس لیے ہے کہ انسانی جذبات غم، غصہ، محبت، عداوت، عشق، لالچ، حسد اور منافقت وغیرہ صفات انسانی جبلت کا حصہ ہیں، ان کی نوعیت عمومی ہے۔ یہ تمام صورتیں ہر ملک وقوم کے انسانوں میں مشترک ہوتی ہیں، اور ادب میں انہیں کیفیات کا فنکارانہ اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب میں افکار ونظریات کی پیش کش بھی ہوتی ہے۔ مشمولات سے قطع نظر اگر ادب ہے تو اس میں اسلوب اظہار ادبی ہوگا۔ ہر زبان میں پایا جانے والا ادب تمام تر فنی معیارات کو جامع ہوگا۔ افکار وجذبات سے مزین ادب ہمیں مسرت کے ساتھ بصیرت بھی عطا کرتا ہے اور ایسا ادب خواہ کسی زبان میں لکھا جائے اسے دوسری اقوام اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کریں گی۔

ادبی تراجم جن فوائد کے حصول کے پیش نظر کیے جاتے ہیں ان میں ایک تو دوسری اقوام کے افکار وخیالات، احوال ونظریات، مزاجی کیفیات نیز اخلاقی و جمالیاتی اقدار سے واقفیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس سے دو قوموں اور ان کی زبانوں کے مابین تہذیبی، لسانی اور فکری سطح پر اخذ واستفادے کا عمل جاری ہوتا ہے۔ ترجمہ نیم مردہ تہذیبوں میں نئی روح پھونک دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہدفی زبان افکار وخیال کے ساتھ نئے اسالیب اظہار سے آشنا ہوتی ہے، الفاظ نئے معانی کے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں، نئے، محاورے، تشبیہیں، ضرب الامثال زبان کا حصہ بن جاتے ہیں جس سے زبان کی تہذیبی صورت میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ادبی تراجم کی بدولت ایک کم مایہ زبان ایک ترقی یافتہ زبان سے بہت استفادہ کرتی ہے، کسی دوسری زبان کے مقابلہ میں اردو کی مثال زیادہ واضح اور ہمارے سامنے کی ہے کہ اس کو ایک ترقی یافتہ زبان بنانے،

قومی سطح پر مقبولیت بخشنے اور ملکی زبانوں میں امتیازی درجہ دلانے میں جہاں دوسرے عوامل کا عمل دخل رہا، وہاں انگریزی، عربی اور فارسی وغیرہ زبانوں سے مختلف علوم وفنون کے تراجم نے اس میں مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ایسے ہی تراجم نے نوخیز اردو زبان کے لیے ترقیوں کے نئے دروازے کھول دیے اوران کے وسیلہ سے تازہ افکار ونظریات بالخصوص آزادی، ترقی پسندی، روشن خیالی اور تحقیقی وسائنسی طرزِفکر کے جو خوشگوار جھونکے آئے، اُن سے اردو زبان میں توانائی اور تازگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اردو کو ایک باقاعدہ زبان کے مقام پر فائز کرنے میں تراجم کا سب سے بڑا کردار ہے۔فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج اور جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اس ضمن میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے،اس کی بدولت ہی یہ زبان بولی سے زبان تک کا سفر بآسانی طے کرسکی ہے۔

انسانی تہذیب وثقافت اور علوم وفنون کے فروغ میں جہاں دیگر اسباب وعوامل کارفرما رہے ہیں وہاں تراجم بالخصوص ادبی ترجموں کا اہم حصہ ہے۔ترجمہ کے اس فن نے انسانی تہذیبوں اور قوموں کے درمیان پائی جانے والی متعدد رکاوٹوں کو دور کر کے حائل خلیج کو پاٹا ہے اور اس کے ذریعہ ہر عہد اور زمانے میں نو بہ نو افکار و نظریات کو ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک پہنچنے میں مدد ملی ہے۔ترجمہ کے وسیلہ سے ہی ایک زبان دوسری زبان کے رجحانات وتخیلات اور افکار ومزاج نیز اس کی صرفی ونحوی ساخت سے آگاہ ہوکر زبان کے رنگ و روپ کو اپناتی ہے اور اپنی تنگ دامنی کو وسعت میں تبدیل کر لیتی ہے۔لہٰذا یہ دعویٰ کرنا صحیح ہوگا کہ دوسری زبانوں کی اعلیٰ تخلیقات کا ترجمہ بارہا قلمکاروں کو نئے ادبی میلانوں، تہذیبوں اور فنی معیاروں سے متعارف کرا کر جدید احساسات وتجربات اپنانے پر آمادہ کرتا رہا ہے۔

اردو میں ادبی ترجمے کی روایت

تاریخ کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ایران کے فرماں روا، بغداد کے عباسی خلفا اور مصر کے فاطمی خلفا، علم وادب کے رسیا تھے اور انھوں نے نہ صرف دنیا کے نامور شہ پاروں کو عربی زبان میں ترجمہ کروایا بلکہ اپنے زیر قبضہ علاقوں میں کتب خانے قائم کر کے منفرد اور قابلِ تقلید مثالیں بھی قائم کیں۔ بغداد کے بیت الحکمت اور مصر کے بیت الحکم جیسے کتب خانے، اپنی مثال آپ تھے۔یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں ترجمہ نگاری کی روایت اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اردو زبان۔ برصغیر پاک و ہند میں ترجمہ نگاری کے حوالے سے دیکھا

جائے تو یہ روایت تقریباً پندرھویں صدی کے نصف آخر میں اپنی ابتدائی شکل میں نظر آتی ہے۔

ایک عام رائے یہ بھی ہے کہ سولھویں اور خصوصاً سترھویں صدی کا زمانہ جنوبی ہند میں، عہدِ زریں کہلانے کا مستحق ہے۔ اس زمانے میں ترجمہ نگاری اور اردو زبان دونوں حوالے سے ایسے ایسے شاہ کار تخلیق ہوئے کہ جن کی اہمیت آج بھی مسلمہ ہے۔ اس دور میں تمام تراجم مشرقی زبانوں سے کیے گیے جن میں فارسی، عربی، سنسکرت اور برج بھاشا وغیرہ شامل ہیں۔ مغلوں کے عہد میں سرکاری اور مقامی ضرورتوں کی وجہ سے مختلف زبانوں سے فارسی میں اور فارسی سے ان زبانوں میں لازمی طور پر تراجم ہوتے ہوں گے، لیکن مغل بادشاہوں نے ہندوستانی ادب کی طرف بھی خاص طور سے توجہ کی۔ اکبر کے دور میں ایسے ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو فارسی سے بخوبی واقف تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر کو سنسکرت سے خاص لگاؤ تھا۔ اس نے سنسکرت سے شاعری، فلسفہ، ریاضی اور الجبرا وغیرہ کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اکبر ہی کے عہد میں کئی علما نے مل کر مہا بھارت کا فارسی ترجمہ کرنا شروع کیا جو ۱۹۵۱ء میں مکمل ہوا۔ لیلاوتی، نل دمن، تاجک اور ہری بنس وغیرہ کے تراجم تیار ہوئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ترجموں کی تیاری میں برہمن اور مسلمان عالم دونوں برابر کے شریک تھے۔

اردو میں ترجمے کی روایت ابتدائی دور ہی سے پڑ گئی گئی، گو کہ اس کو ترجمے کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ابتدائی دور کی اردو شاعری کے موضوعات، مفاہیم، شاعرانہ تصورات، تراکیب اور استعاراتی نظام تمام کا تمام فارسی شاعری سے مستعار نظر آتا ہے۔ یہ اثر تشبیہات و استعارات، تلمیحات، الفاظ اور فارسی اصناف سخن وغیرہ مستعار لینے تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ ہزاروں فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا۔

اردو ادب کے ابتدائی عہد میں بہت بڑی تعداد میں فارسی، عربی اور سنسکرت سے اردو نثر میں ترجمے کیے گئے۔ یہ ترجمے مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں، ہیئت، فلسفے کی کتابوں کے تھے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شاہ میراں جی خدا نما نے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضقاۃ ہمدانی کی تصنیف ''تمہیدات ہمدانی'' کا عربی سے اردو میں جو ترجمہ کیا تھا وہ اردو کا پہلا ترجمہ ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ ملا وجہی نے پہلی بار شاہ جی نیشاپوری کی فارسی تصنیف ''دستور عشاق'' کا

اردو میں ''سب رس'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ 1704 میں شاہ ولی اللہ قادری نے شیخ محمود کی فارسی تصنیف ''معرفت السلوک'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سید محمد قادری کی فارسی تصنیف ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہوا۔ تقریباً اسی زمانے میں فضل علی فضلی نے 1732ء میں ملاحسین واعظ کاشفی کی فارسی تصنیف ''روضۃ الشہدا'' کا اردو میں ''کربل کتھا'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ 1748ء میں بنجمن شلز نے انجیل کا ترجمہ ''کتاب پیدائش کے پہلے چار بابوں کا ترجمہ ہندوستانی'' پیش کیا۔ اس کے بعد شولٹز نے ''کتاب دانیال'' کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ اٹھارھویں صدی کے خاتمے سے کچھ پہلے مشہور بزرگ و عالم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے فرزندوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کریم کے ترجمے کیے۔ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ لفظی تھا جو 1786 میں شائع ہوا۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ پہلے ترجمے کے مقابلے سلیس اور آسان تھا جو 1795 میں شائع ہوا۔

جنوبی ہند دکن میں تو عادل شاہی دور میں بھی ترجمہ نگاری خوب پھلتی پھولتی نظر آتی ہے۔ اس دور کے اہم شاعر رستمی کی نظم 'خاور نامہ' دراصل ایک فارسی نظم کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح اس عہد کے ایک دوسرے شاعر ملک خوشنود کی مثنوی 'ہشت بہشت' خاصی مشہور ہے۔ یہ نظم امیر خسرو کی فارسی نظم پر مشتمل ہے۔ پھر مقیمی جو فارسی شاعر تھا نے ایک ہندی لوک کتھا 'چندر بدن مہیا' بڑے دل کش اسلوب میں لکھی ہے۔ 1554ء میں علی عادل شاہ ثانی برسر اقتدار آیا اس کے عہد میں بیجاپور کے باکمال شاعر نصرتی کے ڈنکے بجے۔ مثنوی کی ہئیت میں اس کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں، جن میں سے 'گلشنِ عشق' اور 'علی نامہ' کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔ بیجاپور کے ایک نابینا شاعر ہاشمی کی تصنیف 'یوسف وزلیخا' ایک آزاد ترجمہ ہے۔ اسی طرح قطب شاہی دور میں ترجمہ نگاری پر اچھا وقت رہا۔ اس دور میں ملا وجہی، محمد قلی قطب شاہ کے عہد کا بہت اعلیٰ پائے کا نثر نگار اور شاعر تھا۔ 1635ء میں ملا وجہی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب سب رس ترجمہ کی۔

مذہبی کتابوں کے علاوہ 1775ء میں فارسی داستان 'قصہ چہار درویش' کا ترجمہ عطا حسین خاں تحسین نے کیا۔ کتاب کا نام 'نوطرز مرصع' ہے۔ اس دور کی ایک کتاب 'بہادر نامہ' بھی ملتی ہے، جس میں سرنگا پٹم کی تواریخ ٹیپو سلطان کی جنگ تک جاتی ہے۔ خیال ہے کہ یہ بھی کسی فارسی تصنیف کا حصہ یا ترجمہ ہے۔ اس طرح

پنڈت دیا شنکر کا نام ان کی تصنیف 'گل زارِنسیم' کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ یہ مثنوی لکھنوی طرزِ تحریر کی نمایندہ مانی جاتی ہے۔ پنڈت جی نے 'لیلہ والف لیلیٰ' کی کچھ کہانیوں کا ترجمہ بھی کیا، مگر لازوال شہرت ان کی مترجمہ مثنوی 'گل زارِنسیم' کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

علامہ اقبال کی کئی شہرہ آفاق نظمیں بھی غیر ملکی ادب سے اخذ شدہ ہیں۔ ان میں 'ماں کا خواب'، 'بچے کی دعا'، 'ایک مکڑی اور مکھی'، 'ایک گائے اور بکری'، 'ایک پہاڑ اور گلہری' (ماخوذ از ایمرسن) 'ہم دردی (ماخوذ از ولیم کوپر)'، 'آفتاب' (ترجمہ، گایتری) 'پیامِ صبح' (ماخوذ از لانگ فیلو)، 'عشق اور موت' (ماخوذ از ٹینی سن)، 'رخصت اے بزمِ جہاں' (ماخوذ از ایمرسن) وغیرہ۔

فورٹ ولیم کالج کا قیام جب 1800ء میں ہوا تو تراجم کے منظّم سلسلے بھی شروع ہوئے عربی، فارسی اور سنسکرت کی معروف کتابوں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے کالج کے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ تر کلاسیکی زبانوں کی مشہور اور معروف کتابوں کو ہی اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔

ترجمے کی روایت کو ایک نئے موڑ سے آشنا کرانے میں دلی کالج (1825ء) نے بھی نمایاں کام انجام دیا۔ ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے انگریزی سے ترجمہ کرنے پر زور دیا اور آزاد ترجمے کو ترجیح دی۔ فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں یہاں زیادہ وسیع پیمانے پر ترجمے کے کام انجام دئے گئے لیکن یہاں ادبی کتابوں کے تراجم دوسرے علوم کے تراجم کے مقابلے بہت کم ہوئے۔ دلی کالج کے چند معروف ادبی تراجم میں امام بخش صہبائی کا ترجمہ 'حدائق البلاغت'، ماسٹر پیارے لال کا ترجمہ 'دربارِ قیصری' اور ان کے علاوہ دیگر ادبا کے تراجم قصہ چہار درویش، کلیلہ ودمنہ، شکنتلا، بدرِ منیر وغیرہ اہم ہیں۔ سید اعظم علی اکبر آبادی جو مرزا غالب کے دوستوں میں سے تھے، نے بھی 'سکندر نامہ' کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اسی زمانے میں خواجہ امان نے 'بوستانِ خیال' کے نام سے میر تقی خیال کی فارسی داستان کی دس جلدوں میں سے پانچ جلدوں کا ترجمہ کیا۔ اردو میں انگریزی کی منتخب نظموں کا پہلا ترجمہ 'جواہرِ منظوم' کے نام سے قلق میرٹھی نے اسی زمانے میں کیا۔ اسی زمانے میں گارساں دتاسی کے خطبات کا بھی اردو میں ترجمہ کیا گیا۔

ترجمے کی اس روایت میں سرسید کی تحریک کو بھی بڑا دخل ہے۔ سرسید کی سائنٹفک سوسائٹی نے ترجمے کی

اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن سیاسی اختلافات کے سبب ادبی تراجم کے اعلیٰ نمونے نہیں پیش کر سکی۔ چند ادبی تراجم جنہیں قبولِ عام حاصل ہوا ان میں عنایت دہلوی کے تراجم ہیں۔انہوں نے انگریزی ادب کی دقیق کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ان میں دانتے کی ڈیوائن کامیڈی، اناطولے فرانس کی تائیس، فلابئیر کی سلامبو، کپلنگ کی جنگل بک اور شیکسپئر کے ڈرامے شامل ہیں۔

1865ء میں جب انجمن پنجاب لاہور کا قیام عمل میں آیا تو اس کے تحت بھی ترجمے کے عمل کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہاں بھی ادبی کتب میں زیادہ دلچسپی نہیں لی گئی اور سائنسی کتب کے ترجمہ پر زور دیا گیا۔1865ء میں ہی روہیل کھنڈ میں ایک لٹریری سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔اس سوسائٹی میں بھی علمی اور مغربی علوم کی کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا گیا لیکن ادبی کتب کے ترجمے پر اس سوسائٹی نے بھی توجہ نہیں دی۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی انجمنوں کے تحت بھی ترجمے کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہی۔1903ء میں انجمن ترقی اردو کے قیام سے اردو ترجمے کی روایت کو ایک نئی جہت ملی یہاں ادبی تراجم کے ساتھ ساتھ وضع اصطلاحات پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔تاریخ ادبیاتِ ایران، خطباتِ گارساں دتاسی، تاریخ عہد انگلشیہ، مشاہیر یونان وروم وغیرہ اس انجمن کے یادگار تراجم ہیں۔اردو میں ترجمے کی اس روایت کو منظّم بنانے میں جامعہ عثمانیہ کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ یہاں تقریباً 500 کتابوں کے ترجمے کئے گئے۔جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں سائنسی کتب کے علاوہ ادبی اور نصابی کتابوں کے بھی ترجمے ہوئے۔

1936ء کے بعد اردو ادب میں ادبی اور تنقیدی تراجم میں اضافہ ہوا۔مغربی تنقیدی کتابوں کے بہت سے ترجمے اردو زبان میں پیش کئے گئے۔عزیز احمد نے ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ 'فنِ شاعری' کے نام سے کیا جس کو انجمن ترقی اردو نے 1941ء میں شائع کیا۔1968ء میں محمد ہادی حسن نے مغرب کی ایک تنقیدی کتاب کا ترجمہ 'مغربی شعریات' کے نام سے کیا۔ارسطو کی کتاب بوطیقا کا ترجمہ شمس الرحمٰن فاروقی نے 1978ء میں کیا۔1976 میں جمیل جالبی کی ترجمہ شدہ کتاب 'ارسطو سے ایلیٹ تک' شائع ہوئی۔ 'ایلیٹ کے مضامین' کے نام سے جمیل جالبی نے ایلیٹ کے انگریزی مضامین کو اردو میں منتقل کیا۔

اس دور میں ترجمے کی رَو پہلے سے کہیں زیادہ تیز ہوگئی۔ نیاز فتح پوری نے گیتا نجلی کا ترجمہ 'عرضِ نغمہ' کے

نام سے کیا۔سجاد حیدر یلدرم اور حامد افسر کے چند ترجمہ شدہ افسانے شائع ہوئے۔جلیل قدوائی ، صادق الخیری، منصور احمد، حامد علی خان، محمد مجیب، فضل حق قریشی،خواجہ مہدی علی خان وغیرہ نے مغربی افسانوں کواردو میں ترجمہ کرنے کی اہم ذمہ داری نبھائی۔ل،احمد نے فرانسیسی ادیبہ کی خودنوشت ’کیسانونا‘ کو’نئی صبح‘ کے نام سے ترجمہ کیا۔گوپی ناتھ امن 1961ء میں راجندر پرساد کی خودنوشت کواردو میں ’اپنی کہانی‘ کے نام سے ترجمہ کیا۔ان کے علاوہ محمد علی صدیقی نے ’کروچے کی سرگزشت‘اوراختر حسین رائے پوری نے ’گورکی کی آپ بیتی‘ کے نام سے ترجمہ کیا۔ان کے علاوہ اور بہت سے نام ہیں جن کا ذکر اس ذیل میں کیا جاسکتا ہے۔

مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم جس پیمانے پر اردو میں ہوئے اس سے اردو ادب کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔19ویں صدی کے نصف سے جو مغرب کے تخلیقی ادب کے تراجم سامنے آنے شروع ہوئے تو یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔پروفیسر قمر رئیس نے لکھا ہے کہ

”کم وبیش 1930ء تک اردو شعر وادب وکٹورین عہد کے انگریزی ادب کے سائے تلے پلتا اور لگ بھگ اسی سانچے میں ڈھلتا رہا۔“ 43؎

1903ء کے بعد دوسری زبانوں سے ترجمے شروع ہوئے اور اس دور کے تقریباً تمام ادیبوں نے فرانسیسی، روسی، ترکی، اطالوی، چینی اور امریکی ادب کے شاہکاروں کواردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں ترجمہ بطور فن اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا۔مشرق ومغرب کی بیشتر زبانوں کے تراجم آج ہمارے ادب میں موجود ہیں لیکن اس کا ایک کمزور پہلو بھی ہے۔ہمارے یہاں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہیں جن کی اپنی ایک تاریخ وتہذیب اور اپنا ایک ادب ہے۔ان علاقائی زبانوں کے ادبیات کے ترجم پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے اور میرے خیال میں اس عمل کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم دیگر ممالک کی تہذیب اور ان کے ادبیات سے جس قدر واقف ہیں اپنے ملک کے دوسرے علاقوں کی تہذیب اور ادبیات سے واقف نہیں ہیں۔اس سلسلے میں بعض کوششیں کی گئی ہیں مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی اور دیگر اداروں نے کچھ علاقائی ادب کے تراجم شائع کئے ہیں۔بعض تراجم انفرادی کوشش کے نتیجے میں بھی سامنے آئے ہیں لیکن یہ ناکافی ہیں۔اس سلسلے میں ابھی مزید پیش رفت کی ضرورت ہے۔اردو ادب کی

تخلیقات میں تیزی آجانے کے سبب ترجمہ نگاری کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ چند رسائل میں بھی کچھ ترجمے دیکھنے کومل جاتے ہیں۔موجودہ چند برسوں میں ترجمے کا جو اہم کام منظرِ عام پر آیا ہے ان میں ڈاکٹر ارجمند آرا کی 'جویندہ پابندہ' ہے جو رالف رسل کی آپ بیتی کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہے۔اسی طرح ڈاکٹر ارشاد نیازی نے پنڈت نارائن شرما کی کتاب 'ہتوپدیش' کا ہندی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔انہوں نے راجندر یادو کی منتخب ہندی کہانیوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے جو حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ سے شائع ہوئی ہے۔

حوالہ جات

1. سورۂ روم 30، آیت 22
2. تنقید کا نیا پس منظر: مکتبہ عالیہ، لاہور، طبع دوم ۱۹۸۶ء ۱۹۷۸ء۔ بحوالہ ترجمہ کا فن، مرزا حامد بیگ، ص ۸۹۔۹۰
3. Translatiing Culture, Introduction for Translators, Interpreters and Mediators, David Katan, second edition, Routledge.
4. شہباز حسین، ترجمے کی اہمیت، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 181
5. ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 68
6. The Importance of Translation, (posted on February 18, 2013, by mattindigo), http:// indigotrust.org. uk/2013/02/18/the-importance-of-translation/
7. http://en.wikipedia.org/wiki/Languages_of_India
8. BHASHA | GANESH DEVY | PEOPLE'S LINGUISTIC SURVEY OF INDIA (http://blogs.reuters.com/india/2013/09/07/india-speaks-780-languages-220-lost-in-last-50-years-survey/)
9. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 57-58
10. ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 68
11. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 6
12. Quoted by S. R. Faruqu "Language, Literature and Translation" in R.S. Gupta (ed) Literary Translation, Creative Books, New Delhi, 1999, p. 58
13. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت (مقدمہ)، ص 11
14. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 7
15. Ketaki Kushari Dyson.Translation: the magical bridge between cultures
16. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 97
17. ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 68-69
18. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 91
19. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص 89
20. ظ۔ انصاری، ترجمے کے بنیادی مسائل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 71
21. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت (مقدمہ)، ص 23

22. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص28

23. http://www.anukriti.net/pgdts/course411/ch1h.html

24. سید احتشام حسین، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ، ص62

25. سید احتشام حسین، ہندوستانی لسانیات کا خاکہ (مقدمہ) ص22

26. وحیدالزماں کیرانوی، القاموس الوحید، ص115

27. Oxford Advanced learner's dictionary, pg 901

28. مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات، ص77

29. https://ur.wikipedia.org/wiki/ادب

30. https://ur.wikipedia.org/wiki/ادب

31. https://ur.wikipedia.org/wiki/ادب

32. محمد رابع حسنی ندوی، غبار کارواں، ص27

33. سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات، ص29۔ (بحوالہ ادبیات مودودی)

34. سید عبداللہ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص9

35. محمد رابع حسنی ندوی، غبار کارواں، ص29

36. محمد حسن عسکری، گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص111

37. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص135

38. پروفیسر محمد حسن، ترجمہ: نوعیت اور مقصد، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص60

39. ترجمہ نگاری اور ابلاغیات، ص:94

40. محمود کاظمی، ادبی تراجم کے مسائل، ص

41. عنوان چشتی، منظوم ترجمے کا عمل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص141

42. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص142

43. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت (مقدمہ) ص27

باب دوم

ترجمے میں مداخلت ایک تعارف

ترجمہ کی ضرورت، اہمیت اور مسلسل روایت کے اجمالی ذکر سے اتنی بات تو بالکل واضح ہو چکی ہے کہ ترجمہ کثیر لسانی دنیا میں انتہائی ناگزیر عمل ہے۔ خیالات، احساسات، ثقافت، زبان، تہذیب، تمدن، علوم وفنون کا تبادلہ اوران سے استفادہ اس سہارے کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔ دنیا کی معلوم تاریخ سے یہ عمل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی ضرورت میں اضافہ ہو رہا ہے، بڑھتی ضرورت سے اس کی اہمیت مزید سے مزید تر ہوتی جارہی ہے۔ موجودہ دور میں ترجمہ مختلف ممالک میں رہنے والے انسانوں کے مابین تعلقات کی استواری کے لیے ایک اہم ذریعہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اگر ترجمہ نہ ہوتو ملکوں اور قوموں کے درمیان روابط انتہائی محدود ہو کر رہ جائیں گے۔

آج کا دور علمی دھماکے کا دور ہے، ایک دھماکے کے ساتھ علم پوری دنیا میں پھوٹ پڑا ہے۔ مجموعی طور پر علم کی سطح ماضی کے مقابلے کہیں زیادہ بلند ہو چکی ہے۔ ہر روز نئی نئی ایجادات سامنے آتی ہیں۔ ایک ایک شعبۂ علم کی کئی کئی شاخیں بن چکی ہیں۔ ایسے حالات میں ترقی پذیر ممالک اور زبانوں کے لیے واحد راستہ ترجمہ ہی ہے۔ جو زبانیں اس میدان میں پیچھے رہ جائیں گی وہ ترقی کے میدان سے بھی باہر ہو جائیں گی۔

''ترجمہ کے بغیر آج کوئی زبان جدید اور ترقی پذیر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔'' 1

اصول فطرت یہی ہے کہ جو چیز جتنی اہم اور ضروری ہوتی ہے اس کی قدر بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کو اسی کے بقدر پذیرائی ملتی ہے۔ اس کام میں مصروف کار افراد کو اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سماج و معاشرے میں ان افراد کو معزز و محترم شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ترجمہ کے ساتھ لوگوں کا رویہ اس اصول کے برعکس ہے۔ اصولاً تو ترجمہ اور ترجمہ نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے، مترجمین کے عمل کو سراہا جانا چاہیے؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔ ترجمہ اور مترجمین ہمیشہ سے عتاب کا شکار رہے ہیں۔ ابتدا میں ترجمہ کو گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ مترجمین کو ''نمک حرام، اور ''غدار'' کے لقب سے نوازا گیا۔ ان کو زندگی کے لالے تک پڑ گئے۔ بہت سے مترجمین کو اس کار عظیم کے عوض زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ سماج و معاشرے کے بائیکاٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا ہوئی لیکن اس کے باوجود ترجمہ کو

وہ مقام اب بھی نہیں مل سکا جس کا وہ حقدار ہے۔ ترجمہ اور مترجمین کے تئیں خیالات کا اندازہ مندرجہ ذیل نظریات سے کیا جاسکتا ہے:

گرانٹ شاورمین کرسپلی کا کہنا ہے:

''ترجمہ کرنا ایک گناہ ہے۔''2

پروفیسر ایلبرٹ گیرارڈ کہتے ہیں:

''ترجمہ، نام ہے ایک سعی نامشکور کا، جس کے صلے میں شدید مشقت کے بعد صرف حقارت ملتی ہے۔''3

ڈاکٹر سیموئیل جانسن نے یکسر عدم امکان کی لکیر ہی کھینچ دی۔ وہ کہتے ہیں:

''شاعری ترجمہ ہو ہی نہیں سکتی۔''4

وکٹر ہیوگو کہتے ہیں:

''ترجمے کی زبان قابل التفات دکھائی نہیں دیتی۔''5

انہیں کا ایک اور قول ہے:

"A translation in verse......seems to me somthing absurd, impossible."6

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ترجمہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ترجمہ کی ضرورت واہمیت کے تحت مذکورہ گفتگو سے واضح ہوتا ہے تو پھر زمانۂ قدیم سے اس کے تئیں اس قسم کے خیالات کیوں پائے جاتے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ اب بھی اس نظریہ میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ یہ سوال دیکھنے میں چاہے آسان لگ رہا ہو لیکن اس کا جواب اس قدر آسان نہیں ہے۔ ترجمہ کے متعلق ان نظریات کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ترجمہ کو تخلیق کے مقابل رکھ کر اس میں وہی تمام خصوصیات ولوازمات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو اصل تخلیق میں پائی جاتی ہیں۔ دانتے نے کہا تھا:

" nothing which is harmonized by the bond of

the Muses can be changed from ist own to another language without desroying all its sweetness"7

یعنی ترجمہ میں اصل متن کی تمام تر شیرینی ختم ہو جاتی ہے۔ گویا کہ دانتے یہ کہنا چاہتا ہے کہ اصل متن میں موجود شیرینی اور خوبصورتی ترجمہ میں بھی اسی طرح برقرار رہنی چاہیے۔ اسی بات کو لیوس جارج ہنری ان الفاظ میں کہتا ہے:

" A translation may be good as translation but it cannot be an adequate reprodction of the orignal"8

لیوس نے تھوڑی رعایت سے کام لیتے ہوئے اتنا تو کہا کہ ترجمہ کی نظر سے وہ عمل بہتر ہو سکتا ہے لیکن اصل کے مساوی نہیں ہو سکتا۔

مشہور نظریہ ساز وارین ایک اچھے ترجمہ کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

" A translation must read like an original"9

بہتر ترجمہ وہ ہے جس کے مطالعہ کے دوران قاری کو یہ نہ محسوس ہو کہ یہ ترجمہ ہے بلکہ اسے یہ احساس پیدا ہو کہ وہ جس متن کا مطالعہ کر رہا ہے وہ اسی (ہدفی) زبان میں لکھا گیا ہے۔

رفیق خاور لکھتے ہیں:

''یہ دونوں (مصنف و مترجم) ایک ہی شاخ پر چہچہانے والے پرندے ہیں، جن کا نغمہ ایک ہے لیکن آہنگ مختلف ہے۔''10

اسی مضمون کو زیادہ واضح انداز میں بیان کرتے ہوئے عابد حسین کہتے ہیں:

''ادبی قدر و قیمت ترجمہ کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب ایک زبان سے دوسری زبان میں مفہوم کے ساتھ وہ آب و رنگ، وہ چاشنی، وہ خوشبو، وہ مزہ بھی آ جائے جو اصل عبارت میں موجود تھا۔''11

بیرو (Berrow) کا ماننا ہے:

''کسی ترجمے کی معراج یہ ہے کہ اس میں اصل کی بازگشت ہو۔'' 12

مولانا صلاح الدین احمد عمدہ ترجمہ کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ عندیہ بھی دیتے ہیں کہ اس میدان میں قابل ولائق افرادِ کار مفقود ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''یوں ترجمہ کرنے کو جیسا آپ چاہیں کر لیں لیکن ایک زبان کے فنکار کی روح کو دوسری زبان میں اس طرح داخل کرنا کہ ترجمے پر تصنیف کا گمان ہو، بہت کم اہل قلم کو ارزانی ہوا ہے۔'' 13

ترجمہ اور تخلیق دونوں میں یکساں مماثلت تلاش کرنا۔ ترجمہ کو تخلیق کے مدمقابل رکھ کر اس کا تعین قدر اور اس کا معیار و میزان مقرر کرنا درست رویہ ہے؟ کیا ترجمہ کی یہی خصوصیت اصل ہے کہ وہ ترجمہ نہ رہے بلکہ ہدفی زبان میں اس کی حیثیت اصل تخلیق کی ہو جائے؟ ہدفی قارئین تخلیق سے جو حظ اٹھاتے ہیں وہی حظ اور لطف انہیں ترجمہ میں میسر ہونا چاہیے؟ ان سوالات کی تہہ میں جائیں تو متعدد مباحث زیر بحث آئیں گے جن میں سب سے اہم اور بنیادی بحث یہ ہوگی کہ جب مترجم اصل زبان کے متن کو ہدفی زبان میں منتقل کرتا ہے تو اس کے پیش نظر کس چیز کی منتقلی ہوتی ہے لفظ کی یا مفہوم کی۔ اس سلسلہ میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ لفظ کو اولیت دیتا ہے اور اسے امانت داری سے تعبیر کرتا ہے، جب کہ دوسرے گروہ کے نزدیک اصل اہمیت مفہوم کو حاصل ہے۔ کیوں کہ عام طور پر یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ لفظ کی رعایت سے عبارت پیچیدہ اور بے معنی بھی ہو سکتی ہے یا کم از کم ہدفی قارئین کے مذاق پر ضرور گراں گزرے گی؛ جس کی واضح مثال شاہ رفیع الدین کا ترجمۂ قرآن ہے۔ جس میں لفظ کی جگہ پر لفظ رکھ دیا گیا تھا۔ خلیق انجم اس ترجمہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ ترجمہ لفظی تھا۔ یعنی قرآن شریف کے ہر لفظ کا اس طرح ترجمہ کیا گیا کہ اردو فقروں کی ساخت بالکل بدل گئی۔ اس ترجمے میں سلاست اور روانی نہ ہونے کی وجہ سے اصل مفہوم سمجھنا مشکل تھا۔'' 14

اس ترجمہ میں اصل متن کی تو بھرپور رعایت برتی گئی لیکن ہدفی زبان کے مزاج، محاورات اور اسلوب کو

یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔اسی بنا پر ترجمہ اصل سے حد درجہ مماثل ہونے کے باوجود عمدہ نہیں شمار کیا گیا۔

جو لوگ مفہوم کے ترجمہ کی وکالت کرتے ہیں ان کا یہ ماننا ہے کہ جس طرح تصنیف کا بنیادی مقصد متن کی تفہیم ہوتا ہے اسی طرح ترجمہ کا مقصد بھی وہی ہونا چاہیے۔مرزا حامد بیگ لفظی ترجمہ کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں ترجمہ کو تخلیق سمجھتا ہوں، مکھی پر مکھی مارنے کو ترجمہ نہیں سمجھتا۔'' 15

مکھی پر مکھی نہیں مارتا یعنی لفظ کے مقابلے صرف لفظ نہیں رکھتا چلا جاتا۔گویا ترجمہ میں لفظ نہیں بلکہ مفہوم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اسی کی ترسیل مقصود ترجمہ ہے۔خلیق انجم لکھتے ہیں:

''........ہم جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کے الفاظ ہمیں عزیز نہیں ہوتے اور نہ ہمیں اس کی لسانی خوبیوں سے کوئی تعلق ہوتا ہے۔ہمیں لفظوں کی شکل وصورت، ان کے تلفظ اور ان کے حسن اور موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ دل چسپی ہوتی ہے تو صرف اس شے سے جو لفظوں کا لباس پہنے لفظوں کے پرے کسی طلسمی راز کے طور پر موجود ہوتی ہے۔'' 16

یہ بات بظاہر تو بہت عمدہ معلوم ہوتی ہے لیکن دو وجوہات کی بنا پر کلی طور پر درست نہیں۔اول یہ کہ کسی بھی تحریر کا منشاء صرف مفہوم کی ترسیل نہیں ہوتا۔علمی تحریروں کے متعلق تو کسی حد تک یہ بات درست ہے لیکن ادبی تحریروں میں لسانی صنعت اور الفاظ کی بازیگری بھی بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔اردو شاعری اس کی ایک عمدہ مثال ہے جس کا ایک بڑا ذخیرہ صرف لفظی صنعت کے خانے کو پر کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ صرف مفہوم منتقل کرنے پر ہی توجہ مرکوز کریں تو ہدفی زبان ترجمہ کی راہ سے اصل زبان سے جو استفادہ کرتی ہے اس کے مواقع مفقود ہو جائیں گے۔چنانچہ محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے آپ سے بار بار یہ سوال پوچھنا پڑتا ہے کہ جن ترجموں سے تخلیقی ادب پر کوئی اثر نہ پڑے، ان کا جواز کیا ہے؟ ترجمے کا تو مقصد ہی یہی ہونا چاہیے کہ خواہ ترجمہ ناکام ہو جائے مگر ادیبوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ذرائع اظہار کے نئے مسائل آئیں۔'' 17

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ مفہوم کو ملحوظ رکھا جائے تو ترجمہ کا حق ادا ہو جائے گا۔ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ ترجمہ میں مفہوم کے ساتھ ساتھ مضمون بھی اسی قدر اہمیت کا حامل ہے۔مضامین کا تعلق بھی زبان سے ہوتا ہے۔ ہر زبان میں کچھ خاص مضامین زیادہ فٹ ہوتے ہیں جو دوسری زبان کے لیے نئے اور اس کے متعین سانچے میں اس قدر چست درست نہیں بیٹھتے۔مثلاً جس زبان کے اندر فلسفیانہ وسائنسی مضامین کا ڈھانچہ مضبوط نہ ہو ایسی زبان کے قارئین کے لیے کچھ بھی کر لیں اس کی پیچیدگی اور اغماض بہر حال برقرار رہے گا۔اکبرالہ آبادی اپنے ایک ترجمہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنف کے سلسلۂ خیالات کو ذرا برہم نہیں ہونے دیا۔فقروں کی ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے۔معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لیے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ رکھ دیے ہیں لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہیں تھا۔''18

مذکورہ بالا اقتباس کا اگر بحیثیت متعلم تجزیہ کیا جائے تو کئی چیزیں قابل غور نظر آتی ہیں جن میں اہم بات یہ کہ جب فقروں کی پیچیدگی دور کی ہے، معانی کو روشن کرنے کے لیے الفاظ کی تعداد میں اضافہ کر دیا تو ترجمہ لفظی کہاں رہا۔ بہر حال ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ تمام کوششوں کے باوجود ترجمہ میں پیچیدگی اپنی جگہ قائم ہے۔ وہ اس لیے کیوں کہ مضمون یا اصل متن ہی پیچیدہ ہے تو ہدفی زبان میں سہل کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

ترجمہ کے نظریات میں مختلف النوع تضادات کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ بذات خود انتہائی پیچیدہ مضمون ہے۔جس کا اندازہ تھیوڈر ساوری کے ترجمہ سے متعلق جمع کردہ اصولوں سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔دراصل اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ کے متعلق اس قسم کے مباحث کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کیا وجوہات اور اسباب وعناصر ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ نگاری ایک پیچیدہ عمل بن جاتی ہے۔ کیوں ایک ہی بات دو زبانوں میں یکساں نہیں رہ پاتی؟ اور کیوں ایک ہی چیز بیان کرنے میں مصنف اور مترجم الگ الگ نظر آتے ہیں؟

اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ تصنیف وترجمہ دونوں کی حیثیت جدا ہے۔ وہ اس طرح کہ تصنیف

میں صرف دو واسطے ہوتے ہیں ایک خیالات جو مصنف کے ذہن میں ابھرتے اور پیدا ہوتے ہیں، دوسرے وہ زبان جس میں مصنف ان خیالات کو منتقل کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مصنف اپنے خیالات اور احساسات کا ترجمہ یا کم از کم ترجمانی براہ راست اپنی زبان میں کرتا۔ یہ بات تقریباً متفق علیہ ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ صد فی صد تحریری زبان میں منتقل نہیں ہوسکتا۔ جہاں تک ترجمہ کا سوال ہے اس میں اگر انتہائی توسع سے کام لیں تب بھی کم از کم ایک واسطہ ہدفی زبان کا اضافہ تو ہو ہی جاتا ہے۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو ترجمہ وسیلہ در وسیلہ بلکہ تسلسل وسائل سے گزر کر ہدفی زبان کے متن میں وجود پذیر ہوتا ہے۔ جس قدر وسائل بڑھتے جائیں گے اصل سے دوری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

اس مقام پر مادری زبان کی اہمیت کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔ ایک ہی زبان میں جب دو ایسے افراد تصنیفی وتحریری عمل انجام دیتے ہیں جن میں ایک کی وہ مادری زبان ہوتی ہے اور دوسرے شخص کی ثانوی۔ ایسے دو افراد کی تحریروں کا موازنہ کیا جائے گا تو اس میں واضح فرق نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر ایک ہندوستانی انگریزی مصنف کی تحریر کا مطالعہ کریں اور اسی موضوع پر ایک انگریز (جس کی مادری زبان انگریزی ہو) کی تحریر کا مطالعہ کریں دونوں تحریریں کسی قدر مختلف ہوں گی۔ ہندوستانی مصنف اپنی تحریر میں جو تشبیہات، استعارات، تمثیلات، محاورے، کہاوتیں استعمال کرے گا اس سے ممکنہ طور پر ہندوستانیت ظاہر ہوگی۔ اس کا اسلوب بہر صورت مختلف ہوگا۔ بہت سے ایسے مصنفین بھی ہوسکتے ہیں جن کی ثانوی زبان انتہائی معیاری بلکہ مادری زبان بولنے والوں سے بھی اچھی اور شستہ ہوگی لیکن ان تمام خوبیوں سے آراستہ ہونے کے باوجود ان میں مادری زبان کی باریکی ولطافت کلی طور پر نہیں سماسکتی۔ ایک شخص جس کی ابتدائی نشو ونما کسی خاص خطے میں ہوئی اور بعد میں وہ دوسرے علاقے میں بس گیا، وہاں کئی سال گزارنے کے بعد بھی اس کی زبان میں وہ بات نہیں آپاتی جو مادری زبان بولنے والوں میں ہوتی ہے۔ زبان کی بات تو دور کی ہے لہجے پر کنٹرول نہیں ہو پاتا۔ مثال کے طور پر ایک شخص لکھنو کا رہنے والا ہو اپنی عمر کے چند سال گزارنے کے بعد حیدرآباد میں آکر آباد ہوجائے اور یہاں کے رنگ میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ یہاں کے لہجے کو اپنانے کی کوشش کرے۔ سالوں کی مشق ومزاولت کے بعد بھی اس کے اندر یہ کمی برقرار رہے گی۔ اہل حیدر

آبادگرفت کرلیں گے کہ یہ شخص یہاں کانہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ ایسے محاورے اورالفاظ ہوتے ہیں جس سے اسی خاص خطے کے لوگ ہی واقف ہوتے ہیں۔ یہی مثال ہر جگہ اور ہر زبان کے تعلق سے دی جاسکتی ہے۔

جب ایک ہی زبان میں اپنی کاوش پیش کرنے والے دوافراد جن کی مادری زبان الگ الگ ہے یکساں نہیں ہوسکتے تو مترجم اور مصنف یکساں کیسے ہوسکتے ہیں کہ جن کی زبان ہی الگ الگ ہے۔ دونوں کے درمیان معمولی سا فرق ہے۔ پہلا شخص مادری زبان میں سوچتا ہے اور مادری زبان میں اسے پیش کرتا ہے اور مترجم ثانوی زبان میں سوچتا، پڑھتا ہے اور (عموماً) مادری زبان میں ادا کرتا ہے۔

Bassnett McGurice کہتا ہے:

> " Equivalence in translation should not be approached as a search for sameness, since sameness cannot even exist between two TL versions of the same text, let alone the SL and Tl version."19

ڈاکٹر قمر رئیس بھی اسی نظریہ کے حامی نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''عام طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ترجمہ اصل تصنیف کا نعم البدل نہیں بن سکتا۔ نہایت کامیاب اور دلکش ہونے کے باوصف ترجمہ ترجمہ ہی رہے گا اور اس کی گنجائش رہے گی کہ اس کے بعد کا ترجمہ اس سے بہتر ہو۔یعنی تکمیل فن کی جو خوبی اصل میں ہے وہ ترجمہ کو حاصل نہیں ہوسکتی۔''20

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ترجمہ منتقلی کا عمل ہے نہ کہ نقل کا اور کسی چیز کو دوسری جگہ یا چیز میں منتقل کرنے میں کمی بیشی کا ہونا لازمی ہے خصوصاً اس صورت میں جب کہ وہ شئے یا مقام اس کیفیت سے مختلف ہو جس سے منتقل کیا جارہا ہے جیسے ترجمہ میں زبان اور فرد کی تبدیلی۔

لفظ مداخلت کی لغوی تحقیق

نظریہ مداخلت اپنے واضح تصور کے ساتھ سب سے پہلے انگریزی اور مغربی زبانوں میں سامنے آیا جس کے لیےIntervention کی اصطلاح رائج ہے۔اردو میں اس کا متبادل لفظ 'مداخلت' استعمال کیا جاتا ہے جس کی اصل عربی مصدر داخل مداخلة ہے۔

انگریزی لفظInterventionمصدر ہے جو Interveneسے ماخوذ ہے۔ The Oxford English Dictionaryمیں اس کا معنی ہے:

to come in as something extraneous in the course of some action, state of thing.21

کسی کام یا کسی چیز کی کیفیت میں خارجی عنصر کی طرح داخل ہونا

اس کا ایک دوسرا معنی ہے

to come in or between so as to affect, modify or prevent a result, action, etc.22

کسی عمل ،نتیجہ کو روکنے یا اس پر اثر انداز ہونے اس کی تصحیح کے لیے درمیان میں شامل ہونا۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کے معنی ہیں:

to become involve in a situation in order to improve or help it.23

(کسی کیفیت میں اس کو فروغ دینے یا اس میں معاونت کے لیے شرکت کرنا)

اس کے علاوہ تین معنی اور دیے گئے ہیں،ان سب میں ایک مفہوم مشترک یہ ہے کہ کسی شئے یا کام کے درمیان میں داخل ہونا یا شامل ہونا۔

انگریزی۔اردو لغات میں اس کے مندرجہ ذیل معنی بیان کیے گئے ہیں:

Intervene: بیچ میں آنا،حائل ہونا،درمیان میں واقع ہونا،بیچ میں پڑنا

Intervention: حائل ہونا، بیچ بچاؤ کرنا، مداخلت، درمیان میں واقع ہونا 24

قومی انگریزی۔اردولغت میں اس کے معنی ہیں:

Intervene: درمیان میں آنا، کوئی ایسا اتفاقی واقعہ ہونا جس سے نتیجہ بدل جائے، فریقین کی ملاقات میں دخل اندازی کر کے اختلافات دور کرنا یا کسی فریق کی مدد کرنا، دخل دینا، خلل ڈالنا۔

Intervention: وسیلہ، مداخلت توسط، دخل اندازی کرنا۔25ے

مشہور عربی۔انگریزی لغت المورد الحدیث میں Intervene کا معنی

یتخلل، یقع بین فترتین، یطرا، یعترض، یحدث بحیث یغیر نتیجة او یوثر فیها، یتدخل (لتسویة نزاع)26ے

اردولغات میں لفظ 'مداخلت' کے معنی ہیں:

دخل اندازی، دست درازی، مزاحمت، تعرض، قبضہ، قابو، تصرف۔ 27ے

اسی طرح فرہنگ آصفیہ میں:

مداخلت کرنا: دخل دینا، دست اندازی کرنا، بیچ میں بولنا۔ 28ے

عربی زبان کی مشہور لغت 'منجد' میں مداخلت کے معنی ہیں:

داخلہ مداخلة فی امورہ: دخل اندازی کرنا۔29ے

لغوی تحقیق کا جائزہ

ان تمام لغات میں مذکور معانی کا اگر جائزہ لیا جائے تو ان معانی کو تین اجزا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔اول انگریزی لغت کے معنی، دوم انگریزی۔اردو یا انگریزی۔عربی لغت میں درج معنی، سوم اردو یا عربی لغت کے معنی۔ان تمام لغات میں اس لفظ کے تمام مترادفات میں ایک بنیادی مشترک معنی شمولیت کا پایا جاتا ہے۔ البتہ ثانوی معنوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ جو شمولیت یا دخول ہو رہا ہے وہ کسی نوعیت کا ہے۔اس سلسلہ میں اردو کی یک لسانی لغت کے علاوہ مندرجہ ذیل تمام لغات خواہ وہ یک لسانی ہوں یا ذولسانی تقریباً

سبھی کے اندر مثبت شمولیت کا اشارہ ملتا ہے جیسے The Oxford Englich Dictionary میں کسی عمل، نتیجہ کو روکنے یا اس پر اثر انداز ہونے اس کی تصحیح کے لیے درمیان میں شامل ہونا،اسی طرح Oxford Dictionary میں فروغ دینے یا معاونت کے لیے شرکت کا مفہوم شامل ہے۔قومی انگریزی لغت میں فریقین کے درمیان اختلافات کو دور کرنے کے واسطے دخل اندازی کی بات کہی گئی ہے۔ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں بیچ بچاؤ کا لفظ موجود ہے۔المورد الحدیث میں واضح انداز میں لکھا گیا ہے کہ اس انداز میں وقوع پذیر ہونا جس سے نتیجہ میں تبدیلی واقع ہو یا اس سے نتیجہ پر اثر پڑتا ہو۔خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کسی چیز، حالت یا کیفیت میں اس طرح شامل ہونا یا داخل ہونا جس سے اس چیز، حالت، کیفیت میں کسی خاص قسم کی تبدیلی واقع ہو جائے خواہ اس کا نتیجہ ہی بدل جائے یا صرف اس پر کوئی خاص اثر ثبت ہو۔قومی انگریزی لغت میں توسط اور وسیلہ کا معنی بھی دیا ہوا ہے جس سے مفہوم اور واضح انداز میں سامنے آتا ہے کیوں کہ مداخلت ایک وسیلہ ہی ہے جس کے توسط سے اصل متن کے مواد کو ہدفی زبان میں مزید بہتر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

البتہ اردو کی یک لسانی لغت میں اس قدر وضاحت کے ساتھ یہ مفہوم نہیں ہے بلکہ اس میں کسی قدر منفی رجحان ظاہر ہوتا ہے مثلاً دست درازی کرنا، مزاحمت کرنا وغیرہ اور اسی طرح اردو میں جو مرکب الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی ترکیب میں منفیت جھلکتی ہے۔کیوں کہ اردو میں ''مداخلت بلا مرضی، مداخلت بے جا'' جیسے الفاظ رائج ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں عام طور پر اس لفظ سے متعلق منفی میلان ہی پایا جاتا ہے لیکن صرف منفی رجحان ہی ہو ایسا بھی نہیں ہے کیوں کہ ان تمام معانی اور مرکب ترکیبوں کے ساتھ ساتھ 'بیچ میں بولنا اور تصرف' جیسے معانی بھی شامل ہیں۔مزید یہ کہ اگرچہ اردو زبان کا حصہ ہونے کے بعد اس لفظ کے اپنے معنی متعین ہو گئے مگر ان سب کے باوجود اس کی اصل عربی ہی ہے اور عربی میں جو معانی ہیں وہ اوپر مذکور ہیں جن میں واضح طور پر اثبات جھلکتا ہے، لہٰذا اصل کا اعتبار کرتے ہوئے اور خود اردو معنی میں موجود امکانی اثبات کے پیش نظر اس کو مثبت قرار دینے میں کوئی تعجب، حیرت اور تردد نہیں ہونا چاہئے۔

جب اتنی بات اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ مداخلت کا معنی اور مداخلت کا معنوی رجحان کیا ہے تو اب ہم مداخلت کے اصطلاحی مفہوم پر گفتگو کریں نیز معنوی و اصطلاحی مفہوم پر انطباق کی کوشش ہو گی۔

مداخلت کی اصطلاحی تحقیق:

ترجمہ انتہائی مشکل کام ہے۔شہباز حسین نے اسے نگینہ جڑنے سے تشبیہ دی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ بڑا مشکل کام ہے۔ یہ نگینہ جڑنے کا فن ہے جو بڑی مہارت اور ریاضت چاہتا ہے۔''30

جس طرح تراش خراش سے قبل نگینہ کی حیثیت ایک عام اور معمولی پتھر کی ہوتی ہے خواہ ماہرین کی نظر میں اس کی کتنی ہی قیمت ہو۔اسے کتنا بھی نادر و نایاب اور بیش قیمت بتایا جائے کوئی اسے خریدنے کی ہمت نہیں کرے گا۔اسی طرح اصل زبان کا متن ایسے لوگوں کے لیے جو اس زبان سے واقف نہیں ہیں بے وقعت، بے معنی اور ناقابل استفادہ ہوتا ہے۔خواہ اس کے اندرون میں علوم و معارف کے کتنے ہی نکتے بیان کئے گئے ہوں ۔ہیرا تراشنا انتہائی نازک اور باریک و دقیق کام ہے۔ ہر کس و ناکس کے ہاتھوں یہ کام نہیں سونپا جا سکتا کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے نگینہ محض ایک بے قیمت پتھر بن کر رہ جائے اور تمام محنت اکارت چلی جائے۔یہی وجہ ہے کہ اس کام کے لیے ماہرین کی خدمت لی جاتی ہے جو بڑی عرق ریزی اور محنت کے ساتھ یہ کام انجام دیتے ہیں؛ اس کے باوجود حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ کامیاب ہی ہوں گے، ناکامیابی کا اندیشہ برابر قائم رہتا ہے لیکن اس کے باوجود تراش خراش کا عمل بھی جاری رکھا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر ایک پتھر ہیرا نہیں بن سکتا۔اسی طرح ترجمہ بھی عموماً اہل لوگ (گو کہ اہلیت کا معیار انتہائی مختلف فیہ ہے) ہی کرتے ہیں۔مترجم کتنا ہی ماہر ہو اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا ہے وہ ترجمہ کا حق ادا ہی کرے گا ۔ترجمہ ناکام ہو جانے کے اندیشہ کے باوجود ترجمہ کا عمل جاری رکھا جاتا ہے۔مترجم اپنی طرف سے بھرپور کوشش کرتا ہے کہ وہ اس میدان سے سرخرو نکلے۔کامیابی اور ہدفی زبان و قارئین کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے وہ نگینہ ساز کی مانند مختلف راستے اختیار کرتا ہے۔مترجم کی تراش خراش ہی دراصل 'مداخلت' ہے۔

مداخلت کی تعریف کرتے ہوئے وینوٹی لکھتا ہے:

> The term intervention is used here to refer to translation decisions made deliberately "on

the basis of textual effects, cultural values, social functions that translations possess in target situations"31

(مداخلت کی اصطلاح سے مراد ہے ترجمہ کے وہ انتخابات جو ''ان متنی تاثرات، ثقافتی اقدار، سماجی افعال کی بنیاد پر دانستہ طور پر کئے جاتے ہیں جو ترجموں کو ہدفی صورت حال میں لاحق ہوتے ہیں)

یہ بات معلوم ہے کہ ترجمہ مسلسل متبادلات کا عمل ہے۔ دوران ترجمہ مترجم کو ہر لمحہ مختلف فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ وینوٹی کی مذکورہ بالا تعریف میں انتخابات میں تین انتہائی اہم باتیں ذکر کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ انتخابات ''متنی تاثرات، ثقافتی اقدار اور سماجی افعال'' کی بنیادی پر کئے جاتے ہیں، دوسرے یہ کہ یہ عمل ''دانستہ'' ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ اعتبار ہدفی زبان کو لاحق ہونے والی متنی تاثرات، سماجی وثقافی اقدار کا ہوگا۔

وینوٹی کی عائد کردہ پہلی شرط ''دانستہ'' کی قید سے بالکلیہ اتفاق کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ ترجمہ کے دوران جو کچھ فیصلے ہوتے ہیں ضروری نہیں ہے کہ وہ سب دانستہ طور پر باضابطہ کئے جائیں بلکہ بہت سے ایسے انتخابات ہوتے ہیں جو مترجم غیر دانستہ طور پر کردتا ہے۔ مصنف کی طرح مترجم بھی اپنے گرد وپیش، ماحول، مزاج، تہذیب وتمدن کا پروردہ ہوتا ہے۔ اس کی اپنی فکر واحساس بھی اس کے ساتھ کارکرد رہتا ہے۔ جن کی بنا پر وہ بہت سارے فیصلے ایسے کرتا ہے جس کا خود اس کو احساس نہیں رہتا۔ یہی فیصلے مترجم کو مخصوص شناخت اور اس کے ترجمہ کو علیحدہ آہنگ عطا کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ ترجمہ دوسرے ترجموں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس سلسلہ کی مزید گفتگو مداخلت کی اقسام میں آگے آئے گی۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ مترجم ترجمہ کے دوران اپنے فیصلوں میں جن چیزوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ ان میں ''متنی تاثرات، ثقافتی اقدار اور سماجی افعال'' کو بنیاد بناتا ہے۔ تینوں الفاظ کی الگ الگ مختصراً تشریح وتوضیح کی کوشش کی جائے گی۔

''متنی تاثرات'': ہر متن، ہر تحریر کا اپنا ایک خاص مزاج اور آہنگ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص ایک تحریر

پڑھتا ہے تو اس کے اور پر خاص قسم کا تاثر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ جس کی کیفیت یک گونہ وجدان کی ہوتی ہے اور جس کا زیادہ تر تعلق احساس سے ہوتا ہے۔ مصنف کی تحریر میں یہ کیفیت اس کے الفاظ کے انتخاب، جملوں کی ترکیب، بندش اور چستی، معنی آفرینی اور تہہ داری و دیگر اسباب و عوامل سے پیدا ہوتی جیسے تشبیہات واستعارات وغیرہ کا استعمال۔ مترجم جب ترجمہ کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ جو تاثر اصل زبان کے قاری پر متن پڑھنے کے بعد ہوا وہی تاثر ہدفی قاری بھی پر قائم ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ مختلف راستے وطریقے اختیار کرتا ہے۔

''ثقافتی اقدار'': دنیا میں بے شمار زبانیں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی ہیں جو اپنی امتیازی شناخت کے باعث دوسروں سے ممتاز ہیں۔ ہر زبان کی لسانی خصوصیات الگ الگ ہیں۔ ان کے استعارے، تشبیہات، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال، طرز تحریر، رسم الخط، قواعد اور علامیے (Code) جداگانہ ہوتے ہیں۔ ہر زبان خاص علاقے، ماحول، مزاج اور کیفیت میں پروان چڑھتی ہے۔ خاص تہذیبی رنگ وآہنگ میں اس کی نشو نما ہوتی ہے۔ مشہور مغربی ماہر لسانیات نام چامسکی کہتا ہے:

''زبان دراصل تہذیب سے مختص ہے۔'' 32

زبان وتہذیب کا کافی مضبوط و گہرا رشتہ ہی نہیں ہے بلکہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر علاقے کی مخصوص تہذیب اس کے رہن سہن، طرز معاشرت، اخلاقیات، رسم ورواج کا واضح اثر وہاں رائج زبان پر نظر آتا ہے۔ علاقائی قربت سے تہذیبوں کی قدریں مشترک ہوتی ہیں اور بُعد میں اضافہ سے قدروں میں اشتراک کم اور زبانوں کے درمیان اجنبیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ:

> ''جب دو افراد کے درمیان علامیے مشترک ہوں تو مشکل نہیں ہوتی؛ بلکہ یوں کہئے کہ ہوتی ہے، مگر بہت کم، اتنی نہیں ہوتی کہ بات سمجھ میں نہ آئے۔ اصل مشکل تب پیدا ہوتی ہے جب گفتگو کرنے والوں کے درمیان علامیہ مشترک نہیں ہوتا۔۔۔ایسی صورت میں اجنبی زبان کے علامیوں کو سیکھنا اور ان اجنبی علامیوں کو اپنے مانوس علامیوں میں منتقل کرنا پڑتا ہے۔'' 33

ترجمہ درحقیقت انہیں علامیوں کی منتقلی اور رمز کشائی کا نام ہے اور منتقلی متقاضی ہے حذف واضافہ کی۔ جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''علامیوں کے اس طرح منتقل کرنے میں ان کے معنی کا کتنا حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔ مثالی صورت یہ ہے کہ کچھ بھی ضائع نہ ہو۔۔۔۔۔۔۔لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے بھی اور کمیت کے اعتبار سے بھی۔'' 34

کس قدر ضیاع ہوتا ہے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن مسلمہ امر یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسرے زبان میں ترجمہ کے دوران بہت کچھ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ندا نے لکھا ہے کہ:

To understand clearly the manner in which such "distoration" take place we must examine the ethnolinguistic design of communication" 35

یعنی نسلی، لسانی نظام ترسیل میں تفاوت کے باعث دوران ترجمہ متبادل لانے میں پریشانیاں اور مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فن پارہ مخصوص صفات سے متصف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''اس میں دو رائیں نہیں کہ ہر تخلیقی فن پارہ میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو دوسری زبان (خاص طور پر ایک مختلف تہذیبی ماحول کی پروردہ زبان) میں بجنسہٖ منتقل نہیں کئے جا سکتے۔'' 36

مترجم اصل زبان کے متن میں موجود ثقافتی اقدار اور ہدفی زبان اور ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول دونوں کو مدنظر رکھتا ہے اور دونوں میں ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی زبان میں اس کے متبادلات لانے کی جدوجہد میں اسے اصل متن سے انحراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

''سماجی افعال'': ہر سماج دوسرے سماج سے ممتاز و جدا ہوتا ہے۔ اس کے طور وطریق رسم ورواج علاحدہ ہوتے ہیں۔ انداز فکر الگ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ایسی صفات ہیں جن کی وجہ سے ہر سماج علاحدہ

شناخت کا حامل ہوتا ہے۔سماج کی تشکیل میں عام طور پر ثقافت کا ہی ہاتھ ہوتا ہے؛ بلکہ یوں کہیے کہ سماج و ثقافت میں گہرا تعلق ہے۔ایک قابل غور بات یہ ہے کہ وینوٹی نے ''اقدار'' کی قید لگائی تھی یہی وہ قید ہے جو دونوں کو ممتاز بناتی ہے؛ کیوں کہ بہت سے ایسے افعال واعمال ہوتے ہیں جو سماج کا حصہ بن جاتے ہیں، اس میں رچ بس جاتے ہیں، لوگ ان کو سماج کا حصہ سمجھ کر انجام دینے لگتے ہیں لیکن وہ اس معاشرے اور اس قوم کے ثقافتی ''اقدار'' سے ہم آہنگ ہوں ضروری نہیں ہوتا۔مترجم چوں کہ اسی سماج کا پروردہ ہوتا ہے اور اسے اپنی کاوش بھی اسی سماج کے سامنے پیش کرنی ہوتی ہیں اور وہی سماج اس کا ہدفی قاری بھی ہوتا ہے۔اس لیے اس کو اس کی رعایت کرتے ہوئے اصل متن سے ہدفی متن کی تشکیل کے دوران کچھ اعمال انجام دینے پڑتے ہیں۔

وینوٹی نے تیسری بات یہ کہی تھی کہ جو''ہدفی زبان کو لاحق'' ہوتے ہیں۔یعنی مترجم جب ترجمہ کے دوران مختلف وجوہات کے پیش نظر فیصلے کرتا ہے تو اس کے پیش نظر ہدفی صورت حال ہوتی ہے۔اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ متن کو ہدفی صورت حال سے ہم آہنگ کرے تاکہ ہدفی حالات میں ترجمہ غیریت کا احساس نہ پیدا کرے۔

وینوٹی نے صرف تین چیزوں کا ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ اور بھی کئی ایسے میدان ہیں جن کا مترجم کو ترجمے کے فیصلے کے دوران سامنا کرنا ہوتا ہے۔جس طرح مذکورہ بالا تینوں چیزیں اہم ہیں اسی طرح اور بھی مقامات ہیں جن سے مترجم کو محاذ آرائی کرنی ہوتی ہے جس کی ہلکی سی وضاحت کرتے ہوئے برین موساپ لکھتا ہے:

> As a translator, I cnanot write in no style,......I
>
> must intervene, more or less consciously,
>
> selecting one wording rather than other." 37

مذکورہ بالا اقتباس میں دو باتیں پیش کی گئی ہیں، ایک اسلوب کا وجود اور دوسرے الفاظ کا انتخاب؛ لیکن اس کے علاوہ بہت سے عوامل وعناصر مداخلت کا سبب بنتے ہیں۔جس طرح کسی تحریر میں مختلف عوامل کی کارفرمائی ہوتی ہے اسی طرح ترجمہ میں بھی مختلف عوامل کارفرما ہوتے ہیں؛ کیوں کہ مترجم کو تو خیالات کی منتقلی کے لیے دوطرفہ جنگ کرنی ہوتی ہے، اولاً تو خود خیالات ہی اس کے اپنے نہیں ہوتے دوسرے زبان کی تبدیلی

مزید بہت ساری مشکلات پیدا کر دیتی ہے۔علاوہ ازیں مترجم دو الگ الگ زبان کی تہذیبوں سے نبرد آزما ہوتا ہے:

> ’’اس کے سامنے دو تہذیبیں کھڑی ہوتی ہیں اور اس کو پورے ثقافتی پس منظر کو اپنی زبان میں سمونا پڑتا ہے کیوں کہ ہر زبان کا اپنا جغرافیائی، ثقافتی اور سماجی ماحول ہوتا ہے۔اس لیے مترجم جب مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرتا ہے تو اس زبان کا پس منظر اور ماحول اور اپنی زبان کی مبادیات اور تقاضوں کو بھی سامنے رکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔‘‘38

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا ترجمہ نہیں ہوگا جس کے متعلق یہ دعوی کیا جا سکتا ہو کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔چینی نظریہ ساز لیو یا منگ کہتا ہے:

> "translation always intervense" 39

جسف ورشیرن لکھتا ہے:

> "every translator or interpreter inevitably
> intervenes when translating or interpreting"40

ملٹک مارکو کا کہنا ہے:

> "Translator's intervention is an inevitable part
> of translation."41

اتنی بات تو مسلم اور متفق علیہ ہے کہ ترجمہ میں مداخلت کی حیثیت ایک لازمی عنصر کی ہے۔تمام ماہرین فن ترجمہ نگاری اور عملی ترجمہ سے وابستہ افراد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔مجبور بایں معنی کہ چاہے اس عمل کو وہ خیانت سے سمجھتے ہوں یا ضرورت بہر حال تردید کی کوئی صورت موجود نہیں ہے۔یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب ایک زبان کا متن دوسری زبان میں منتقلی کے بعد ترجمہ شدہ متن میں تشکیل پاتا ہے تو اصل متن اور ترجمہ شدہ متن دونوں ایک دوسرے سے مختلف محاذوں پر مختلف ہو جاتے ہیں۔اس سے نہ انکار ممکن ہے نہ احتراز اور نہ ہی اس کے بغیر ترجمہ کا وجود۔

ترجمہ دو اجنبی زبان بولنے والے افراد کے درمیان انجام پانے والی سرگرمی ہے جو علامیوں کی منتقلی سے انجام پاتی ہے۔ دوران منتقلی ایک مترجم کو بے انتہا دشواریوں اور مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے مسائل کو حل کرنا ہوتا ہے۔ کچھ مسائل قابل حل ہوتے ہیں اور کچھ لاینحل ہی رہ جاتے ہیں۔ جس سے دوسری زبان میں علامیہ کی رمز کشائی اصل زبان کے علامیہ سے مختلف ہو جاتی یا ہم آہنگ نہیں رہ پاتی ۔ عدم یکسانیت کا نہ پایا جانا ایک مسلمہ اصول ہے؛ لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ تبدیلی وتغیر کا یہ عمل کیوں، کب ، کیسے، کہاں، کس سے اور کس قدر صادر ہوتا ہے۔ یہ اور اس قسم کے مختلف سوالات کے جوابات کے لیے اس وقت جو اصطلاح رائج ہے وہ ہے ''مداخلت''۔

مداخلت کی لغوی واصطلاحی تحقیق میں مطابقت

مداخلت کی لغوی تحقیق سے بنیادی طور پر دو معنی سامنے آتے ہیں ایک عمومی شمولیت، دوسرے اصلاح و تبدیلی کے لیے مداخلت ۔ مداخلت کی اصطلاحی تحقیق سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ جب ترجمہ کا عمل انجام دیا جاتا ہے تو اس میں لسانی، تہذیبی، ثقافتی اور سماجی عناصر کی شمولیت کی بنا پر تغیر وتبدل ناگزیر ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ مداخلت کچھ خاص مقاصد کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے ۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو دونوں معنوں کے اعتبار سے لفظی واصطلاحی دونوں معنوں میں کلی مطابقت پائی جاتی ہے۔ یعنی شمولیت تو ہوتی ہے اور شمولیت کے باعث تغیر وتبدل واقع ہوتا ہے اور تغیر وتبدل کے پیچھے خاص مقصد بھی کارفرما ہوسکتا ہے۔

معنوی تحقیق میں منفی اور مثبت رجحان کا جو پہلو سامنے آیا ہے اس کو مدنظر رکھ کر گفتگو کریں تو ترجمہ میں یہ دونوں رجحان کارفرما نظر آتے ہیں۔ اگر ترجمہ میں جو تبدیلی یا اثر اندازی ہو رہی وہ اس لیے ہے کہ متن کی مزید اصلاح ہو جائے اور اس کو وقوفی ماحول سے ہم آہنگ کر دیا جائے تو اس صورت میں یہ مداخلت مثبت شمار کی جائے گی لیکن اگر اس کے برخلاف تبدیلی یا مداخلت متن کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے لیے کی جائے تو اس میں منفی پہلو پیدا ہو جائیں گے۔

مداخلت کی اقسام

مداخلت کی دو اقسام ہیں: شعوری اور غیر شعوری۔ مدن۔ ایم۔ شرما لکھتے ہیں:

"the very process of translation involves some kind of conscious or unconscious intervention on the part of the translator."42

عمل ترجمہ کے دوران مترجم کی جانب سے چند قسم کی شعوری اور غیر شعوری مداخلتیں ہوتی ہیں۔ ترجمہ میں جہاں بھی مداخلت ہوتی ہے خواہ اس کے اسباب وعوامل جو بھی ہوں اور مداخلت کی حیثیت جو بھی ہو وہ یا تو غیر شعوری ہوگی یعنی مترجم کی دانستہ کوشش یا فیصلہ کا نتیجہ نہیں ہوگی یا شعوری ہوگی۔ شعوری مداخلت سے مراد مترجم کی جانب سے دانستہ طور پر کی جانے والی مداخلت۔

غیر شعوری مداخلت

اس بات کا پہلے ہی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ترجمہ درحقیقت مسلسل تلاش متبادلات کا عمل ہے۔ مترجم ہر لمحہ اصل زبان کے بالمقابل ہدفی زبان کے متبادل کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں بہت سے مقامات پر ایسی تبدیلی یا تغیر پیش آجاتا ہے جس میں قصد وارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کے پس پردہ کسی قسم کی منصوبہ بندی یا پالیسی کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح کی تبدیلی یا مداخلت میں سب سے اہم کردار مترجم کی ذات ادا کرتی ہے؛ کیوں کہ مترجم ہی عمل ترجمہ کی انجام دہی کرتا ہے۔ ہر مصنف کا اپنا خاص مزاج، لیاقت، استعداد، نقطۂ نظر اور عقیدہ ہوتا ہے، مخصوص ماحول اور تہذیب وثقافت میں اس کی نشو ونما ہوتی ہے۔ ایک خاص سماجی افعال کے اثرات اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس کو اسی ماحول اور رنگ میں اظہار فن کرنا ہوتا ہے، وہ جس زبان کو ذریعہ ترسیل بناتا ہے اس کا اپنا خاص رچاؤ ہوتا ہے۔ اس کی ساختیات وشعریات دوسری زبانوں سے مختلف ہوتی ہیں جس کی باریکیاں مصنف کے ذہن ودماغ میں گھر کی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے اسلوب وطرز تحریر سب پر اس کی جھلک ہوتی ہے۔ مصنف جو کچھ تخلیق کرتا ہے وہ اسی ماحول میں تخلیق کرتا ہے۔ مصنف کے ساتھ جڑی یہ تمام خصوصیات مترجم کے ساتھ بھی وابستہ ہوتی ہیں۔ لسانی، تہذیبی، معاشرتی،

ثقافتی اثرات اس پر بھی مصنف کی ہی طرح طاری ہوتے ہیں؛ لیکن اس کے سامنے یہ دشواری ہوتی ہے اسے اپنے اس خاص رنگ اور ذہنی ساخت سے ہٹ کر کسی غیر تہذیب کے پروردہ کی روح کو اپنی ذات پر طاری کرنا ہوتا ہے جو ناممکن تو نہیں البتہ انتہائی دشوار ضرور ہے اور بے انتہا کوششوں کے باوجود بھی اپنے رنگ و آہنگ سے بالکلیہ انقطاع ممکن نہیں۔ مترجم کے لیے انتہائی مشکل ہے کہ وہ اپنے وجود کو کلی طور پر اس طرح منہا کر دے یا اپنی ساخت و پرداخت کے تمام اثرات سے خود کو اس طرح پاک صاف یا بے نیاز کر لے کہ عمل ترجمہ میں اس کی جھلک بھی باقی نہ رہے۔ خواہ مترجم اپنی ذات کو کتنا ہی منصف مزاج قرار دے یا کتنا ہی غیر جانب داری کا دعوے دار ہو؛ کیوں کہ یہ چیزیں کسی بھی فرد کے ساتھ اس طرح پیوست ہوتی ہیں جیسے مقناطیس کے ساتھ قوت کشش؛ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی پیراگراف کا ترجمہ یکساں صلاحیت و تجربہ کے کئی افراد کرتے ہیں تو ان کے ترجموں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک جملہ ہے "He is no more" اس کے دسیوں متبادلات ہو سکتے ہیں جیسے مر گئے، انتقال کر گئے، انتقال فرما گئے، وفات پا گئے، اس دنیا میں نہیں رہے، دنیا سے کوچ کر گئے، دار فانی کو کوچ کر گئے، رحلت فرما گئے، مالک حقیقی سے جا ملے، آخرت کو سدھارے وغیرہ اسی ایک جملے پر غور کریں تو دو چیزیں نکل کر سامنے آتی ہے، اول یہ کہ انگریزی جملہ میں He واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اس کا لفظی اور درست ترجمہ ''گیا''، ''ملا''، ''سدھارا'' ہوسکتا ہے، لیکن اگر مترجم اس کے بجائے ''گئے''، ''ملے''، ''سدھارے'' استعمال کرے تو اس کی پہلی وجہ تو سیاق ہوگی یعنی کس شخص کے متعلق بات ہو رہی ہے، کوئی عام آدمی ہے یا کوئی خاص شخصیت۔ دوسری چیز یہ کہ بغرض احترام ''ملا'' کے بجائے ''ملے'' کا تصور مترجم کی صوابدید پر منحصر ہے جو اس کی ذاتی تربیت اور ترجیحات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ فرق مترجم کی اندرونی وفطری ساخت کی بنا پر ہوتا ہے۔ ایک شخص کسی کے لیے ''گیا'' ہوسکتا ہے اور دوسرے کے لیے ''گئے''۔ مترجم اس سلسلہ میں معذور ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ اس قسم کے الفاظ کا انتخاب کسی خاص پالیسی کے تحت عموماً نہیں کرتا۔

اسی طرح القاب وغیرہ کے استعمال کا مسئلہ ہے۔ اولاً تو اس میں لسانی مزاج کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے دوسرے تہذیبی سانچے کا بھی فرق ہوتا ہے مثلاً اردو میں القاب و آداب کے بے شمار الفاظ استعمال کیے جاتے

ہیں جو انگریزی زبان کے مزاج کا حصہ نہیں ہیں۔ اگر ترجمہ میں کسی ایسی شخصیت کا ذکر ہے جس سے مترجم واقف نہیں ہے یا ہے تو اس کے نزدیک اسے وہ وقار واہمیت حاصل نہیں ہے، اس کے لیے آداب کے تقاضے ملحوظ نہیں رکھے گا بلکہ یوں کہیں کہ اس کو اس جانب توجہ ہی نہیں ہوگی۔ مثلاً ماہرین ترجمہ نگاری مونا بیکر، جرمی منڈے، وینوٹی وغیرہ کا نام آتا ہے تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ''مونا بیکر کہتی ہے'' اور اسی کے بعد اگلی سطر میں کسی اردو ماہر ترجمہ کا نام ہے خواہ وہ اس میدان میں مذکورہ شخصیات سے کہیں کم تر ہو تو بھی ہم اس کے ساتھ ''فلاں کہتے ہیں، رقم طراز ہیں، لکھتے ہیں'' استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی چیزوں میں توقیر یا تذلیل کا منشا نہیں ہوتا بلکہ سراسر ذہنی پرداخت اور ''روحانی سکون'' کا مسئلہ ہوتا ہے۔

اسی طرح جملوں میں الفاظ کے استعمال وغیرہ میں بھی مترجم انتخاب سے کام لیتا ہے۔ انتخاب کبھی شعوری بھی ہوتا ہے اور کبھی غیر شعوری بھی۔ نیز اس کا دارومدار بہت کچھ متن کی نوعیت پر بھی منحصر ہوتا ہے۔ کوئی مترجم Blind کے لیے لفظ ''اندھا'' استعمال کرتا ہے اور دوسرا ''نابینا'' استعمال کرتا ہے۔ الفاظ کی بندش اور جملوں کی چستی میں بھی مترجم کا نادانستہ عمل کارفرما ہوتا ہے۔ انگریزی کا ایک جملہ ہے How so sweet he is کا ترجمہ ایک شخص لکھتا ہے ''وہ شخص کتنا پیارا ہے'' دوسرا لکھتا ہے ''کتنا پیارا ہے وہ شخص''۔ نحوی ساخت اور بلاغت کی رو سے دونوں جملوں کی حیثیت جداگانہ ہے لیکن ہر شخص کو اس کا ادراک ہو اور اس کے بعد وہ اسے استعمال کرے ایسا نہیں ہوتا ہے۔ البتہ بعد میں مدیر زبان وغیرہ اس بات پر گرفت کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔

اس قسم کی مداخلت کی بے شمار مثالیں مل جائیں گی۔ سب کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ صرف ایک بات ہے کہ مشق و مزاولت اور تجربہ اس طرح کی مداخلت کی شناخت کے قابل بنا دیتا ہے۔ مترجم کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنی ذات کی شناخت کرے، وہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کرے کہ کہاں وہ خود شامل ہو رہا ہے، جب اس سلسلہ میں اس کی پیش رفت ہوگی اور اس کو شناخت ہوگی۔ غیر شعوری مداخلتوں کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو تربیت و مشق کے ذریعہ تحت الشعور لایا جائے؛ تا کہ ایسا نہ ہو کہ ترجمہ میں مصنف کی جھلک کم مترجم کا چہرہ زیادہ نظر آنے لگے۔

شعوری مداخلت

شعوری مداخلت سے مراد ترجمے میں ایسا تغیر وتبدل ہے جس میں مترجم کے قصد وارادہ کو دخل ہو۔ اس قسم کی مداخلت حصوں میں تقسیم کر کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم وہ ہے جس میں مترجم کو کسی مجبوری کے تحت مداخلت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ ہو۔ اس ضمن میں بالخصوص لسانی مجبوریاں رکاوٹ بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ ہدفی زبان میں وہ نظام ہی نہیں ہوتا جو اصل زبان میں موجود ہے۔ ایسی صورت حال میں مترجم کو خواہی نہ خواہی مداخلت کرنی ہی پڑے گی۔ کسی زبان میں نظام اشتقاق ہوتا ہے کسی میں نہیں ہوتا، زبانوں میں قواعدی اعتبار سے کافی فرق پایا جاتا ہے، الفاظ کی تعداد کے اعتبار سے زبانیں کم اور زیادہ ثروت مند ہوتی ہیں، علوم وفنون کی اصطلاحات سے ہر زبان کا دامن یکساں بھرا ہوا نہیں ہوتا، نیز زبان کا مزاج بھی مختلف ہوتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جہاں مترجم کو مداخلت کے بغیر ترجمہ کرنے کی گنجائش موجود ہو اس کے باوجود وہ مداخلت سے کام لے۔ اس عمل میں مثبت ومنفی دونوں رجحان کارفرما ہو سکتا ہے۔ ترجمہ شدہ متن کو بہتر، قابل قبول وقابل رسا بنانے کے لیے بھی مترجم مداخلت کرتا ہے اور کبھی منفی رویہ کے ساتھ متن کو اپنے مقصد کی تکمیل اور اپنے نظریے کی اشاعت کے لیے مداخلت کرتا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ مداخلت کو مثبت کو منفی کے میزان میں تولنا ذرا مشکل کام ہے؛ کیونکہ ایک ہی مداخلت کسی کے لیے منفی ہو سکتی ہے جب کہ دوسرے کی نظر میں وہ مثبت ہوگی۔

مترجم ہدفی زبان کی رعایت کرتے ہوئے لسانی ساخت، قواعد اور وقوفی قارئین کے پیش نظر مداخلت کرتا ہے تا کہ جب متن وقوفی قارئین کے سامنے جائے تو اجنبیت ونامانوسیت کی وجہ سے گرانی نہ ہو۔ ثقافتی افتراق بھی مداخلت کا سبب بنتا ہے۔ جہاں ثقافتی بُعد ہوتا ہے مترجم شعوری طور پر اس میں درمیانی یا ایسا راستہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے جو ہدفی زبان کے ساتھ قدم سے قدم ملا سکے۔ شعوری مداخلت کا اہم سبب سیاسی نظریات بھی بنتے ہیں۔ مترجم اگر کسی خاص سیاسی نظریے کا حامل ہے اور اصل متن اس کے سیاسی نظریے سے متصادم ہے تو وہ مداخلت سے کام لیتا ہے۔ کبھی کبھی دو ملکوں کے درمیان تعلقات کی نوعیت بھی مداخلت کا سبب بنتی ہے۔ بسا اوقات مترجم توضیح وتشریح متن کے لیے جان بوجھ کر مداخلت کرتا ہے تا کہ ہدفی قارئین بہ آسانی بات سمجھ سکیں۔ ترسیل وتفہیم کو آسان بنانے کے لیے مترجم جو راستہ اختیار کرتا ہے اس میں اس کے

شعور کو دخل ہوتا ہے۔ یہی صورت حال ہیئت وصنف کے اعتبار سے مداخلت کے وقت پیش آتی ہے۔

شعوری مداخلت سے ترجمہ کو مختلف رخ دیے جاتے ہیں، اس کا مقصد وافادیت طے ہوتی ہے، اس میں مثبت ومنفی رجحانات پیدا کئے جاتے ہیں۔ یہ مداخلت مختلف سطح پر ہوتی ہے جیسے الفاظ، معانی، اسلوب، صنف، ہیئت وغیرہ۔ ان مقامات میں ہونے والی مداخلت پر گفتگو سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ جن عوامل - وقوفی ماحول، موضوع اور ثقافت وغیرہ- کی بنیاد پر یہ مداخلت ہوتی ہے اس کی کس حد تک رعایت کی جاسکتی ہے۔ ترجمہ میں ان کا کس درجہ لحاظ رکھا جاسکتا ہے اور کس قسم کی رعایت ترجمہ میں خیانت کی مترادف ہونے لگتی ہے۔ مداخلت کی مختلف سطحوں اور مداخلت کے اسباب وعوامل دونوں موضوعات پر اگلے ابواب میں یکے بعد دیگرے تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔

حوالہ جات

1. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت، ص29
2. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص5
3. ایضاً، ص5
4. ایضاً، ص5
5. ایضاً، ص5
6. ایضاً، ص46
7. ایضاً، ص42
8. ایضاً، ص47
9. ایضاً، ص52
10. ایضاً، ص77
11. ایضاً، ص71
12. کلیم الدین احمد، فرہنگ ادبی اصطلاحات، ص194
13. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص83
14. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص12
15. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص94
16. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص26
17. محمد حسن عسکر، گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص115
18. مرزا حامد بیگ، ترجمہ کا فن، ص50
19. Bassnett McGurie, S. (1980): Translation Studies, London Methuen
20. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت، (مقدمہ) ص16

21-22 The Oxford Englich Dictionary, second edition-volumeviii

23. oxford dictionary, 8th edition, P,871
24. بابائے اردو مولوی عبدالحق، The Standard English Urdu Dictionary، ص596
25. قومی انگریزی اردو لغت تالیف ڈاکٹر جمیل جالبی ص1028

26. المورد الحدیث 2008 ص 603
27. فیروز اللغات از مولوی فیروز الدین، ص 1128
28. فرہنگ آصفیہ۔ جلد سوم، ص 2068
29.
30. شہباز حسین، ترجمہ کی اہمیت، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص 180
31. Venuti 2003: 249
32. خلیق انجم، فن ترجمہ نگاری، ص 123
33. ایضاً، ص 122
34. ایضاً، ص 123
35. Language Structure and Translation: Essays By Eugene Albert Nid, p. 27
36. قمر رئیس، ترجمہ کا فن اور روایت (مقدمہ) ص 18
37. Translation as Intervention, pg,18-19
38. شہیم خان، کلام فیض کے انگریزی تراجم، ص 25
39. Translation as Intervention, pg, 54
40. Translation as Intervention, pg, 76
41. Miletich, Marko.Reading gender in translation: Translator's intervention in Isaac Chocron's "Pronombres personales".
42. Madan M. Sarma. Translating Shakespeare Intervention and Universals in Translation

باب سوم

عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ کتب میں ترجمے کے نظریات مداخلت کے پس منظر میں

ترجمہ دو زبانوں کے درمیان قائم ہونے والا تعامل ہے۔ ہر زبان کی اپنی تہذیب وثقافت ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہر زبان کسی نہ کسی خاص جغرافیائی خطے میں پروان چڑھتی ہے۔ ہر خطے اور علاقے میں بسنے والے افراد کے عادات واطوار، طرز فکر وطرز معاشرت اور اطراف و جوانب دوسرے خطے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ عناصر ہر خطے اور وہاں بسنے والے انسانوں کے ساتھ متصف ہوتے ہیں اور دوسرے خطے کے انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ دو خطوں کے درمیان جتنا جغرافیائی بعد ہوگا ان عناصر کے درمیان فرق بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ یہی حال زبان کا بھی ہے۔ دو الگ خطوں اور الگ خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبان میں لسانی وتہذیبی بعد زیادہ پایا جاتا ہے۔

اردو زبان پر عربی کے اثرات

ایک زبان سے دوسری زبان کا تعامل جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر دونوں زبانوں میں اجنبیت کم ہوتی جائے گی۔ دنیا میں پائی جانے والی کسی بھی زبان کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ خالص اور تمام تر خارجی اثرات سے پاک ہے؛ بلکہ اس کے برعکس تمام زبانوں میں دوسری زبانوں سے مستعار الفاظ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ جو الفاظ ایک زبان سے دوسری زبان کا حصہ بنتے ہیں وہ عام طور پر انتظامی امور، علوم وفنون، مصنوعات اور تجارتی اشیا سے متعلق ہوتے ہیں۔ جس طرح اشیا ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل ہوتی ہیں اسی طرح ان سے جڑے الفاظ بھی منتقل ہوجاتے ہیں۔ جب ایک زبان کا رابطہ دوسری زبان سے ہوتا ہے تو تاثیر وتاثر کا عمل بھی شروع ہوجاتا ہے۔ ممکن ہی نہیں ہے کہ رابطے کے بعد دونوں کے درمیان آپسی لین دین کا تعلق قائم نہ ہو۔ یہ تعلق مندرجہ اسباب کے باعث قائم ہوتا ہے:

1۔ ایک ملک یا قوم پر کسی دوسری ایسی قوم یا ملک کا استعماری تسلط قائم ہونا جس کی زبان مختلف ہو مثلاً جہاں جہاں برطانوی تسلط قائم تھا وہاں کی زبانوں پر انگریزی کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح لیبیا کی عام بول چال کی زبان پر اطالوی اور مغرب اقصیٰ کے ممالک پر فرانسیسی کا اثر موجود ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ممالک اور اقوام میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

2۔دومختلف زبان بولنے والی قوموں کے درمیان قربت۔جیسے فارسی کا عربی سے متاثر ہونااور ترکی کومتاثر کرنا۔

3۔ دومختلف زبان بولنے والے ملکوں کا طویل مدت تک برسر پیکار رہنا۔جیسے طویل مدت تک چلنے والی نارمن جنگوں کے سبب فرانسیسی اور انگریزی کا آپسی لین دین اور تاثیر و تاثر۔صلیبی جنگلوں کے دوران یورپی زبانوں کا عربی سے متاثر ہونا۔

4۔الگ الگ زبان بولنے والی قوموں کے درمیان تجارتی وثقافتی تعلقات مثلاً عربی زبان ہندوستانی اور فارسی زبانوں پراثر انداز بھی ہوئی اوران سے متاثر بھی ہوئی۔1

ان اسباب میں سے جب کوئی سبب پیدا ہوگا تو لسانی تاثیروتاثر کی تحریک پروان چڑھے گی۔یہی وجہ ہے کہ انگریزی نے دیگر زبانوں کے مقابلے میں نارمن زبانوں سے زیادہ استفادہ کیا ہے کیونکہ نارمندیوں کے حملے کے سبب دیگر زبانوں کے بالمقابل انگریزی اوراس کے درمیان بہت قریبی تعلق قائم رہا۔لاطینی نے یونانی زبان سے بہت استفادہ کیا اس کی بنیادی وجہ ان دونوں کی قربت ہے۔آج جو بہت سے عربی الفاظ یورپی زبانوں کا حصہ ہیں یا یورپی الفاظ عربی زبان میں شامل ہیں تو اس میں صلیبی جنگوں کا بہت ہی اہم کردار ہے۔اسی طرح جب دوزبان بولنے والے افراد کے درمیان تجارتی وثقافتی تعلقات استوار ہوتے ہیں تو ان کی زبان ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہے چنانچہ قبل از اسلام جو بہت سے ہندوستانی الفاظ عربی زبان کا حصہ بن چکے تھے وہ اسی قسم کے تعلقات کا نتیجہ تھے۔

اس باب میں عربی سے اردو میں ترجمے کے متعلق مترجمین کے نظریات کو جاننے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ عربی زبان سے اردو زبان کا کیسا رشتہ ہے؟ تاکہ صورت حال زیادہ واضح انداز میں سامنے آسکے۔یہ معلوم ہوسکے کہ دونوں زبانوں میں کس قدر ہم آہنگی پائے جاتی ہے اور اگر ہم آہنگی پائی جاتی ہے تو ترجمے پراس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ کیااس کی وجہ سے ترجمہ آسان ہوجاتا ہے؟ نیز اس بات سے واقفیت ہوگی کہ قربت کے باوجود ترجمے میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں۔

ہندوستان کا شماران ملکوں میں ہوتا ہے جن کا عرب سے گہرا رشتہ رہا ہے۔یہ رشتہ قبل از اسلام تجارتی نوعیت کا تھا۔اسلام کی آمد کے بعد اس میں تبلیغی مقصد کا اضافہ ہوگیا۔ابتدا میں ہی یہاں مسلمان آئے،سندھ

میں ان کی حکومت بھی قائم رہی ۔دوسری طرف بعد کے زمانے میں ہندوستان میں فارسی سرکاری زبان رہی۔دلی اوراس کے گردونواح میں رائج کھڑی بولی نے جب بولی سے زبان کا سفر کیا تو ان دونوں زبانوں سے کافی استفادہ کیا اوران زبانوں کے گہرے اثرات اس پر مرتب ہوئے ۔جہاں تک عربی کے اثرات کا تعلق ہے تو کچھ اثرات تو براہ راست عربی سے منتقل ہوئے اور کچھ فارسی کے واسطے سے، یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو کا لسانی مطالعہ کرتے ہیں تو زبان کے مختلف پہلوؤں پر اس کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔لسانی اعتبار سے اردو کا عربی سے قریبی تعلق رہا ہے، زبان کے تحریری،صوتی،لغوی،قواعدی عناصر سب پر اس کا گہرا اثر ہے، زبان کی ادبی صورت یعنی نثر ونظم اوران کی اقسام پر اس کے واضح اثرات ہیں۔اقسام نظم میں قصیدہ براہ راست عربی سے اردو میں منتقل ہوا، قابل ذکر امر یہ ہے کہ اردو کی سب سے طاقتور ترین ادبی صنف غزل بھی اپنے موضوع اور معنی کے لحاظ سے قصیدہ سے ہی ماخوذ ہے،معنوی لحاظ سے مرثیہ بھی عربی سے ہی ماخوذ ہے۔نثری اصناف میں داستان عربی سے فارسی کے واسطہ سے اردو میں منتقل ہوئی۔ادبی جملے، کہاوتیں،ضرب الامثال،محاورے،تلمیحات، استعارات وغیرہ زبان میں گل بوٹوں کا کام کرتے ہیں، زبان کی تزئین میں ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے،اردو میں مستعمل ادبی جملے بڑی تعداد میں براہ راست عربی سے ماخوذ ہیں۔اس طرح اگر غور کیا جائے تو لسانی اعتبار سے اردو کا عربی زبان سے کافی گہرا رشتہ ہے۔اردو کو معیاری زبان بنانے میں عربی زبان کا بڑا دخل رہا ہے۔خصوصا قدیم اردو ادب عربی سے بہت حد تک متاثر رہا ہے۔

زبانوں کے درمیان لین دین کا عمل دنیا کی تمام زبانوں میں رائج ہے۔ ہر زبان دوسری زبان سے استفادہ کرتی ہے۔اردو زبان بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہے۔اس نے بھی عربی، فارسی،مختلف ہندوستانی اور بعض یورپی زبانوں سے خوشہ چینی کی اوران کے اثرات قبول کیے۔

ایک زبان کا دوسری زبانوں سے متاثر ہونا اور دوسری زبانوں پر اثر انداز ہونا فطری تقاضہ اورسماجی اصول ہے۔زبانوں کا آپسی استفادہ واضح اور مسلم حقیقت ہے۔اس کے ثبوت میں جدید لسانیات کے ماہرین نے بے شمار دلائل پیش کیے ہیں۔2؎

تمام ماہرین لسانیات کا متفق علیہ خیال ہے کہ روئے زمین پر کوئی بھی ایسی زبان نہیں ہے جس پر کسی دوسری زبان کا اثر نہ ہو۔ مشہور مغربی ماہر لسانیات سائیس (sayce) کا کہنا ہے:

''یہ بات محتاج بیان نہیں ہے کہ دنیا میں جتنی بھی زبانیں پائی جاتی ہیں ان میں کوئی ایک زبان بھی ایسی نہیں ہے جو بالکل خالص اور دوسری زبانوں کے اثرات سے بالکلیہ پاک ہو۔''3

جان لیونس لکھتا ہے:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ جغرافیائی وثقافتی سطح پر زبانوں کے درمیان آزادانہ لین دین کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ مختلف اشیا اور عادات واطوار کے ساتھ وابستہ الفاظ انھیں کے ہمراہ لسانی وجغرافیائی حدود پار کر کے دوسری جغرافیائی ولسانی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔''4

باوجودیکہ اردو کی نشو ونما میں کئی دوسری زبانوں کا دخل رہا ہے لیکن عربی زبان اس میدان میں سب سے آگے ہے۔ اردو زبان کی ترویج وترقی میں سب سے اہم کردار عربی زبان کا ہی رہا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اردو پر فارسی زبان کا واضح اور مضبوط اثر ہے لیکن اس میں بھی عربی کا اثر شامل ہے؛ کیونکہ فارسی پر عربی زبان کا گہرا اثر ہے۔ بلکہ فارسی کی نشو ونما عربی کے گہوارے میں ہوئی، فارسی عربی کے زیر سایہ جوان ہوئی اور اسی کی مدد سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ اردو زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کرنے والی دوسری زبانوں میں ترکی زبان کا درجہ تیسرا ہے۔ اس کا حال بھی فارسی ہی کی طرح ہے کیونکہ اس پر بھی عربی زبان کے واضح اثرات موجود ہیں، کچھ تو براہ راست اور کچھ فارسی کے واسطے سے۔

قرآن، اسلام، عرب فاتحین اور مسلمان مبلغین کی زبان ہونے کی حیثیت سے جس طرح عربی زبان نے فارسی، ترکی، کردی، پشتو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، ہندی، بنگالی، تامل، مراٹھی وغیرہ اور براعظم افریقہ کی مختلف زبانوں کو متاثر کیا اسی طرح اردو زبان پر بھی اس کے اثرات ثبت ہوئے۔ فرق یہ ہے کہ مذکورہ تمام زبانوں کے مقابلے اردو پر اس کے اثرات زیادہ اور گہرے ہیں۔ کیونکہ عربی زبان کے ربط میں آنے سے قبل

ان زبانوں کا مستقل وجود تھا اور ان کی حیثیت کامل زبان کی تھی۔اس کے بعد دونوں میں اتصال ہوا اور ان زبانوں نے عربی سے استفادہ کیا، الفاظ اور علمی اصطلاحات اخذ کیں چنانچہ یہ ساری زبانیں اپنے عروج وارتقا میں عربی کی مرہون منت ہیں جبکہ اردو زبان نہ صرف اپنے عروج وارتقا میں بلکہ نفس وجود میں عربی کی منت کش احسان ہے۔ چنانچہ اگر عربی نہ ہوتی تو اردو زبان جس طرح آج ہے اس طرح نہ ہوتی اور باوجودیکہ اردو زبان کا تعلق ہندآریائی لسانی خاندان سے ہے لیکن اس کے باوصف اس پر عربی کا ایسا اثر ہے کہ اس کے علوم وآداب کا تعین قدر عربی علوم کی معرفت کے بغیر ناممکن ہے۔

اردو لغات پر عربی کا کس قدر اثر ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے اردو لغت میں عربی حروف ہجا کے کسی ایک باب کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر اردو زبان سے عربی الفاظ کو خارج کر دیا جائے تو اس کا استعمال مشکل ہوجائے گا۔ اہل اردو کوئی ایسا جملہ نہیں بولتے جس میں عربی الفاظ شامل نہ ہوں۔ اردو معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیہ وغیرہ تمام علوم کا منبع وسرچشمہ عربی ہے۔ ان علوم میں مستعمل اصطلاحات، ترتیب اور اسلوب سب عربی کے تابع نظر آتے ہیں۔ اگر فعل کی شکلیں، جملوں کی ترکیب اور علامات جمع کا اختلاف نہ ہوتا تو ان علوم کی تمام اردو کتابیں بعینہٖ عربی کتابیں ہوتیں۔

تاثیر کے مختلف اسباب میں سے چند اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

1۔عربی زبان کا اسلام سے ربط وتعلق

دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے یعنی مسلمانوں کی مذہبی زبان ہونے کی حیثیت سے عربی کو دنیا کی تمام زبانوں میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اسلامی شریعت کے بنیادی ارکان قرآن وسنت کی زبان ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں عربی کا بڑا اہم رول ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ خواہ ان کی زبان کوئی بھی ہو وہ قرآن عربی میں ہی پڑھیں، دن میں پانچ بار عربی میں ہی نماز ادا کریں۔ ایک دوسرے کو سلام کریں تو عربی میں ہی کریں۔ ان احکام کی ادائیگی کے راستے اسلامی ممالک کی زبانوں میں عربی زبان گہرائی تک داخل ہوگئی اور ان پر عربی کا گہرا اثر پڑا، واضح رہے کہ اردو بھی انھیں زبانوں میں سے ایک ہے۔ عربی زبان کی ترویج واشاعت اور دوسری زبانوں کو متاثر کرنے کے پس پشت اسلام کا بہت

بڑا دخل ہے۔مغربی زبانوں کے ایک ماہر نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ:

''اسلام کی زبان ہونے کی حیثیت سے عربی زبان کا نفوذ پورے عالم اسلام میں ہے جیسے ترک، فارس، اور ہندوستان''۔5؎

2۔فارسی و ترکی پر عربی کے اثرات

اردو زبان کی ترویج و ترقی ہندوستان میں ترکی اور افغانی عہد حکومت کے زیر سایہ ہوئی لہذا اس پر فارسی اور ترکی زبان کا خاطر خواہ اثر ہونا بالکل فطری بات تھی۔اردو پر ترکی کے بالمقابل فارسی کے اثرات زیادہ پڑے اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ترکی زبان طبقۂ حکام تک ہی محدود تھی اور اس کے بولنے والوں کی تعداد بہت کم تھی جبکہ فارسی زبان کا دائرۂ کار بہت وسیع تھا چنانچہ فارسی حکومت و سلطنت سے وابستہ افراد کی زبان تھی، عام بول چال کی زبان تھی اور مسلم عہد حکومت میں سرکاری زبان کے درجے پر فائز تھی۔چونکہ فارسی پر عربی کا خاصا اثر بایں طور ہے کہ عربی نے اسے مصادر و مشتقات سے بھر دیا تھا اور مصطلحات و اسالیب سے پر کر دیا تھا لہذا فارسی زبان کا اردو پر جو بھی اثر ہوا وہ ایک طرح سے عربی کا بالواسطہ اثر ہے۔عربی سے اثر قبول کرنے کے معاملے میں ترکی زبان فارسی سے مختلف نہیں ہے خواہ یہ اثرات براہ راست پڑے ہوں یا فارسی کے واسطے سے۔غور و فکر کرنے والے شخص پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اردو نے ان دونوں زبانوں سے جو اثرات قبول کیے ان میں عربی کا ایک بڑا ذخیرہ بھی شامل ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو فارسی اور ترکی پر پڑنے والے عربی اثرات بھی اردو پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں شمار ہوں گے۔

اردو زبان کے ماہرین نے ہماری زبان پر پڑنے والے جن اثرات کو فارسی و ترکی زبان کے اثرات میں شمار کیا ہے ان کی معتد بہ تعداد دراصل عربی زبان کا بالواسطہ اثر ہے؛ لیکن عربی زبان کی عدم معرفت ان حضرات کے لیے اس حقیقت تک رسائی میں مانع رہی۔

3۔عربی زبان کا علمی مقام و مرتبہ

اسلام کی آمد کے بعد ایسا علمی انقلاب شروع ہوا جس کا تاریخ نے کبھی مشاہدہ نہیں کیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے صحرائے عرب مرکز علم و عرفان بن گیا۔ہر سمت سے علم کے چشمے ابلنے لگے۔علم و ادب کی آبیاری کے

لیے عربی زبان آب حیات کی حیثیت اختیار کر گئی۔ عربوں نے یونان، ہند، چین کے قدیم علوم اپنی زبان میں منتقل کیے اور عربی کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ علم وفن کا متلاشی خواہ کسی خطے کا ہو یا کوئی بھی زبان بولتا ہو عربی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسی علمی مقام ومرتبے کے باعث عربی زبان چہار دانگ عالم میں پہنچی اور دنیا کی دیگر زبانوں پر اثر انداز ہوئی۔

4۔ ہندوستان کے اندر عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا تسلسل

ہندوستان میں عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا تسلسل اردو پر عربی زبان کے اثر انداز ہونے کا ایک بڑا سبب رہا ہے۔ ہندوستان میں اسلام کے داخلہ کے وقت سے لے کر اب تک تحریر، ثقافت اور علوم کی زبان عربی ہی رہی ہے۔ عربی زبان میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ پورے مسلم عہد حکومت میں منقطع نہیں ہوا۔ چنانچہ یہاں کی زبانوں پر عربی اثرات کا واقع ہونا فطری نتیجہ تھا۔ فارسی زبان کا حلقۂ اثر وسیع ہونے اور سرکاری زبان ہونے کے باوجود اس کا دائرہ کار افہام وتفہیم، معاملات، عدالت اور امور سلطنت سے آگے نہیں بڑھ سکا اور وہ علمی وثقافتی میدان میں عربی زبان کی بلندی کو نہیں پہنچ سکی۔ جس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اردو پر عربی زبان کا براہ راست اثر نہیں ہوا بلکہ تمام اثرات فارسی کے واسطے سے آئے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ اردو پر عربی کا بہت ہی معمولی اثر ہے جو کہ عربی زبان سے عدم واقفیت اور ہندوستان کی تصنیفی وتالیفی سرگرمیوں سے آگاہ نہ ہونے کا بین ثبوت ہے۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ اس میدان میں فارسی زبان کا بہت اہم کردار ہے لیکن اتنا نہیں جتنا کہ اردو ادبا ومحققین سمجھتے ہیں۔

5۔ عربی زبان کی لسانی فوقیت

دوسری زبانوں پر عربی زبان کے اثرات کا ایک اہم سبب اس کا لسانی تفوق ہے۔ عربی زبان میں بے شمار ایسی لسانی خصوصیات مجتمع ہوگئیں جو دوسری کسی زبان میں نہیں ہیں۔ عربی الفاظ ومفردات کے اصول، قواعد نحو وصرف اور بلاغت کی باریکی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے ثروت مند زبان ہے۔ اسی لسانی فوقیت نے عربی زبان کو ممتاز مقام عطا کیا اور دیگر زبانوں نے اس سے خوشہ چینی کی۔

6۔ ہندوستان میں عرب حکومت کا قیام

ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں عرب حکومت کے قیام سے ایک طرف یہاں عربی زبان کی نشرو اشاعت میں کافی تعاون حاصل ہوا دوسری طرف علاقائی زبانوں پر عربی کے اثرات مرتب ہوئے۔واضح رہے کہ عرب دور حکومت میں عربی ہی سرکاری اور معاملات کی زبان تھی جس پر علمی کتابیں اور تاریخی دستاویزات شاہد ہیں۔6

7۔قبل از اسلام عرب و ہند تعلقات

اس وقت کسی محقق کے لیے انتہائی مشکل ہے کہ وہ اسلام سے قبل عرب و ہند تعلقات اور ہندوستان کے مغربی سواحل پر عرب بستیوں کے نتیجے میں یہاں کی علاقائی زبانوں اور عربی کے درمیان لسانی تاثیر و تاثر کا پتہ لگا سکے۔مگر لسانی اصول اس امر کو یقینی بناتے ہیں کہ ان کے درمیان تاثیر و تاثر کا تعلق ضرور رہا ہوگا کیونکہ آج بھی ان علاقوں میں عرب آباد ہیں نیز ان خطوں کی علاقائی زبانوں میں پائے جانے سینکڑوں عربی الفاظ اسی عہد کی دین ہیں۔

8۔اردو اور مسلمانوں کے درمیان ربط و تعلق

اردو زبان کی پرورش مسلمانوں کی زیر نگرانی ان کے محلات، بازار، مجالس، خانقاہوں اور مدارس میں ہوئی۔لہذا اس پر مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی کا اثر انداز ہونا بدیہی بات ہے۔ابتدائی ایام میں اردو کے تمام بڑے شعرا عربی زبان و ادب سے واقف تھے چنانچہ وہ اپنی شاعری اور تحریر میں شعوری یا غیر شعوری طور پر عربی الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔

اردو لغات پر عربی کے وسیع و عمیق اثرات مرتب ہوئے ہیں باوجودیکہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کے علوم پر یہ اثرات کتنے گہرے ہوں گے کیونکہ اردو لغات کے مقابلے میں ان علوم کو عربی سے اثر پذیری کے کہیں زیادہ وسیع و عمیق امکانات میسر تھے۔ان علوم کی تدوین بھی ان علما کے ہاتھوں کے ہوئی جو عربی زبان و ادب میں کمال رکھتے تھے علاوہ ازیں ان کے پاس عربی کے سوا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں تھا جس سے وہ رہنمائی حاصل کر سکتے۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ان علوم کو عربی زبان سے ان

کی جزئیات اور تمام تر تفصیلات کے ساتھ منتقل کر دیا۔ اس طرح اردو کے یہ علوم عربی کے اپنے نظائر کے ساتھ گہرا رابطہ رکھنے والے علوم بن گئے۔

اردو نے فارسی ہی کی مانند عربی سے براہ راست اثرات قبول کیے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو زبان کے اکثر و بیشتر ادبا و شعرا عربی ثقافت سے واقف اور عربی علوم و آداب سے آراستہ ہوا کرتے تھے اور یہ سلسلہ گزشتہ صدی کے نصف اول تک جاری و ساری تھا۔ چنانچہ اس بات میں کوئی شک و شبہ ہونا ہی نہیں چاہیے کہ انھوں نے فارسی کے وسیلے کے ساتھ اور بغیر وسیلے کے عربی سے براہ راست اثرات بھی قبول کیے ہوں گے۔ اردو زبان و ادب پر نظر رکھنے والے کسی بھی شخص کو براہ راست عربی اثرات کی موجودگی میں ذرا سا بھی تردد نہیں ہوگا۔

جب حالی نے اردو کا مشہور مقدمہ تصنیف کیا جسے آج بھی ادبی تنقید میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے تو عربی تنقید کی اہم کتابیں مثلاً قدامہ بن جعفر کی نقد الشعر، ابن رشیق قیروانی کی العمدۃ، جاحظ کی کتابیں، قالی کی امالی، اصفہانی کی اغانی ان کے پیش نظر تھیں۔ انھوں نے ان عرب تنقید نگاروں کے اصول و قواعد سے استفادہ کیا اور بار بار ان کتابوں کی طرف اشارہ بھی کیا جن میں قیروانی کی العمدۃ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اسی طرح بے شمار عربی شعرا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے اشعار درج کیے ہیں۔

اردو زبان میں بلاغت پر لکھی گئی کتابوں میں عربی کتابوں جیسے سکاکی کی مفتاح العلوم، قزوینی کی تلخیص المفتاح اور تفتازانی کی تصنیف مختصر المعانی شرح تلخیص المفتاح کی پیروی کی گئی ہے۔ ان اردو کتابوں پر فارسی کے واسطے سے عربی اثرات یا خود فارسی کے اثرات شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ اردو میں بلاغت کی سب سے مشہور کتاب نجم الغنی رامپوری کی بحر الفصاحت اردو زبان پر عربی کے براہ راست اثر کی بہترین مثال ہے کیونکہ یہ کتاب تفتازانی کی مختصر المعانی سے ماخوذ ہے۔ اس میں صرف مختصر المعانی کے موضوعات، ترتیب اور احکام کی ہی اتباع نہیں کی گئی بلکہ تھوڑا سا تسامح و توسع سے کام لیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو مثالوں کے ساتھ یہ اسی کا ترجمہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اردو زبان و ادب پر عربی کا اثر بلا واسطہ اور فارسی کے وسیلے سے دونوں طرح مرتب ہوا ہے لیکن اردو زبان کے علوم پر شاعری اور نثر کے مقابلے میں زیادہ تر اثرات براہ راست ہی مرتب ہوئے ہیں۔ بہرحال جو بھی صورت حال ہو، ہے تو عربی کا ہی اثر خواہ بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ۔

کسی بھی ادب کے مزاج اوراس کی بنیاد کی تشکیل میں تلمیحات،تشبیہات ،استعارات، الفاظ و محاورات بہت ہی اہم کردارادا کرتے ہیں۔ ہرادب کا اپنا خاص ماحول ہوتا ہے۔اس کے اپنے درخت،پھل، مرغزار، پھول، چرند، پرند ، ندیاں، کتب واصنام ،شخصیات، پہاڑ، وادیاں، مقامات، بستیاں، عشاق، معشوقات، اساطیر، حکایات، رموز اور اشارات ہوتے ہیں جو اسی کے ساتھ خاص ہوتے ہیں اور دوسرے ادب میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

جب ہم اس پہلو سے اردوادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر بے شمار عربی تلمیحات،تشبیہات، استعارات، الفاظ اور اصطلاحیں موجود ہیں۔ اردوادب کے طالب علم کوکوئی ایسا نثری فقرہ یا شعری ٹکڑانہیں ملتا جس میں یہ عناصر شامل نہ ہوں۔ اردو کے ہندآریائی زبان ہونے کے باوجودان عناصر کی کثرت اردوطالب علم کوٹھہرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ امور محققین کوبھی ہمیشہ سے حیرت زدہ کرتے رہے ہیں چنانچہ اردواد با نے مختلف انداز سے اس کی توجیہہ کرنے کی کوشش کی ہے اوراس سلسلے میں کئی رائیں پائی جاتی ہیں۔بعض نے اسے اردوادب کے ایک شدید متعصّبانہ رجحان سے تعبیر کیا ہے۔7

سب سے قابل توجہ چیز اردوادب کے ہر دونظم ونثر میں مستعمل عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ادبی کتابوں کے مقابلے میں علمی و دینی کتابوں میں عربی الفاظ کا استعمال کہیں زیادہ ہے،جس شخص کی بھی نظر اردو میں لکھی گئی فقہ، طب، کلام اور منطق کی کتابوں پر ہے اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ کتابیں اپنے موضوع اور اصطلاحات کے اعتبار سے عربی کتابوں کی نقل ہیں۔ بہت کم نثری جملہ یا شعری ٹکڑاایسا ہوتا ہے جو عربی الفاظ سے خالی ہوالا یہ کہ شعوری طور پر اس سے احتراز کی کوشش کی گئی ہو۔اردو سے عربی الفاظ کو خارج کرنے کی خاصی جدوجہد بھی کی گئی لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوسکی اور تمام تر کوششیں رائیگاں چلی گئیں اوران کی حیثیت صنائع وبدائع کے نمونوں سے زیادہ نہیں۔

جب ہم اردوزبان کے لسانی رگ وریشے اورادبی روپ پرنظر ڈالتے ہیں تو ہمیں عربی زبان،اردو کے خون میں گردش کرتی نظر آتی ہے اور جس طرح انسان اپنے اندرخون کی گردش کومحسوس نہیں کرسکتا،اسی طرح ایک عام اردووالا اپنی زبان میں شامل عربی کے الفاظ کونہیں پکڑسکتا جب تک کہ وہ اچھی نبض شناسی نہ سیکھ لے۔

اردو زبان میں روزمرہ بات چیت ہو کہ علمی گفتگو، سائنسی و تکنیکی تحقیق و تدقیق ہو کہ ادبی و شعری تنقید و تخلیق، تذکرہ ہو یا تجزیہ، تعارف ہو یا تبصرہ عربی سے استعانت کے بغیر نوالہ توڑنا مشکل ہوتا ہے۔ اردو تحریر و تقریر میں عربی کی مانوس اصطلاحات و تعبیرات یا معروف تراکیب کو تو ہم ان کی خصوصی و امتیازی حیثیت کے سبب بڑی آسانی سے پہچان لیتے ہیں؛ لیکن بہت سے الفاظ و تراکیب اتنی خاموشی سے ہماری زبان میں سرایت کر گئی ہیں کہ ان کی نشان دہی کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجھک نہیں محسوس ہوتی کہ ہندی کے مقابلے میں اردو کی الگ شناخت فارسی سے زیادہ عربی عناصر کے سبب قائم ہوتی ہے۔ عربی کے لسانی عناصر سے مملو تحریر کو خواہ اردو رسمِ خط میں لکھا جائے خواہ دیوناگری لپی میں، وہ فوراً بول پڑے گی کہ میں اردو ہوں۔

اردو سے عربی کا لسانی و ادبی رشتہ بہت گہرا اور قریبی ہے۔ برصغیر میں اسلامی و مشرقی علوم و فنون خصوصاً تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، طب یونانی کے علاوہ فن تعمیر، علم ہندسہ، نقاشی، خطّاطی وغیرہ سے اردو والوں کو خاص جڑاؤ اور لگاؤ رہا ہے۔ چنانچہ ان شعبوں سے متعلق وہ تمام اصطلاحات و اظہارات جو عربی سے ماخوذ ہیں، اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ ان مستعار عناصر کے سبب اردو کا رشتہ عربی سے کتنا گہرا اور پرمعنی ہو گیا ہے، اس پر تحقیقی و تنقیدی نگاہ ڈالنا بھی مفید ہوگا۔

ادب کا ایک خاص مفہوم ہوتا ہے جس سے مراد اعلیٰ درجے کی فنکارانہ نثر اور اعلیٰ درجے کی شاعری ہے، فکشن یعنی قصے اور ناول بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ادب کا ایک دوسرا عمومی مفہوم ہے جو جنرل لٹریچر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے، جیسے حدیث کا لٹریچر، تفسیر کا لٹریچر، اسلامیات کا لٹریچر، سائنس کا لٹریچر وغیرہ وغیرہ۔ اردو ادب اپنے دونوں مفہوم کے لحاظ سے عربی ادب سے متاثر ہے یعنی اردو ادب میں ادب کے عمومی مفہوم کے لحاظ سے بھی بہت کچھ مواد عربی ادب سے ماخوذ ہے اور ادب کے فنی مفہوم کے لحاظ سے بھی اردو ادب نے عربی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ پہلے ہم ادب کے عمومی مفہوم کو لیتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوگا اردو زبان کا خزانۂ علمی عربی ادب کے زیر اثر علوم اسلامی سے مالا مال ہے۔ عربی زبان کے بعد اسلامیات پر کسی زبان میں اتنی کتابیں نہیں لکھی گئیں جتنی اردو میں لکھی گئی ہیں۔

جولوگ اردو زبان کی تاریخ سے واقف ہیں انہیں علم ہے کہ اردو میں عربی اور فارسی دونوں کی بہت زیادہ آمیزش رہی ہے۔ کئی سو سال پہلے مسلمانوں کے عہد حکومت میں انتظامی کاموں کی زبان اور علمی کاموں کی زبان فارسی تھی۔ حکومت کے عملہ کا جب عوام سے ملنا جلنا ہوتا تھا تو وہ عوام کی زبان بولتے تھے جس میں فارسی الفاظ داخل ہو جاتے تھے اور چونکہ فارسی میں عربی کے الفاظ بہت کثرت سے داخل تھے اس لئے عربی کے الفاظ خود بخود عوامی زبان میں داخل ہوتے چلے گئے۔ علمائے دین کو بھی وعظ و تقریر کے لئے عوام کی زبان اختیار کرنی پڑتی تھی اور مذہبی گفتگو یا تقریر میں عربی زبان کے الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا تھا اس لئے با قاعدہ ایک عوامی زبان کی بنیاد پڑتی چلی گئی، جس کا نام بعد میں اردو ہو گیا۔ فوج میں بھی عوام کو بھرتی کیا جاتا تھا اور فوج کا عوام سے ملنا بھی ہوتا تھا اس لئے اس نئی ترقی پذیر زبان کا نام اردو پڑ گیا جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ یہ ملک کی سرکاری عالمانہ زبان سے الگ زبان تھی جو بتدریج ترقی کرتی چلی گئی۔ عربی زبان کے الفاظ زیادہ تر فارسی زبان کے ذریعہ اس میں داخل ہوئے اور کچھ براہ راست بھی، اس لئے کہ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی اور اسلامیات کا بہت بڑا خزانہ اس زبان میں موجود تھا۔ قرآن و حدیث کے پڑھنے اور سننے کے مبارک اثرات بھی اس زبان پر پڑے، اس لئے عربی کے الفاظ فارسی کے ذریعہ بھی داخل ہوئے اور کچھ براہ راست بھی داخل ہوئے۔ عربی زبان کے دینی اور ادبی قصے اس کی تلمیحات سب اردو میں داخل ہو گئی۔ مجنون و لیلی، موسی و عصائے موسی، حاتم طائی، حیدر کرار، کربلا و کوہ طور اور یوم النشو را اور اس طرح کے سینکڑوں عربی الفاظ اردو زبان کا جز بن گئے۔ یہاں تک کہ اردو عبارتوں اور نظموں میں کبھی 40 اور 50 فیصد تک عربی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اقبال کے یہ اشعار دیکھئے:

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل وجمیل
تیری بنا پائدار تیرے ستون بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل
تیرے در و بام پر وادی ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہِ جبرئیل

ان اشعار میں پچاس فیصد تک الفاظ عربی زبان کے ہیں۔

اردو شعر وادب اور تنقید پر عربی ادب کے اثرات کا جائزہ لینے سے پہلے اب ہم یہاں کچھ اردو کے الفاظ کا تذکرہ بھی کرنا چاہتے ہیں جو اصلاً تو عربی زبان کے الفاظ ہیں لیکن وہ بھیس بدل کر کے اردو زبان وتہذیب میں گھل مل گئے ہیں۔ کسی چیز کی قیمت کے لئے جب ہم دام کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ اس لفظ کا کوئی تعلق عربی زبان سے ہے۔ یہ لفظ دام اصل میں درہم ہے جو کبھی صرف مال اور قیمت کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''یہ اٹھائیس کیریٹ کا سونا ہے'' تو ہمارا ذہن اتنا دقیقہ سنج اور نکتہ شناس نہیں ہوتا کہ عربی لفظ قیراط کی طرف منتقل ہو اسی طرح سونا کا سکہ اشرفی بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور قدیم عربی کتابوں میں اس لفظ کا استعمال ملتا ہے۔ اور جب ہم خوان نعم پر بیٹھ کر فیرنی سے کام و دہن کو لذت یاب کرتے ہیں تو ہمارا ذہن ادھر منتقل نہیں ہوتا کہ عربی میں ایک لفظ الفرانی بھی ہے جسے گندھے ہوئے آٹے میں شیر وشکر ڈال کر پکاتے ہیں اور جسے اکثر بیماروں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا اب اس فیرنی اور کھیر کو حلبیہ کہتے ہیں۔ دسترخوان کے دوسرے کھانے قلیا کباب اور شوربا بھی اصلاً عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ مفروشات میں ایک چیز قالین ہے یہ اصل میں ایک اسلامی شہر قالیقلاء کی طرف منسوب ہے اور یہیں کی ایک اور معروف شخصیت ابوعلی القالی ہے ،اسی طرح ہم اردو میں راج مستری کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ عربی معاجم میں ایک لفظ ''راز'' ملتا ہے جو عمارت کے معمار کے لئے استعمال ہوتا تھا اسی طرح مستری کا لفظ بھی عربی ہے اور اس سے مراد وہ مسطر ہے جو مکان کا معمار دیوار اٹھانے اور اسے برابر کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا، لکڑی کا کام کرنے والے بڑھئی کے پیشہ کے لوگ خراد کرنے کا لفظ استعمال کرتے ہیں یہ بھی عربی لفظ ہے ''خراط''، قلعی کرنے کا لفظ اردو زبان میں عام ہے۔ قلع عربی میں اس دھات کو کہتے ہیں جس سے برتنوں پر قلعی کی جاتی ہے پھر اردو میں ایک معروف لفظ تماشا ہے اصل میں یہ عربی تمشی ہے یہ دوستوں اور ساتھیوں کے ساتھ چہل قدمی کرنے اور چلنے میں لفظ لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کیمیا، کتاب وقلم، عنصر اور بیشمار الفاظ ہیں جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں عربی زبان کے الفاظ بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کی بڑی تعداد عربی سے مستعار ہے اور صرف الفاظ نہیں بلکہ مکمل عربی تعبیرات اردو ادب میں اور کتابوں میں در آئی ہیں مثال کے طور پر المعنی فی بطن الشاعر ، استغفر الله ، ان شاء الله ، الحمد لله ، سبحانه ، الامر فوق الادب ،کالنقش فی الحجر ، کالعدم ۔شعرا کے نام اور تخلص زیادہ تر عربی زبان کے ہوتے ہیں جیسا سودا، میر، غالب، اقبال، فیض، مجاز، پیشوں کے نام بھی عربی سے لئے گئے ہیں۔ جیسے تاجر، طبیب، حکیم، قاضی، امام، استاذ۔ عدلیہ کی اصطلاحیں بھی سب عربی زبان سے آئی ہیں جیسے مدعی ، مدعی علیہ، قانون، عدالت، شہادت، وکیل ، ارتکاب جرم وغیرہ۔ شعر و ادب اور فنون پر عربی زبان کی چھاپ بہت گہری ہے۔ بلاغت کی تمام اصطلاحیں، صنائع اور بدائع ،سب کے سب عربی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اردو کے عروض بھی وہی ہیں جو عربی شاعری کے عروض ہیں، خود شعر کا لفظ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ شعور سے مشتق ہے۔ شعور کا تعلق قلب سے ہے یعنی واردات قلبی کا شعور ہے۔ وہ موزوں اور مقفی کلام جو عکس جذبات ہونے کے ساتھ ساتھ حسن زبان و بیان کا مجموعہ ہوتا ہے شعر کہلاتا ہے۔ اردو شاعری کے فنی محاسن وہی ہیں جو عربی شاعری کے فنی محاسن ہیں۔ شعر کو صداقت سے قریب ہونا چاہئے۔ صرف خوش بیانی کافی نہیں، چنانچہ عربی کا ایک شعر جس کا مفہوم یہ ہے سچا اور درست شعر وہ ہے کہ جب اسے کوئی شخص سنے تو یہ کہہ کر اٹھے کہ یہ سچی بات ہے۔

دنیا کے اندر کوئی ایسی زبان نہیں جس میں امثال و حکم موجود نہ ہوں لیکن عربی زبان اس اعتبار سے دیگر زبانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ثروت مند ہے۔ عربی میں حکمت اور مختلف واقعات سے متعلق بے شمار ضرب الامثال پائی جاتی ہیں۔

اردو کے ابتدائی مصنفین و ادبا کی تربیت عربی کے زیر سایہ ہی ہوئی اس لیے وہ عربی ادب و ثقافت سے خوب اچھی طرح واقف تھے اور اس واقفیت کی بنا پر ان امثال سے بڑی حد تک مانوس تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اردو تحریروں میں کبھی بعینہ اور کبھی بصورت ترجمہ ان حکم و امثال کا خوب استعمال کیا ہے۔

لہذا اردو میں عربی کی بہت سی امثال و حکم اس طرح شامل ہو گئیں کہ اسی زبان کا جز و لاینفک بن گئیں۔ بعد کے ادوار میں اردو ادبا نے اپنے علمی ذوق و استعداد کے مطابق ان کا استعمال تمام اصناف نثر میں

کیا۔اس سے یہ امر واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اردو پر عربی کے بہت مضبوط و مستحکم اثرات ثبت ہوئے ہیں۔ دوران تحریر و گفتگو استعمال میں آنے والے ان عام و مروج ضرب الامثال و کہاوتوں کا مجموعہ باب دوم میں ضبط کیا گیا ہے۔

اردو میں بے شمار ایسی ضرب الامثال مروج ہیں جو عربی سے ترجمہ شدہ ہیں جیسے ''دام کرائے کام'' عربی مثل ہے''النقود تحل العقود ''۔''پانی آیا تیمّم برخاست''عربی مثل''اذا حضر الماء بطل التيمم '' کا ترجمہ ہے۔''تدبیر کے پر جلتے ہیں تقدیر کے آگے'' عربی مثل''اذا حلت المقادير ضلت التدابير''کا ترجمہ ہے۔عربی ہی کی طرح اردو میں فصیح و بلیغ شخص کے لیے سحبان، سخی کے لیے حاتم اور چالاک کے لیے لومڑی کی مثال دی جاتی ہے۔

اردو اور عربی کے درمیان لسانی و ادبی رشتے کی جڑوں کے تلاش میں تراجم کا جائزہ لینا نہایت کارآمد ہوسکتا ہے۔صرف قرآن کے ہی تراجم کا لسانی و ادبی تجزیہ کیا جائے تو اردو کے اسلوبیاتی ارتقا کی تاریخ کا ایک مختلف باب وا ہوسکتا ہے۔قرآن کے متعدد تراجم کا تقابلی جائزہ بھی نہایت سنجیدگی اور ارتکاز کا تقاضا کرتا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اردو کے ساتھ عربی پر بھی غیر معمولی عبور کی ضرورت ہے۔عربی سے اردو تراجم کی دنیا تو انتہائی وسیع ہے۔

اردو میں عربی ادب کے ترجمہ کی روایت

اردو میں ابتدا سے ہی عربی ترجمہ کی روایت رہی ہے اور عربی ادب کی بہت سی معروف کتابوں کے ترجمے ہوئے ہیں، خصوصاً قدیم عربی ادب کے ترجمہ پر خاص توجہ دی گئی جن میں نثر اور شاعری دونوں کے ترجمے شامل ہیں۔عربی کے مشہور قصائد سبع معلقات کا ترجمہ ہوا، عربی کے مشہور شاعر متنبّی کے دیوان کا نثری اور منظوم دونوں ترجمہ کیا گیا، دیوان امام شافعی، دیوان حضرت علی، دیوان حماسہ اور مقامات حریری کا ترجمہ کیا گیا، جاحظ کی مشہور کتاب ''کتاب البخلاء'' کا ترجمہ ہو چکا ہے۔مشہور و معروف داستان الف لیلی کا ترجمہ ہوا، قابل قدر ادبی شہ پارہ ''کلیلہ و دمنہ'' کا ترجمہ ہوا۔قدیم کتابوں کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کے مصنفین کی کتابوں کے تراجم بھی ہوئے جیسے مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب روائع اقبال کا اردو ترجمہ نقوش اقبال کے نام سے کیا گیا، مولانا کی

سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' کا ترجمہ ''دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کے اثرات'' کے نام سے کیا گیا۔ اس کے علاوہ کچھ متفرق نظموں کے ترجمے بھی ہوئے جیسے عربی کے معروف نعتیہ قصیدہ ''قصیدۂ بردہ'' کے کئی ترجمے ہوئے ہیں۔ جدید افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کئے گئے۔

قدیم داستانوں کے ترجمے کی طرف بھی خاصی توجہ دی گئی۔ مثلاً الف لیلہ کے کئی ترجمے منظر عام پر آئے۔ داستان کو عربی میں قصہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ ان اصناف میں شامل ہے جن کے آغاز کا سہرا عربی زبان کے سر ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب قصے، کہانیوں سے بہت شغف رکھتے تھے۔ وہ محفلیں منعقد کرتے، رات بھر داستان گو بہادری و شجاعت کی داستانیں سناتے تھے۔

عرب قبائل کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہتی تھیں جن میں پیش آنے والے واقعات ہی قصوں کا ایک بہت بڑا منبع تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالفرج اصفہانی نے اپنی ایک کتاب میں سترہ سو لڑائیوں کا ذکر کیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی انبیاء کرام اور گزشتہ قوموں کے کئی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کی ایک سورہ کا نام ہی سورۂ قصص ہے۔ قصہ اور اس سے مشتق الفاظ قرآن کریم میں پندرہ بار استعمال ہوئے ہیں جیسے قرآن کی آیت ہے'' نحن نقص عليك أحسن القصص ''8 و '' لقد كان في قصصهم عبرة لأولى الألباب ''9 و'' فاقصص القصص لعلهم يتفكرون ''10۔ نبی کریم ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ ﷺ قصہ سناتے تھے، دوسروں سے قصہ سنانے کے لیے کہتے تھے اور قصہ سنتے تھے۔ صحابی رسول تمیم داریؓ نے امیر المومنین حضرت عمرؓ سے جمعہ کے دن نماز کے بعد مسجد نبوی میں قصہ سنانے کی اجازت مانگی تو حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے حسن بصریؒ کو بھی اجازت دی تھی کہ وہ مسجد میں لوگوں کو قصہ سنائیں۔

عربوں میں قصے کی صنف کو عروج عہد عباسی کے آخری ایام میں حاصل ہوا۔ دوسری زبانوں سے منقول قصوں کو اس زمانے میں خاصی شہرت حاصل ہوئی جن میں سے مشہور ترین قصہ کلیلہ و دمنہ ہے۔ عربی زبان کے مشہور قصوں میں عنترہ کا قصہ، قصۂ براق، قصۂ بکر و تغلب، قصۂ شیبان و نوشیرواں، الف لیلہ و لیلہ۔ سہل بن ہارون متوفی 215ھ نے کلیلہ و دمنہ کی طرز پر ثعالبہ و عفراء، النمر والثعلب اور وامق و عذراء لکھی۔ جن کتابوں میں عربی کے تمام قصوں کو جمع کیا گیا ہے ان میں عربی کے مشہور ادیب جاحظ کی کتاب البخلاء، ابن

شہید اندلسی کی زوابع، ہمدانی اور حریری کی مقامات اور معری کی رسالۃ الغفران وغیرہ بہت معروف ہیں۔

اردو میں قصے کی بنیاد عربی میں موجود قصے کی اساس پر ہی رکھی گئی۔ اردو زبان میں اس سفر کی ابتدا عربی اور فارسی سے منقول قصوں سے ہوئی۔ اگر یہ کہا جائے تو قطعی بے جا نہ ہوگا کہ اردو کی قدیم داستانوں کا سرا کہیں نہ کہیں عربی قصوں سے ضرور ملتا ہے۔ بعض قصے تو براہ راست عربی سے ترجمہ کیے گئے اور بعض وہ ہیں جو عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئے اور پھر فارسی سے اردو میں۔ ایسے بھی بے شمار قصے موجود ہیں جن کا بنیادی خیال عربی قصوں سے ماخوذ ہے۔ اردو کی تمام قدیم داستانیں عربی کردار، ماحول اور مقامات کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں۔ پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''اردو داستانوں کی جائے وقوع یا تو مشرق وسطی کے مقامات ہیں یا ایسے شہر جن کا وجود فرضی ہے۔'' 11

عربی داستان کی طرف ادبا و عوام کے رجحان کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ اردو میں الف لیلہ و لیلہ اور کلیلہ و دمنہ کے دسیوں ترجمے موجود ہیں۔ گیان چند جین نے صرف الف لیلہ کے سولہ ترجموں اور اس کے قصوں کے تین مجموعوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مترجم	سن اشاعت	مقام اشاعت
1	الف لیلہ اردو	شاکر علی	1803	فورٹ ولیم کالج کلکتہ
2	حکایات جلیلہ (دو جلد)	شمس الدین احمد	1836/39	چینائی (مدراس)
3	الف لیلہ (چار جلد)	عبدالکریم	1842	
4	الف لیلہ (دس جلد)	حیدر علی فیض آبادی		
5	ہزار داستان	منشی حامد علی خان	1889	مطبع نولکشور، کانپور
6	شبستان حیرت (چار جلد) 250 راتوں پر مشتمل ہے	مرزا حیرت دہلوی		
7	الف لیلہ (دو جلد)	رتن ناتھ سرشار	1901	
8	الف لیلہ و لیلہ (۷ جلد)	ڈاکٹر ابوالحسن	1940-44	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی 12

اسی طرح دیگر بہت سے ادبا نے مختلف زمانوں میں کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ یا تو براہ راست عربی سے یا فارسی ترجمہ ''انوار سہیلی'' کے واسطے سے کیا۔ان میں چند مشہور تراجم یہ ہیں:

1۔''ترجمہ انوار سہیلی'' مولف نا معلوم، یہ کام اٹھارویں صدی میں مکمل ہوا۔

2۔''محیط دانش'' منشی لالہ رام، یہ کتاب انیسویں صدی کی ابتدا میں تالیف کی گئی۔

3۔''مثنوی دانش''(منظوم ترجمہ) افروز آفاق وشہرت دہلوی۔

4۔''خرد افروز'' حفیظ الدین احمد، یہ ترجمہ 1803ء میں مکمل ہوا۔

5۔''بستان حکمت'' فقیر محمد جویا، 1836 میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

6''مثنوی کلیلہ ودمنہ''(کلیلہ ودمنہ کا منظوم ترجمہ) قدر بلگرامی۔13

سب رس کا شمار اردو کی مشہورا ور قدیم ترین داستانوں میں ہوتا ہے۔اسے ملا وجہی نے 1635-36ء میں تالیف کیا۔یہ داستان 17ویں صدی کی اردو نثر کا اہم ترین نمونہ ہے۔ملا وجہی نے کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ ان کا یہ عمل اختراعی ہے لیکن محققین نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سب رس فتاحی نیشاپوری کی تالیف ''حسن ودل'' سے ماخوذ ہے اور فتاحی کی اس کتاب کی اساس عربی قصے پر رکھی گئی ہے۔

19ویں صدی کی جن تحریروں کو شہرت عام حاصل ہوئی ان میں ''نوطرز مرصع'' بھی شامل ہے۔میر محمد عطا حسین خان تحسین نے 1775ء میں اسے تالیف کیا۔داستان کا اسلوب حد درجہ آراستہ و پیراستہ اور خوش نما ہے۔عبارتیں عربی فارسی الفاظ سے بھری ہوئی ہیں۔

داستان امیر حمزہ۔یہ ایک مسلسل قصوں پر مبنی داستان ہے جو چھیالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ بالاتفاق اردو کی طویل ترین داستان ہے۔البتہ اہل ادب کے درمیان اس کی اصل اور تاریخ میں ضرور اختلاف ہے۔درحقیقت یہ داستان الف لیلہ ولیلہ کی مانند حکایتوں اور قصوں کا مجموعہ ہے جو نسل درنسل چلے آرہے تھے جن میں کچھ ترجمہ تھے اور کچھ طبع زاد۔امان علی خان غالب لکھنوی نے اسے اردو کا قالب پہنایا اور اس میں بعد میں مزید قصوں کا اضافہ کیا گیا۔

گیان چند جین نے اس کو عربی الاصل قرار دینے سے انکار کیا ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب

''ساحری شاہی صاحب قرآنی''14 میں اس داستان کی اصل اور اس کے مصنف یا مصفین کے تئیں دسیوں احتمالات ذکر کیے ہیں جن میں اکثر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس کی اصل عربی ہی ہے۔

اردو سے عربی میں ترجمہ کردہ چند کتابیں

نام اصل کتاب	نام ترجمہ شدہ کتاب	مترجم	سن اشاعت	مقام اشاعت
دیوان حماسہ	اتقان الفراسہ	ابوالحسن قادری	16 اکتوبر 2012	مکتبہ المدینہ باب المدینہ کراچی
الحماسہ	تسہیل الدراسہ	مولوی ذوالفقار علی دیوبندی		میر محمد کتب خانہ، آرام باغ کراچی
الحماسہ	توضیح الدراسہ	ابن الحسن عباسی	ستمبر 2008	مکتبہ عمر فاروق، کراچی
باب الحماسہ	مطر السماء	محمد نور حسین قاسمی، محمد صدیق ارکانی	اکتوبر 2009	دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
دیوان حماسہ	مفتاح الفراسہ	مولانا عبدالخالق سنبھلی		ثاقب بک ڈپو دیوبند
دیوان متنبّی	دیوان المتنبی	مولانا محمد اعزاز علی		مکتبہ حقانیہ، ملتان
دیوان متنبّی	شرح اردو دیوان المتنبی	نظام الدین اسیر ادروی	5 2فروری، 1983	قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی
دیوان متنبّی	توضیح القصائد المنتخبہ	مولانا نور عالم خلیل امینی		دارالاشاعت دیوبند
دیوان متنبّی	شرح دیوان متنبّی	مفتی محمد یار خان قادری		مکتبہ جامعۃ الفرقان پاکستان
دیوان متنبّی	دیوان متنبّی	محمد امین کھوکھر، محمد یاسین قصوری		شیخ محمد بشیر اینڈ سینٹر لاہو

دیوان متنبی	شرح الدیوان فی تسہیل البیان	مولوی ذوالفقار علی دیوبندی	1311ھ	مطبع مجتبائی دہلی
سبع معلقات	التوشیحات علی السبع المعلقات	مولانا قاضی سجاد حسین		میر محمد کتب خانہ، آرام باغ کراچی
سبع معلقات	تسہیلات	مولانا محمد ناصر		مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار، لاہور
سبع معلقات	عربی ادب کے سات منظوم شاہکار السبع المعلقات	مولانا قاضی سجاد حسین		قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی
سبع معلقات	تصریحات	مولانا عتیق الرحمٰن عتیق	1432ھ	دارالکتب الدینیہ
کلیلہ ودمنہ	کلیلہ ودمنہ	مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی	2014	قبا گرافکس، حیدرآباد
کلیلہ ودمنہ	دلچسپ وسبق آموز کہانیاں	مونالا خورشید انور ندوی مدنی		مکتبہ خورشید مدنی
کلیلہ ودمنہ	کلیلہ ودمنہ	ارشد رازی	2018	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
مختارات	انوارات	مولانا خالد محمود	2005	دارالقلم، لاہور
مختارات الادب	لمعات الذہب	عتیق الرحمٰن سیف	1426ھ	ایچ۔ایم۔سعید کمپنی، کراچی
مختارات الادب	مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب	مولانا ابو اسامہ عبد الرحمٰن		مکتبہ امدادیہ، ملتان
مقامات	افاضات شرح مقامات	مولانا محمد افتخار علی	2004	کتب خانہ مجیدیہ، ملتان

مقامات	الکمالات الوحیدیہ شرح مقامات حریریہ	مولانا وحید الزماں کیرانوی		مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ، اردو بازار کراچی
مقامات	المرآۃ لکشف معانی المقامات	مولانا محمد اعزاز علی	1999	مکتبہ شاہ ولی اللہ، اکوڑہ خٹک
مقامات	تشریحات	مولوی محمد نور حسین	جون 2011	دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
مقامات	تیسیر مقامات	مفتی عبد الغفور	اکتوبر 2008	مکتبہ دار القلم، کراچی
مقامات	درس مقامات	ابن الحسن عباسی	2009	مکتبہ فاروقیہ، کراچی
مقامات	دروس مقامات	مولانا صادق الامین عزیزی		مکتبہ الاسلام، کراچی
نفحۃ العرب	اشرف الادب	مولانا عبد الحفیظ		قدیمی کتب خانہ، آرام باغ، کراچی
نفحۃ العرب	تحفۃ الادب	مولانا محمد حنیف گنگوہی	1997	دار الاشاعت، اردو بازار کراچی
نفحۃ العرب	تکمیل الادب	مولانا مصلح الدین قاسمی		مکتبہ رحمانیہ، اردو بازار کراچی
الوعد الحق (طٰہٰ حسین)	خدائی وعدہ	معراج محمد بارق		سید حامد لائبریری
الطریق الی المدینہ	کاروان مدینہ	ابو الحسن علی ندوی	2009	مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ
خمس دقائق وحسب	صرف پانچ منٹ	میمونہ حمزہ	2014	منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز نئی دہلی

قطط وفیران	رشتوں کے رنگ (عربی کا ایک شاہکار ڈرامہ)	ڈاکٹر عبید الرحمٰن طیب	2012	البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی
دیوان علی	دیوان حضرت علی	ناشر مصطفیٰ وحید	1995	لاہور
دیوان علی	دیوان حضرت علی	طاہر الاسلام قاسمی	2007	دار المعارف دیوبند
دیوان امام شافعی	دیوان الامام الشافعی	عبداللہ کاپودروی		جامعہ علوم القرآن جمبوسر، گجرات
دیوان امام شافعی	دیوان امام شافعی	طاہر الاسلام قاسمی	2008	دار المعارف دیوبند
	منتخب عربی اشعار	محمد رفیق	2014	مکتبہ قرآنیات لاہور

عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ کتابوں کی فہرست انتہائی طویل ہوسکتی ہے۔تلاش وجستجو سے یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جائے۔

سید احتشام حسین عربی سے اردو میں مختصر افسانوں کے تراجم کے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''عربی سے ترجمے ہوئے ہیں وہ حال ہی میں ہوئے ہیں۔عربی مصنفوں میں مصطفیٰ لطفی منفلوطی اور خلیل جبران کے ناولوں اور افسانوں کے متعدد ترجمے اردو میں موجود ہیں ''سرخ کتاب'' کے نام سے ضیاء الحسن نے چند عربی افسانوں کا ترجمہ حال ہی میں کیا ہے۔'' 15

عربی سے اردو میں جو تراجم ہوئے ان کی دستیابی بھی ایک مشکل مرحلہ ہے۔بہت سے تراجم پاکستان میں ہوئے جن کے متعلق معلومات کم دستیاب ہیں اور جن تراجم کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں تو ان کی دستیابی نہ ہوسکی۔

ترجمے کے متعلق نظریات

ترجمے کا وجود اسی وقت سے قائم ہے جب سے دنیا میں دو زبانوں کا وجود ہوا۔ ترجمے کا عمل ہر دور میں جاری و ساری رہا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کی اہمیت و ضرورت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ یونانی افکار و فلسفے سے روم میں استفادہ کیا گیا۔ عربوں نے یونان و ہندوستان کے اندر موجود علوم کو اپنی زبان کا پیکر دیا۔ پھر یورپی نشاۃ ثانیہ میں عربی زبان میں موجود علوم کو یورپی زبانوں میں بڑے پیمانے پر منتقل کیا گیا۔

ترجمے کے عمل کے ساتھ ترجمے کے اصول و ضوابط پر لوگوں نے ابتدا سے ہی غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے نقوش ہمیں قبل مسیح میں ہی ملتے ہیں۔ 108 قبل مسیح میں رومی مترجم سیسرو اور ہوریس کی تحریریں اس کے اولین نقوش ہیں۔ اس کے بعد کے زمانے میں سینٹ جیروم (420-347 عیسوی) نے بائبل کے تراجم کے ذیل میں اس سلسلے میں کچھ گفتگو کی ہے۔ دور عباسی میں عربی میں ترجمے کی تحریک کے دوران بھی ترجمے کے نظریات پر ضرور کام ہوا ہوگا جس کو تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ بعد کے ادوار میں مترجمین نے چیدہ چیدہ اپنے تراجم میں ترجمے کے متعلق لکھا ہے مثلاً شاہ ولی اللہ نے اپنے ترجمہ قرآن میں ترجمے کے حوالے سے مفصل گفتگو کی ہے۔ بعد کے ادوار میں خصوصاً سولھویں صدی جب یورپ میں ترجمے کی روایت کا آغاز ہوا تو ترجمے کے نظریات پوری طرح موضوع گفتگو بنے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج کے دور میں ترجمہ باضابطہ ایک فن اور شعبہ علم کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ترجمے کے موضوع پر سینکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں دنیا کی مختلف زبانوں میں دستیاب ہیں۔

اردو زبان میں ترجمے کی روایت نہایت قدیم ہے۔ ابتدا میں زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی کتابوں کے ترجمے کیے گئے لیکن بعد میں خصوصاً انیسویں و بیسویں صدی میں علوم و فنون اور ادب کی بے شمار کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔ ترجمے کی اس مضبوط روایت کے باوجود نظریات ترجمے کے حوالے سے اردو کا دامن نہایت تنگ ہے۔ اردو کے مختلف رسائل و جرائد میں ترجمے کے مسائل اور اردو میں ترجمے کی تاریخ پر مضامین شائع ہوئے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران کچھ مضامین کے مجموعے شائع ہوئے اور کچھ طبع زاد کتابیں بھی اس موضوع پر لکھی گئیں؛ لیکن یہ کوششیں ضرورت اور تقاضے سے بہت کم ہیں۔ ابھی تک ترجمے کے نظریات کو اردو

میں وہ اہمیت نہیں مل سکی ہے جو انگریزی و دیگر یورپی زبانوں میں حاصل ہو چکی ہے۔

بے شمار کتابوں کے ترجمے کیے گئے لیکن مترجمین نے ترجمے کے متعلق بہت خال خال ہی گفتگو کی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ترجمے کی خصوصیت کی طرف سرسری ایک دو جملوں میں اشارہ کر دیا گیا۔ اس جانب توجہ نہیں دی گئی کہ کتاب کے ترجمے کے دوران کیا مشکلات پیش آئیں، کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا یا ترجمہ کرتے وقت کن اصولوں کو مدنظر رکھا گیا۔ اکثر و بیشتر ترجمہ کردہ کتابیں ایسی ہیں جن میں ترجمے کے نظریے اور اس کے اصول وضوابط اور مسائل کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا گیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ترجمے کی کیفیت ونوعیت پر چند جملوں میں تبصرہ کر دیا جاتا ہے۔ جن مترجمین نے عربی کتابوں کو اردو زبان میں منتقل ان کے یہاں بھی یہی رویہ پایا جاتا ہے۔

صادق الامین عزیزی نے عربی کی مشہور کتاب مقامات حریری کے ابتدائی مقامات کا ترجمہ دروس مقامات کے عنوان سے کیا۔ انہوں نے عرض مولف کے تحت ترجمے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ ذکر کیا ہے:

> ''عربی الفاظ کے دائرے میں رہتے ہوئے سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ترجمہ سے زائد الفاظ کو ہلالین میں کر دیا گیا ہے۔'' 16

کتاب سے ایک ترجمہ ملاحظہ ہو:

> ''حارث بن ہمام کہتا ہے، میں اپنی شخصیت کو چھپاتے ہوئے اس کے پیچھے چلا، اور اس کے نشان قدم پر اس طرح چلا کہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے، یہاں تک کہ وہ ایک غار پر پہنچ گیا، سو چپکے سے اس میں داخل ہوا، میں نے اس کو مہلت دی اتنی دیر کہ وہ جوتیاں اتار کر پاؤں دھولے، پھر اچانک اس پر جا دھمکا، سو میں نے اس کو پایا ایک شاگرد کے پاس بیٹھا ہوا، میدے کی روٹی (چپاتی) اور بکرے کے بھنے ہوئے گوشت پر، ان دونوں کے سامنے شراب کا مٹکا رکھا ہوا ہے، سو میں نے اس کو کہا، ارے او! وہ تیرا ظاہر تھا اور یہ تیرا باطن ہے، یہ سن کر اس نے ایک گرم لمبی سانس لی اور قریب تھا کہ غصہ سے پھٹ جائے۔'' 17

مترجم نے ترجمے میں کہیں لفظ کی رعایت کی ہے اور کہیں محاورے کی۔ ترجمہ قدرے سلیس ضرور ہے۔لیکن مترجم کا یہ دعوی قابل تردد ہے کہ ہے لفظ کی رعایت کرتے ہوئے بامحاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ اگر لفظ کی رعایت برتی جائے تو محاورہ پر زد پڑے گی اور اگر محاورہ کو ملحوظ رکھا جائے تو کہیں نہ کہیں لفظ کا دامن ہاتھ سے چھوٹے گا۔

مقامات حریری کی ہی ایک شرح الکمالات الوحیدیہ کے عنوان سے مولانا وحید الزماں قاسمی کے افادات پر مشتمل ہے جسے مولانا جمشید احمد نے ترتیب دیا ہے۔ کتاب کی خصوصیات کے تحت اس کے ترجمے کی بابت لکھا گیا ہے:

> ''ترجمہ سلیس اور بامحاورہ کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ الفاظ سے قریب تر رہے۔ ترجمہ کرتے وقت ترکیب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی عبارت یا لفظ محذوف ہے تو بین القوسین اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔'' 18؎

ایک ترجمہ بطور مثال ملاحظہ فرمائیں:

> ''پس اشارہ کیا اس شخص (والی بصرہ) نے کہ جس کا اشارہ کرنا حکم (کی حیثیت رکھتا) ہے اور جس کی فرمانبرداری نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اس بات کی طرف کہ میں چند ایسے مقامے تحریر کروں، جن میں بدیع الزماں کے طرز پر چلوں؛ اگر چہ لنگڑا بیل طاقتور گھوڑے کی رفتار کو نہیں پہنچ سکا ہے۔'' 19؎

مترجم نے ترجمے کے اندر محاورہ سے کہیں زیادہ الفاظ کی رعایت برتی ہے۔ جملے کی ترکیب اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ ترجمے کی تشریح کے لیے واوین کا استعمال کیا گیا ہے۔

ابن الحسن عباسی نے مقامات حریری کے دس مقاموں کی شرح کی ہے جس میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ وہ کتاب کے پیش لفظ میں ترجمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ لفظی کیا گیا ہے اور کوشش یہی کی گئی ہے کہ ترجمہ خوبصورت بھی ہو اور لفظی وعام فہم بھی۔'' 20؎

ترجمہ بھی ملاحظہ ہو:

''میں نے اس مقام سے معافی چاہی جہاں انسان کی فہم حیران ہو جاتی ہے، وہم بڑھ جاتا ہے اور عقل کی گہرائی جانچی جاتی ہے، آدمی کی قیمت فضیلت میں ظاہر ہو جاتی ہے (کہ کتنے پانی میں ہے) اور صاحب تصنیف اس بات کی طرف مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ رات کی لکڑیاں چننے والے کی طرح یا پیادہ اور سواروں کو کھینچنے والے کی طرح ہو جائے (کہ پیادہ اور سوار کو کھینچنے والا بڑی مشقت میں ہوتا ہے کیوں کہ ایک کی رفتار تیز ہوتی ہے اور دوسرے کی سست) اور ایسا بہت کم ہوا ہے کہ زیادہ بولنے والا محفوظ رہا ہو یا اس کی لغزش معاف کر دی گئی ہو۔'' 21؎

مترجم نے اپنے تبصرے میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ترجمہ لفظی کیا گیا ہے لیکن ترجمے کو ملاحظہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ لفظی کے بجائے بامحاورہ ہے۔ علاوہ ازیں قوسین کا استعمال کرتے ہوئے طویل تشریح کی گئی ہے۔ یہ تشریحات دراصل ترجمے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نیز جو تشریح کی گئی ہے وہ ترجمہ کے بجائے ترجمے کی وضاحت اور شرح کا درجہ رکھتی ہے۔

مفتی عبدالغفور نے مقامات کا ترجمہ تیسیر مقامات کے عنوان سے کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر ہی ترجمے کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے:

''بامحاورہ، عام فہم اور سلیس ترجمہ۔'' 22؎

ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''دنیا کے طلب کرنے والے کے لیے ہلاکت ہو کہ اس نے اپنی توجہ اس کی طرف پھیر دی۔ دنیا کے ساتھ زیادتی محبت و عشق کی وجہ سے افاقہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر وہ جان لیتا تو کافی تھا اس کے لیے بچا ہوا اس چیز کا جس کا وہ ارادہ کرتا ہے پھر اس نے اپنے پھیلے ہوئے غبار کو سمیٹ لیا اور اپنے لعاب کو خشک کیا، اپنے مشکیزے کو کندھے پر رکھ لیا اور لکڑی بغل میں لے لی۔'' 23؎

ترجمے کو ملاحظہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ترجمے کے متعلق بامحاورہ اور سلیس ہونے کی جو

بات کہی گئی تھی وہ پوری طرح درست نہیں ہے۔ترجمے میں عربی عبارت کی ترکیب کوملحوظ رکھا گیا ہے۔'' دنیا کے ساتھ زیادتی محبت وعشق''اس جملے میں زیادتی محبت وعشق کے بجائے 'عشق ومحبت کی زیادتی' زیادہ سلیس ہوسکتا ہے۔نیز 'افاقہ حاصل نہیں کرسکتا' عام فہم بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

مقامات حریری کی ایک شرح تشریحات کے نام سے محمد نور حسین قاسمی نے کی ہے۔مولانا نورالبشر محمد نورالحق صاحب کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کتاب کی خصوصیات کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''بامحاورہ ایسا ترجمہ جو الفاظ اور جملوں سے قریب تر ہو۔'' 24

ایک ترجمہ پیش ہے:

"و حَصحَصَ لَكَ الحَقُّ فتَمَارَيتَ وَا ذكَرَكَ المَوتُ فَتَنَاسَيتَ وَ اَمكَنَكَ اَن تُوَاسِيَ فَمَا آسَيتَ۔"

''اور بار بار ظاہر ہوا تیرے لیے حق۔پس تو نے جان بوجھ کر شک کیا۔اور بہت دفع موت نے تجھے اپنی یاد دلائی۔پس تو نے بہ تکلف اس کو بھلا دیا (بھول گیا)۔ اور بسا اوقات قدرت دی تجھ کو زمانے نے غم خواری کی پس تو نے غم خواری نہیں کی۔''25

ترجمہ بامحاورہ ہونے کا دعویٰ قدرے کمزور نظر آتا ہے۔اسی طرح عربی الفاظ اور جملوں میں اضافے سے کام لیا گیا ہے۔جیسے 'اور بہت دفع موت نے تجھے اپنی یاد دلائی' عربی لفظ میں 'بہت دفع' موجود نہیں ہے۔اسی طرح 'اپنی' کے لیے ضمیر بھی موجود نہیں ہے۔

مختارات کو عربی ادب میں کافی اہم مقام حاصل ہے۔کتاب ابوالحسن ندویؒ نے مرتب کی ہے جس میں مختلف ادباء کی شاہکار تحریروں کو شامل کیا گیا ہے۔اس کتاب کے کئی ترجمے منظر عام پر آئے۔انہیں تراجم میں ایک ترجمہ انوارات کے نام سے خالد محمود صاحب مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور نے کیا ہے۔اس کتاب میں متن شامل نہیں کیا گیا ہے۔

کتاب کی ابتدا میں عرض مترجم کے تحت خالد محمود صاحب ترجمے کے متعلق رقم طراز ہیں:

''احقر نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے میں عموماً سلاست کے ساتھ اس کو بامحاورہ کرنے کا اہتمام رکھا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ طالب علم کو ہر لفظ کا حقیقی معنی معلوم ہو جائے۔'' 26ؔ

ترجمہ کی مثال پیش ہے:

''اشعب بیان کرتا ہے: عامر بن لؤی کی اولاد میں سے ایک آدمی مدینہ کا حاکم بنا، وہ لوگوں میں سب سے زیادہ بخیل اور منحوس تھا، اور اللہ نے اس کو میری طرف راغب کر دیا، وہ دن رات مجھے ڈھونڈتا پس اگر میں اس سے بھاگتا تو مجھ پر پولیس کا متولی دھاوا بول دیتا، اور اگر میں کسی جگہ پر ہوتا تو وہ اس کے پاس کسی کو بھیج دیتا جس کے ساتھ یا جس کے پاس میں ہوتا اور وہ مجھے اس سے طلب کرتا، پھر مجھ سے مطالبہ کرتا کہ میں اس کو بیان کروں اور یہ کہ میں اس کو ہنساؤں۔'' 27ؔ

کتاب کے ترجمے کے مختلف حصوں کو دیکھنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مترجم نے بعض مقامات پر واقعتاً نہایت سلیس ترجمہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

''حضرت ابوسعید الخدریؓ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ نے وہ بڑے بڑے عطیے قریش کو اور عرب کے قبیلوں کو دیے اور انصار کو ان میں سے کچھ نہ ملا تو انصار کا یہ قبیلہ اتنا ملول خاطر ہوا کہ ان میں (اس کے متعلق) چہ میگوئیاں بہت زیادہ ہونے لگیں۔ ان میں سے کسی کہنے والے نے یہاں تک کہہ دیا کہ خدا کی قسم! اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی قوم کا خیال کیا ہے۔'' 28ؔ

لیکن سابقہ پیراگراف میں یہ سلاست نظر نہیں آتی۔ اس کی ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اصل متن میں عبارت جس قدر واضح غیر مبہم ہو گی ترجمہ بھی اتنا واضح اور سلیس ہوگا۔ نیز اس پیراگراف میں محاورہ کی رعایت مکمل طور پر نہیں برتی گئی ہے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مترجم کے قول میں بھی تضاد معلوم ہوتا ہے کہ جب ہر لفظ کے حقیقی معنی کو لحاظ رکھا جائے تو پھر ترجمہ کا بامحاورہ اور سلیس ہونا کس قدر ممکن ہے۔

ابواسامہ عبدالرحمٰن نے مختارات کا ترجمہ ''مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب'' کے عنوان سے کیا ہے۔اس کتاب میں ترجمے کے ساتھ لغوی ونحوی تحقیق وتشریح بھی شامل ہے۔کتاب میں ملحوظ کردہ باتوں میں مترجم نے ترجمے کے حوالے سے یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

''ترجمہ نہ ایسا بامحاورہ کہ حل متن نہ ہو اور نہ ایسا لفظی کہ فہم عبارت میں دشواری ہو۔'' 29؎

مترجم نے ترجمے کے حوالے سے کافی محتاط اور معتدل خیال کا اظہار کیا ہے۔ترجمے کی روشنی میں اس پرغور کیا جاسکتا ہے۔

''اشعب نے بیان کیا اس نے کہا عامر بن لؤی کی اولاد میں سے ایک شخص مدینہ کا والی بنایا گیا اور وہ لوگوں میں سے بخیل ترین اور سخت ترین تھا۔اور اس کو اللہ نے مجھ پر مسلط کر دیا۔وہ رات دن مجھے بلاتا رہتا۔اگر میں اس سے بھاگتا تو اچانک پولیس کے ساتھ میرے گھر پہنچ جاتا اور اگر میں کسی جگہ میں ہوتا تو اس شخص کی طرف آدمی بھیجتا جس کے ساتھ میں ہوتا یا جس کے پاس میں ہوتا۔اس سے مجھے طلب کرتا پھر مجھ سے مطالبہ کرتا کہ میں اس کو باتیں سناؤں اور اس کو ہنساؤں۔''30؎

اس ترجمے اور خالد محمود کے ترجمے میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔لفظوں کی ترکیب،کمی وبیشی کے ساتھ مفہوم میں بھی فرق موجود ہے۔خالد محمود نے ترجمہ کیا ہے'وہ دن رات مجھے ڈھونڈتا' جب کہ ابواسامہ کے ترجمے میں'وہ رات اور دن مجھے بلاتا رہتا' ہے۔اسی طرح خالد محمود کے ترجمے میں'پولیس کا متولی دھاوا بول دیتا' ترجمہ کیا گیا جب کہ ابواسامہ نے جو ترجمہ کیا ہے اس میں'اچانک پولیس کے ساتھ میرے گھر پہنچ جاتا' ترجمہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ محاورے کی سطح پر دیکھا جائے تو'باتیں سنانا' استعمال کیا گیا ہے حالاں کہ اردو میں'باتیں سنانے' کا محاورہ بالکل الگ معنوں میں کسی کو کھری کھوٹی کہنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

مختارات کا ہی ایک ترجمہ ''لمعات الذہب فی شرح مختارات الادب'' کے عنوان سے عتیق الرحمٰن

سیف نے کیا ہے۔اس کتاب میں ترجمے کے ساتھ ساتھ تشریح ،حل لغات اور تاریخ کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔مترجم نے ترجمے کے حوالے سے کہا ہے:

''بندہ نے ترجمہ کرتے ہوئے اگر چہ انتہائی کوشش کی ہے کہ عبارت اور ترجمے میں کوئی کمی نہ رہ جائے لیکن انسان پھر بھی انسان ہے اور اس سے غلطی کا نہ ہونا بہت بعید ہے۔'' 31

گویا اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ترجمے میں اصل عبارت کے ساتھ مکمل مماثلت بہت بعید ہے۔اصل متن اور ہدفی متن دونوں کا یکساں ہونا دشوار تر ہے۔

مذکورہ دونوں ترجمے جس عربی پیراگراف سے نقل کیے گئے ہیں اسی سے یہ ترجمہ بھی ملاحظہ ہو:

''اشعب نے بتلایا کہ عامر بن لؤی کے خاندان میں سے ایک شخص کو مدینہ منورہ کا والی بنایا گیا جو کہ بڑا بخیل اور تنگدست تھا،اللہ نے اس کو مجھ پر فریفتہ کر دیا تھا، ہر وقت مجھے بلاتا تھا۔اگر میں کسی وقت بھاگ جاتا تو پولیس لیکر میرے گھر پہنچ جاتا اور اگر میں کسی اور جگہ ہوتا تو جس کے ساتھ یا جس کے پاس ہوتا وہاں کسی کو بھیج دیتا جو اس سے میرا مطالبہ کرتا۔پھر والی مدینہ مجھ سے کہتا کہ میں اس کے ساتھ گپ شپ اور ہنسی مذاق کروں۔'' 32

گزشتہ دونوں ترجموں کے مقابلے میں یہ ترجمہ زیادہ رواں اور سلیس ہے۔لیکن تینوں ترجموں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو کئی طرح کے فرق نظر آئیں گے۔پہلے ترجمے میں 'منحوس' دوسرے میں 'سخت ترین' اور تیسرے میں 'تنگدست' ترجمہ کیا گیا ہے۔گویا ایک ہی عربی لفظ کے تین ترجمے کیے گئے۔حیرت کی بات ہے کہ یہ تینوں لفظ متبادل نہیں ہیں بلکہ الگ الگ معنی کے حامل ہیں۔اسی طرح ''اَغـرَاهُ اللّٰه بِی '' کا ترجمہ بالترتیب 'اور اللہ نے اس کو میری طرف راغب کر دیا'، 'اور اس کو اللہ نے مجھ پر مسلط کر دیا' اور 'اللہ نے اس کو مجھ پر فریفتہ کر دیا تھا' کیا گیا ہے۔راغب اور فریفتہ میں کسی طرح مناسب تلاش کی جاسکتی ہے لیکن مسلط کے ساتھ کس طرح تطبیق دی جاسکتی ہے؟ تینوں ترجموں میں اس طرح کے کئی فرق ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ان

تراجم میں موجود فرق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ خواہ متن ایک ہو لیکن مترجم کی تبدیلی سے ترجمہ شدہ متن میں اختلاف پایا جانا لازم ہے۔ ہر فرد کی فکری و ذہنی ساخت مختلف ہوتی ہے جس کا اثر ترجمے میں نظر آتا ہے۔ اصل متن کا ابلاغ و ترسیل اور متبادلات کی تلاش پر شخصیت کی تبدیلی حتمی طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔

کلیلہ و دمنہ کو عربی ادب میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر سنسکرت میں لکھی گئی کتاب پنچ تنتر کے قصوں پر مشتمل ہے۔ کسریٰ نوشیرواں نے اس کا ترجمہ ماہر طبیب برزویہ سے پہلوی زبان میں کروایا۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ابوالمعالی نصر اللہ اور حسین واعظ کاشفی نے کیا۔ عربی زبان میں اس کا ترجمہ عباسی دور کے فارسی نژاد نامور ادیب و انشا پرداز عبداللہ ابن المقفع (142-106 ھ) نے پہلوی زبان سے کیا۔ بعد کے ادوار میں دنیا کی کئی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے۔

اردو زبان میں کلیلہ و دمنہ کے ہی نام سے رفیع الدین حنیف قاسمی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس کتاب پر خالد سیف اللہ رحمانی نے پیش لفظ لکھا۔ انہوں نے اپنے پیش لفظ میں ترجمے کے حوالے گفتگو کرتے ہوئے جاحظ کے اس نظریے کو نقل کیا ہے کہ مترجم کا فکری افق مصنف کے قریب ہونا چاہیے نیز مترجم کو اصل اور ہدفی دونوں زبانوں پر دسترس ہونی چاہیے۔ بعد ازاں وہ ترجمہ شدہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ابن مقفع کے ادبی شہ پاروں کو اردو کا قالب دینے میں مترجم نے بڑی کوشش
> کی ہے، ترجمے میں امکانی حد تک سلاست و روانی پیدا کرنے کی سعی کی گئی ہے؛
> لیکن ظاہر ہے کہ دوسری زبان میں ادب کا وہی معیار برقرار رکھنا جو اس کتاب
> میں ہے جس سے ترجمہ کیا جا رہا ہے، بڑی دقت نظر اور مزاولت کا طالب ہے۔''

33

اس اقتباس میں ادب کے ترجمے کی مشکلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ عندیہ دیا گیا ہے کہ اصل زبان میں موجود ادب ہدفی زبان میں منتقل ہو کر اسی حیثیت پر قائم رہے یہ انتہائی دشوار کام ہے۔ اس کی بنیادی وجہ دونوں زبان اور زبان سے ملحق تمام عناصر و عوامل کا اختلاف ہے۔ یہ اختلاف لسانی قربت کی حامل دو زبانوں میں بھی موجود ہوتا ہے اور یہی اختلاف مترجم کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ پھر مترجم کا فکری افق مصنف

سے کتنا بھی قریب ہو جائے مصنف سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہوسکتا ہے۔آخر دونوں کی شخصیت وشناخت جدا ہے۔

کتاب سے ایک پیراگراف ملاحظہ ہو:

> ''کلیلہ نے کہا: مجھے تمہاری بات معلوم ہوئی،تم اپنی عقل سے رجوع کرو(یعنی دوبارہ غور وفکر کرو)اور دیکھو ہر انسان کا ایک مقام ومرتبہ ہوتا ہے،اگر وہ شخص اس مرتبے میں جس پر وہ فائز ہے،اپنے طبقے کے لوگوں میں اچھی حالت میں ہوتا ہے تو وہ اپنی اس حالت پر اکتفا کرسکتا ہے،جس مقام ومرتبہ پر ہم فائز ہیں، ہماری موجودہ حالت سے وہ کمتر نہیں ہے۔'' 34

ترجمے میں وہ سلاست وروانی کہیں نظر نہیں آتی جو اصل کتاب میں پائی جاتی ہے۔عربی میں بڑے ہی سلیس انداز میں چھوٹے چھوٹے زبان زد ہو جانے والے جملوں میں بات کہی گئی ہے۔جب کہ ترجمہ میں جملہ طویل ہونے کے ساتھ گنجلک بھی معلوم ہوتا ہے۔دوزبانوں میں موجود لہجوں اور طرز بیان کا فرق اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔مترجم کی انتہائی کوشش بھی اس وقت بے کار ہو جاتی ہے جب اسے اصل زبان کا اسلوب اظہار ہدفی زبان میں میسر نہیں ہوتا۔

التوشیحات علی السبع المعلقات کے عنواں سے قاضی سجاد حسین نے سبع معلقات کی شرح کی ہے۔اس کتاب پر علامہ سید حسین مدنیؒ نے تقریظ ضبط تحریر کی ہے۔وہ اپنی تقریظ میں ترجمے کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ''اردو میں ترجمہ ومطلب کے لیے شستہ زبان استعمال کی ہے اور اس خوبی سے کہ شعر کا کوئی لفظ تشنۂ ترجمہ وتوضیح نہیں رہا۔'' 35

اس تبصرہ میں ترجمے کی نوعیت کے متعلق ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ترجمہ کس قدر واضح ہوسکتا ہے؟ واضح ترین ترجمہ سے کیا مراد ہے؟ نیز ترجمہ میں جب کوئی لفظ تشنۂ ترجمہ وتوضیح نہ ہو تو اس کو ترجمہ ہی کہیں گے یا شرح؟ ترجمے کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ بہت تفصیل وتشریح کے ساتھ کیا گیا ہے۔لفظ کے متبادل پیش کرنے کے بجائے مفہوم کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

دیوان حماسہ عربی کی مشہور و معروف کتاب ہے۔ یہ درحقیقت تیسری صدی ہجری کے مشہور شاعر ابو تمّام حبیب بن اوس کے مرتب کردہ اس دیوان کا نام ہے جس میں انہوں نے شعرائے عرب کے کلام کو کھنگالنے کے بعد مختلف اصناف سخن کو جمع کیا ہے۔ان کے منتخب کردہ اس مجموعہ کی لغوی افادیت پر عرب کے قدیم وجدید تمام ادباء متفق ہیں۔ابوتمّام کا یہ انتخاب زیادہ تر دور جاہلیت کے کلام پر مشتمل ہے۔شعروادب کی دنیا میں اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی عربی زبان میں تقریبا پینتیس شرحیں لکھی گئی ہیں۔36 یہ کتاب طویل عرصے سے مدارس میں داخل نصاب ہے۔ اردو زبان میں اس کے کئی ترجمے منظر عام پر آچکے ہیں۔

حماسہ کا ایک ترجمہ محمد نور حسین قاسمی اور محمد صدیق ارکانی نے کیا ہے۔ دراصل یہ شرح ہے جس میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ترجمے کے حوالے سرورق پر یہ درج ہے:

''ہر شعر کا عام فہم اور سلیس اردو ترجمہ۔'' 37

ابتدائی دو اشعار کا ترجمہ بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

'' کاش! اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو گری پڑی عورت کے بچے یعنی ذہل بن شیبان، میرے اونٹوں کو مباح نہ سمجھتے۔ (یعنی غصب کر کے نہ لے جاتے)۔(اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا) تو اس وقت میری مدد کے لیے ایک کھر دری بہادر جماعت کھڑی ہو جاتی، غصہ وحفاظت کے وقت اگر ضعیف و کمزور آدمی بھی نرم ہو جائے پھر بھی یہ (جماعت) مضبوط و کھر دری رہتی ہے۔'' 38

ترجمہ کو ملاحظہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ عام فہم بھی ہے اور سلیس بھی۔ مفہوم کو مزید واضح کرنے کے لیے قوسین کا سہارا لیا گیا ہے۔لفظی پابندی کے بجائے بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے۔ دونوں شعروں میں ربط پیدا کرنے کے لیے ایک جملے 'اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا' کا قوسین میں اضافہ کیا گیا ہے۔ ابتدا میں لفظ 'کاش' مذکور ہے جو کہ متن میں اضافہ ہے۔

اسی طرح حماسہ کی ایک شرح مع ترجمہ ابن الحسن عباسی نے توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ کے نام

سے ترتیب دی ہے۔ کتاب کے اندر ابتدائیہ کے تحت مولانا سلیم اللہ خان نے ترجمے کے حوالے سے عرض کیا ہے:

''ترجمہ سلیس، رواں، دل نشین اور نفیس و خوبصورت اردو میں کیا ہے۔''39

ابن الحسن عباسی نے پیش لفظ میں اس ترجمے کی ضرورت کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے حماسہ کی ایک شرح شیخ الہندؒ کے والد مولانا ذوالفقار علیؒ نے ''تسہیل الدراسہ'' کے نام سے لکھی تھی۔ یہ شرح دراصل عربی زبان میں تھی البتہ اشعار کے ترجمے اردو میں کیے گئے تھے۔ وہ اس ترجمے کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان کے ترجمے کی زبان بھی سو سال پرانی زبان ہے جس کے بہت سے الفاظ متروک ہو چکے ہیں، اس لیے طلباء اس سے کما حقہ استفادہ نہیں کر سکتے ہیں۔''40

ہر زبان میں عہد بہ عہد تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ بالخصوص الفاظ کی سطح پر کافی تبدیلی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ہر زمانے میں زبان میں کچھ خاص الفاظ رائج ہوتے ہیں پھر مرور ایام کے ساتھ ان کا چلن کم ہو جاتا ہے اور ان کی جگہ نئے الفاظ لے لیتے ہیں۔ حالات، صورت حال، اشیا استعمال اور طرز فکر ہر چیز میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ پرانی چیزیں ختم ہوتی جاتی ہیں تو ان کے ساتھ وابستہ الفاظ بھی متروک ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ نئی تحریروں اور پرانی تحروں کو از سر نو ترتیب و تدوین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح قدیم کتابوں کی شروحات لکھنے کی حاجت ہوتی ہے۔ یہی حال ترجمے کا بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ہی کتاب کے کئی ترجمے کیے جاتے ہیں۔ نیا ترجمہ پرانے ترجمے کے مقابلے میں کئی سطح پر مختلف ہوتا ہے۔ زبان کی تبدیلی کے ساتھ لہجہ و اسلوب بھی بدل جاتا ہے۔ پیش کش کا طرز جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ابن الحسن عباسی ترجمے کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ترجمہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خوبصورت ہو تو لفظی نہیں ہوگا لفظی ہو تو خوبصورت نہیں ہوگا۔ میں نے سابقہ ترجمے پر نظر ثانی کی اور کوشش کی کہ لفظوں کے قریب اور سلیس ہو۔ مجمل مفہوم کی تصریح کے لیے دوران ترجمہ قوسین میں مطلب کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔''41

مترجم نے ترجمے کی ایک اہم مشکل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مترجم کس بات کو ملحوظ رکھے۔کیا وہ لفظ کی جگہ لفظ رکھتا چلا جائے یا لفظ کے دائرے سے باہر آ کر مفہوم کو سمیٹنے کی کوشش کرے۔ درحقیقت مترجم کو معتدل اور درمیانہ راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ صرف لفظ کی پابندی کرے گا تو مفہوم گھٹ کر رہ جائے اور اگر صرف مفہوم کی طرف توجہ کرے گا تو لفظوں کی صنعت گری کو ظاہر کرنے سے محروم ہو جائے گا۔ دونوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرتا ہے تو ہدفی متن کے قاری کے ساتھ انصاف نہیں کرسکتا۔ مترجم نے اس مسئلے کے حل کے لیے ایک راہ یہ نکالی ہے کہ مجمل مفہوم کی تصریح کے لیے قوسین کا سہارا لیا ہے۔ یہ سہارا بھی دراصل ترجمے میں اضافے کی ہی حیثیت رکھتا ہے گو کہ ناگزیر ہوتا ہے۔ دو اشعار کے ترجمے بطور مثال ملاحظہ ہوں:

> ''اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو گری پڑی عورت کی اولاد یعنی ذہل بن شیبان میرے اونٹوں کو مباح نہ سمجھتے۔ اس وقت میری مدد کے لیے ایسی قوم کھڑی ہو جاتی جو حمیت کے وقت کھر دری ہے اگر کمزور آدمی نرم پڑ جائے (تو وہ سختی سے پیش آتے ہیں اور اپنی عزت کی حفاظت میں کسی قسم کی نرمی سے کام نہیں لیتے ہیں)۔''42

ترجمہ واضح ضرور ہے لیکن محمد نور حسین قاسمی کا ترجمہ اس کے مقابلے میں زیادہ واضح اور رواں ہے۔ نیز مفہوم کی توضیح کے لیے قوسین میں ہی صحیح کافی طویل جملے کا اضافہ کیا گیا ہے جو بجائے ترجمہ تشریح معلوم ہوتا ہے۔ پہلے شعر سے ربط پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ محمد نور حسین نے دوسرے شعر کے ترجمے میں 'تو اس وقت میری مدد کے لیے ایک کھر دری بہادر جماعت کھڑی ہو جاتی' استعمال کیا ہے جب کہ ابن الحسن عباسی کا ترجمہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں کہا گیا ہے 'اس وقت میری مدد کے لیے ایسی قوم کھڑی ہو جاتی جو حمیت کے وقت کھر دری ہے'۔ اس ترجمے میں حمیت کا لفظ استعمال ہوا ہے جب کہ سابقہ ترجمے میں 'غصہ و حفاظت کے لیے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس طرح دونوں ترجموں میں فرق ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو ترجمے تغیر وتبدل کی ایک مثال ہے۔

حماسہ کی ایک شرح اتقان الفراسہ فی شرح دیوان الحماسہ کے عنوان سے مجلس المدینۃ العلمیہ (دعوت

اسلامی) کی جانب سے شائع کی گئی۔اس شرح کی خصوصیات کے تحت ذکر کیا گیا ہے:

''اشعار کا سلیس و مفہوم خیز ترجمہ۔''43

بطور نمونہ دو اشعار کے ترجمے ملاحظہ ہوں:

''اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو مجہول النسب یعنی ذہل ابن شیبان میرے اونٹوں کو مباح نہ سمجھتے۔تب تو میری مدد کے لیے بہادروں کی ایک ایسی جماعت کھڑی ہوتی جو واجب الحفاظت چیز کی حفاظت کے وقت سخت ہے اگر کمزور لوگ نرمی کا مظاہرہ کرتے۔''44

پہلے شعر کے ترجمے میں مکمل طور پر لفظی کی پابندی کی گئی ہے۔اضافی کوئی لفظ داخل نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ سابقہ دونوں ترجموں میں بالترتیب 'گری پڑی عورت کے بچے' اور 'گری پڑی عورت کی اولاد' کیا ہے جب کہ یہاں 'مجہول النسب' کا ترجمہ کیا گیا ہے جو کہ حقیقی کے بجائے مجازی یا لازمی معنی میں استعمال ہوا ہے۔یہ لفظی تبدیلی ترجمے میں تبدیلی کے تحت داخل ہے۔دوسرے شعر میں لفظی کے بجائے مکمل طور پر مفہوم کو واضح کیا گیا ہے اور مفہوم کو ہی پیش نظر رکھتے ہوئے 'واجب الحفاظت چیز' ترجمہ کیا گیا۔

مترجمین کے نظریات کے حوالے سے گفتگو کرنے کے لیے حاصل شدہ مواد میں سے جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ان میں زیادہ تر شروحات ہیں جن میں ترجمے بھی شامل ہیں۔شرح ہونے کی وجہ سے زیادہ زور ترجمے کے بجائے عبارت کی لغوی، نحوی صرفی تجزیہ و معنوی تحلیل پر دیا گیا ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے ایک دو کتابوں کو چھوڑ کر بیشتر میں کتابوں میں ترجمے کے حوالے کوئی خاص گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ترجمے کا طریقہ کار، تکنیک، مسائل و مشکلات وغیرہ سے متعلق کچھ بھی مذکور نہیں ہے۔زیادہ تر کتابوں میں صرف ترجمے کی نوعیت و کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ترجمہ کیسا ہے۔اس میں بھی زیادہ تر یہی کہا گیا ہے کہ ترجمہ رواں ہے، سلیس ہے، بامحاورہ ہے وغیرہ۔اس وجہ سے مترجم یا ترجمہ شدہ کتاب کے حوالے کسی مخصوص نظریے تک بنظر پہنچنا مشکل ہے۔البتہ ترجمے کے حوالے کسی حد تک نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ترجمے کے حوالے جو کچھ مختصر ہی کی جانے والی گفتگو اور ترجمے کو مدنظر رکھتے ہوئے غور کیا جائے اور

جن کتابوں کے ایک سے زائد ترجمے موجود ہیں ان کا تقابل کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح طور پر نظر آئی ہے کہ ترجمے میں متن سے انحراف کیا گیا ہے اور تغیر وتبدل واقع ہوا ہے۔ کہیں اصل متن کے مقابلے میں اضافی تشریح سے کام لیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر قوسین کا استعمال کیا گیا جب کہ بہت سے ترجموں میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ لفظ کے قریبی متبادل کو استعمال کرنے کے بجائے اس کی وضاحت کے لیے مجازی و لازمی معنوں کے حامل متبادل کو استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ہی لفظ کے الگ الگ ترجموں میں الگ الگ متبادل اور وہ بھی مختلف المعنی متبادل استعمال کیے گئے۔ مخففات وضمائر کو واضح کیا گیا ہے۔ کہیں وضاحت کے لیے اپنی جانب سے مزید جملے استعمال کر لیے گئے۔

اس طرح یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی ترجمہ بغیر انحراف یا تغیر وتبدل کے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ نیز ہر ترجمہ گونا گوں اسباب کے باعث دوسرے ترجمے سے مختلف ضرور ہوگا خواہ کم یا زیادہ۔

حوالہ جات

1. علی عبدالواحد وافی، علم اللغہ، طبع پنجم، مصر: مکتبہ نہضہ مصر، 1962، ص 208,225، اور

M. H. Bakalla, Arabic Culture Through its Language and Literature, (London : Kegan Paul International, 1984), p 67

2. صبحی صالح، دراسات فی فقہ اللغۃ، طبع دوم، بیروت: منشورات المکتبہ الاہلیہ، 1962، ص 367

3. Sayce. (1883). Introduction to the scince of language. 2nd ed; London: Kegan Paul Trench & co, 1: 170

4. John Lyons. (1968). Introduction to theoretical linguistic, Combrige: University Press, Pg. 25

5. Andere Lefever. (1884). Race and Language. London: Pg 221-22

6. تفصیل کے لیے دیکھیے: سید علیم اشرف جائسی، فصول فی التعریف بالهند العربية الإسلامية ، سابق مصدر، ''الحکومات العربیہ''، فصل: بعض وسائل انتشار اللغة العربية فی الهند، ص 202-193 ''العصر العربی''، فصل: حركة التأليف باللغة العربية فی الهند، 240-232

7. پرکاش مونس، اردو ادب میں ہندی ادب کے رجحانات، (طبع اول، الہ آباد: مطبع نیشنل آرٹ پریس، 1978)، ص 95

8. سورۂ یوسف، آیت: 3

9. سورۂ یوسف، آیت: 111

10. سورۂ اعراف، آیت: 176

11. اردو کی نثری داستانیں، (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، 1987)، ص 85

12. ایضاً، ص 24-421

13. ایضاً، ص 458-457

14. نظری مباحث، جلد اول (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، 1999)

15. سید احتشام حسین، اردو میں دوسری زبانوں کا افسانوی ادب، مشمولہ تراجم کے مباحث، مرتب محمد ابوبکر فاروقی، ص 278

16. صادق الامین عزیزی، دروس مقامات، مکتبہ الاسلام کراچی، ص 13

17. ایضاً، ص، 49-147

18. جمشید احمد قاسمی (مرتب)، الکمالات الوحیدیہ شرح المقامات الحریریہ، مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ، ص 13

19. ایضاً، ص 40

20. ابن الحسن عباسی، درس مقامات، مکتبہ فاروقیہ شاہ فیصل ٹاؤن کراچی، ص، 5

21. ایضاً،ص،36

22. مفتی عبدالغفور،تیسیر مقامات،مکتبہ دارالقلم سائٹ کراچی،ص3

23. ایضاً،ص100-101

24. محمد نورحسین قاسمی،تشریحات شرح اردو مقامات حریری،دارالاشاعت اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی،ص20

25. ایضاً،ص117

26. خالد محمود،انوارات اردو ترجمہ مختارات،دارالقلم لاہور،ص3

27. ایضاً،ص76

28. ایضاً،ص19

29. ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب،مکتبہ امدادیہ ملتان،ص18

30. ایضاً،ص223

31. عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب فی شرح مختارات الادب،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی،ص15

32. ایضاً،ص194

33. رفیع الدین حنیف قاسمی،کلیلہ ودمنہ،قبا گرافکس حیدرآباد،ص8

34. ایضاً،ص79

35. قاضی سجاد حسین،التوشیحات علی السبع المعلقات،میر محمد کتب خانہ آرام باغ کراچی،ص3

36. ابن الحسن عباسی،توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ،مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی کراچی،ص6

37. محمد نورحسین قاسمی اور محمد صدیق ارکانی،مطر السماء شرح باب الحماسہ،دارالاشاعت اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی،ص،1

38. ایضاً،7

39. ابن الحسن عباسی،توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ،مکتبہ عمر فاروق شاہ فیصل کالونی کراچی،ص7

40. ایضاً،ص9

41. ایضاً،ص10

42. ایضاً،ص33-34

43. مجلس المدینۃ العلمیہ (دعوت اسلامی)،اتقان الفراسہ فی شرح دیوان الحماسہ،مکتبہ المدینہ باب المدینہ کراچی،ص23

44. ایضاً،ص25-26

باب چہارم

مداخلت کے اسباب وعوامل

(اردو میں عربی ادب کے ترجمے کے حوالے سے)

گزشتہ باب میں مداخلت کے موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مداخلت ترجمے کے عمل کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔خواہ کتنی ہی کوشش کی جائے، کتنا ہی ماہر ومشاق مترجم ہو اور دو خاندانی قربت کی حامل زبانوں میں ترجمہ ہو اس کے باوجود کوئی بھی ترجمہ مداخلت سے بالکلیہ پاک ہو ہی نہیں سکتا ہے۔کئی ایسے اسباب وعوامل ہیں جو مداخلت کی وجہ بنتے ہیں۔مترجم شعوری یا غیر شعور طور پر اس امر کا مرتکب ہوتا ہے۔ترجمے کے عمل میں مداخلت کے محرکات میں دو چیزیں بہت اہم ہیں: ایک مترجم کی شخصیت اور دوسرے زبان۔ ہر فرد کی اپنی علاحدہ شناخت ہوتی ہے۔اس کے عادات و اطوار، چیزوں کو دیکھنے، سمجھنے اور برتاؤ کے طریقے، علمی مقام ومرتبہ، فکری رجحان، ذہنی ساخت اور نقطۂ نظر دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ایک گروہ، معاشرے یا قوم کے افراد میں کچھ اشتراکات پائے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شخص دوسرے سے کلی مطابقت نہیں رکھتا۔یہی عدم مطابقت دراصل اس کی اپنی شخصیت کا پرتو ہوتی ہے۔

زبان مافی الضمیر کی ادائیگی کا وسیلہ ہے۔دنیا کی تمام زبانیں اسی مقصد کو پورا کرتی ہیں۔ بیشتر انسانی ضروریات وحوائج تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔عام یومیہ ضروریات یکساں ہی ہوتی ہیں۔اس کے باوجود ہر زبان کا طرز اظہار مختلف ہے۔ ہر زبان دوسری زبان سے ممتاز و جداگانہ شناخت کی حامل ہوتی ہے۔تاریخی ماخذ، تہذیبی ہیئت، جغرافیائی نوعیت، آب وہوا اور اطراف وجوانب سب مل کر زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔یہ عوامل ہر زبان کے ساتھ لاحق ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے زبانیں یکساں بیان کے اظہار میں جدا پیرایہ رکھتی ہیں۔ اگر کسی شخص کو پیاس لگی ہو اور وہ اپنی پیاس ظاہر کر کے پانی مانگے تو ہر زبان میں انداز قدرے مختلف ہوگا۔کسی زبان میں انداز برائے راست ہوگا، کسی میں میں گھماؤ دار۔ پھر مزید برآں یہ کہ صورت حال کے اختلاف سے انداز تبدیل ہوجاتا ہے۔ پانی مانگنے والا کہاں موجود ہے، کس سے پانی کا مطالبہ کر رہا ہے، اس کے پیاس کی شدت کتنی ہے؟ وغیرہ کئی پہلو اہمیت اختیار کر جاتے ہیں جن کی وجہ سے طرز اظہار وطلب بدل جاتا ہے۔

جب معمولی اور عام زندگی کی ضروریات کے بیان میں زبان کے اندر تبدیلی رونما ہوتی ہے تو علمی، فکری اور ادبی تحریروں میں اس کے تغیر وانحراف کی کیفیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔علمی تحریریں اس زبان کے

اندر علم وفن کی اہمیت، اس کے فروغ وترقی کی حالت، زبان بولنے والے افراد کا علمی رتبہ، علمی شغف ودلچسپی سب نمایاں ہوتی ہے۔ ادبی تحریریں تخیل وتدبر کی عکاسی کرتی ہیں۔ اس میں حقیقت پسندی کے ساتھ حسن جمال کی پرکاری ہوتی ہے۔ تصوراتی وجذباتی کیفیات کی عکس بندی کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر زبان کا علمی وادبی ذوق ومزاج علاحدہ ہوتا ہے۔

ترجمے میں علاحدہ مزاج کی حامل دو زبانوں کے درمیان پل قائم کیا جاتا ہے۔ متنوع مذاق رکھنے والے خیالات کو ایک زبان سے دوسری زبان کے قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ ایک زبان میں پروردہ خیالات جس میں اس کی تہذیب، ثقافت، تاریخ سب پیوست ہے اس کو دوسری تہذیب وثقافت کی پروردہ زبان میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ تبدیلی کا یہ عمل بہت سارے مشکل مراحل کو طے کرنے کے بعد انجام دیا جاتا ہے۔ ان مراحل کو طے کرنے میں اصل کے کئی محاسن وتلازمات ہدفی زبان میں نیا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس دوران لسانی وتہذیبی سطح پر کئی فرق درآتے ہیں۔

قابل غور بات یہ ہے کہ تغیر وتبدل کا واقع ہونا فی نفسہ کوئی قبیح عمل نہیں ہے؛ بلکہ یہ ترجمے کا جزو لاینفک ہے۔ اس کے بغیر کسی ترجمے کا تصور محال ہے۔ البتہ اہم سوال یہ ہے کہ ان تغیرات کے وقوع پذیر ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ زیر نظر باب میں ان اسباب کو مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کسی بھی تحریر کا ترجمہ ہو اور کوئی بھی مترجم اس عمل کو انجام دے رہا ہوں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ ترجمہ کس کے لیے کیا جا رہا ہے۔ جب ترجمہ کا عمل انجام دیا جاتا ہے تو اس گروہ یا گروپ کو ضرور مد نظر رکھا جاتا ہے جو اس ترجمے کا ممکنہ قاری ہوگا۔ ادارہ جاتی سطح پر ہونے والے تراجم میں ان چیزوں کو بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ انفرادی سطح پر ہر مترجم کے ذہن میں ہدفی قارئین کا خاکہ ہوتا ہے۔ یہ معاملہ بالکل تصنیف کی ہی مانند ہے۔ مصنف اپنے ہدفی قارئین کو مد نظر رکھ کر اپنا تحریری سفر طے کرتا ہے۔ زبان کا استعمال، الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، مضامین ومواد کی ترتیب، بیانیہ، اظہار خیال، تہذیبی، سماجی، ثقافتی حدود ہر پہلو کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح مترجم کو بھی ان ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مترجم کے سامنے یہ مرحلہ اصل مصنف سے کئی لحاظ سے مشکل ہوتا ہے۔ مصنف اس ضمن میں آزاد ہوتا ہے وہ ہدفی قارئین کو پیش

نظر رکھ کر سارے راستے اختیار کر لیتا ہے۔ ہدفی قارئین کے کسی مخصوص گروہ کے لیے تیار کردہ تحریر کو نئی زبان میں نئے قارئین سے ہم آہنگ کرنا ہوتا ہے۔ مترجم کو اصل زبان کے قارئین کو بھی ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اور ہدفی قارئین کے تقاضوں کا بھی خیال کرنا ضروری ہوتا ہے۔ ان مراحل کو طے کرنے میں ترجمے میں کئی طرح کے تغیرات واقع ہونا لازمی ہے۔ بدیہی بات ہے کہ دو الگ سمتوں کا خیال رکھنے میں تبدیلی تو ہوگی ہی۔

وقوفی ماحول

وقوفی ماحول دراصل انگریزی اصطلاح Cognitive Envirunment کا ترجمہ ہے۔ Cognitive مشتق ہے Cognition سے۔آکسفورڈ ڈکشنری میں Cognitive کے معنی ہیں.connected with mental process of understanding(تفہیم کے ذہنی مرحلہ سے متعلق) 1

جامعی انگریزی ۔اردولغت میں اس کا معنی ہے'' باوقوف، گن گیان والا،علم رکھنے والا، واقف، شناسا، دانش مند، عارف، وقوفی'' 2

بابائے اردو مولوی عبدالحق کی مرتب کردہ مشہور انگریزی اردولغت میں اس کا معنی ہے'' باوقوف، گیان، گن گیان والا، علم رکھنے والا، واقف، شناسا، دانش مند، عارف'' 3

ڈاکٹر جمیل جالبی کی انگریزی اردولغت میں اس کا معنی مذکور ہے''علم رکھنے والا، باوقوف، عارف، گیانی''4

مشہور انگریزی عربی لغت المورد میں اس کا معنی ہے'' مَعرِفی ، ادراکی'' 5

اگران تمام معانی کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ Congintion علم، ادراک، تعقل، دانش، عرفان، آگاہی، احساس اور تصور جیسی انسانی ذہن کی صفات کا نام ہے۔ یہ وہ عناصر یا صفات ہیں جس کے ذریعہ انسانوں کے درمیان ذہنی سطح پر امتیاز قائم ہوتا ہے اوران کو جداگانہ شناخت حاصل ہوتی ہے۔

ہر انسان کو علم وآگہی اور معرفت کا مخصوص حصہ ملا ہے اور اسی سے اس کی انفرادی شناخت بنتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایک ہی واقعہ کا تاثر الگ الگ ہوتا ہے۔البتہ ایک مخصوص ماحول میں رہنے والے افراد کے اندر پیدا ہونے والے تاثر میں قدرے یکسانیت ہوتی ہے جس کا اثر ان کے جملہ اعمال و افعال پر نظر آتا ہے جن میں سب سے واضح اور اہم مظہر زبان ہوتی ہے۔زبان اور فکر کا انتہائی مربوط رشتہ ہے۔انسان جو کچھ سوچتا ہے وہی بولتا ہے بلکہ یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ انسان وہی سوچتا یا سوچ سکتا ہے

جس کا وہ اظہار کر سکتا ہے۔اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے ویوان کک لکھتا ہے:

Thinking and language are assentially the same thing. 6

فکراور زبان لازمی طور پر ایک ہی چیز ہے)

معنی کی تشکیل میں سماجی، ثقافتی اور تمام ماحولی پہلوؤں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ چنانچہ کئی ماہرین اسی بات کی وکالت کرتے ہیں کہ زبان کا مطالعہ اسی ماحول کے ساتھ ہونا چاہیے جس کی پروردہ وہ زبان ہے۔ان کی نظر میں زبان بے شمار ماحولی اتفاقات کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ کسی زبان کے لفظ کا معنی یا یہ کہہ لیں کہ قرار واقعی درست معنی محض لسانی نظام کے تحت دریافت نہیں کیا جا سکتا ہے۔الفاظ کو معنی کا لبادہ زبان استعمال کرنے والے افراد کے عقائد، خیالات ،نظریات،طور طریقے،تہذیب ومعاشرتی نظام جیسے عناصر پہناتے ہیں۔

اس طرح غور کریں تو یہ نتیجہ نکل کر سامنے آتا ہے کہ وقوفی ماحول میں انسان کی تمام تر فکری اور تصوراتی سطحیں شامل ہیں۔زبان اپنے استعمال کنندگان کی آئینہ دار اور عکاس ہوتی ہے۔کسی فرد کا شعور،بصیرت،اس کی علمی قابلیت، ماحول،مزاج،طرز فکر،اطراف واکناف کے حالات، زمانہ،مجموعی تاثرات،احساسات وغیرہ کیفیات وقوفی ماحول کا حصہ ہیں۔کوئی فرد کسی بھی بات کو انہیں عناصر کی روشنی میں یا انہیں کی مدد سے سوچتا اور سمجھتا ہے۔

یہ بالکل مسلمہ امر اور فطری حقیقت ہے کہ جب کوئی شخص کچھ تحریر کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ اس کے مخاطب کون ہیں؟ جب مخاطب کو ذہن میں رکھ کر متن تیار کیا جاتا ہے تو وہ ان کی ضروریات اور توقعات دونوں کے مطابق ہوتا۔مثال کے طور پر ایک شخص کو کسی موضوع کے تحت متعینہ عنوان پر گفتگو کرنی ہے اور مختلف اوقات میں مختلف گروپ کے لوگوں کے سامنے کرنی ہے۔اولاً طلبا، پھر اسکالرس اور پھر اساتذہ۔تینوں گروپ کے سامنے پیش کش کے دوران اس کی گفتگو میں واضح فرق محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انتخاب الفاظ، جملوں کی ساخت اور معیار کی تبدیلی کے ساتھ توضیحات وتشریحات میں بھی کمی آتی جائے گی،

حتی کہ گفتگو کا لہجہ تک مختلف ہو جائے گا۔ یہی تمام مدارج دوران تحریر بھی طے کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو تحریر کی افادیت انتہائی کم یا محدود ہو جائے گی۔ مواد کی یکسانیت کے باوجود تفہیم و ترسیل کی سطح مختلف ہو جائے گی؛ کیوں کہ ہر گروپ کی وقوفی سطح دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

جب ایک مصنف کے لیے اپنی تحریر کو قابل استفادہ بنانے کے لیے اپنے وقوفی ماحول کا لحاظ کرنا ضروری ہے تو مترجم کو اس کا خیال کس قدر کرنا ہوگا؛ کیوں کہ مصنف اور اس کے ہدفی قارئین کے درمیان تو بہر حال کسی نہ کسی حد تک وقوفی یکسانیت کا امکان موجود ہے لیکن مترجم کے ہدفی قارئین کا وقوفی ماحول تو عموماً اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے جس کے لیے متن تیار کیا گیا تھا۔ مترجم کو پہلے اصل قارئین اور ان کے ردعمل پھر اپنے وقوفی قارئین کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اصل اور ہدفی دونوں قارئین کے وقوفی ماحول میں جس قدر تفاوت اور فاصلہ ہوگا اسی قدر مترجم کو مداخلت سے کام لینا پڑے گا۔

قارئین کا انداز فکر یا چیزوں کے دیکھنے سمجھنے کا مزاج جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ اسی ماحول کی مدد سے چیزوں کو سمجھتے ہیں جو ان کے اطراف میں موجود ہوتا ہے یا جن سے ان کو سابقہ پڑ چکا ہوتا ہے۔ جس نے آم نہ دیکھا وہ لفظ آم کو کماحقہٗ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ صورت حال اصل اور ہدفی دونوں زبانوں کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر زبان میں اس کے اپنے مخصوص درخت، پھل، مرغزار، پھول، چرند، پرند، ندیاں، کتابیں، اصنام، شخصیات، پہاڑ، وادیاں، مقامات، بستیاں، عشاق، معشوق، اساطیر، حکایات، رموز اور اشارات ہوتے ہیں جو اسی کے ساتھ خاص ہوتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اس زبان کے بولنے والے افراد بہ آسانی سمجھتے ہیں؛ لیکن ان کے علاوہ افراد کے لیے یہ چیزیں ناواقفیت کی صورت میں بالکل اجنبی ہوتی ہیں۔ مصنف دوران تحریر بڑی آسانی کے ساتھ انہیں استعمال کرتا اور برتتا ہے اسے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کے قارئین بھی اس سے واقف ہیں۔ ترجمہ میں تمام چیزیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ ہدفی قارئین کے لیے یہ چیزیں جس قدر اجنبی ہوں گی مترجم کی ذمہ داری اسی قدر بڑھتی جائے گی اور اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ Chang Zixia نے مترجم کے وقوفی ماحول کو نہایت اہم گردانا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

translator’s cognitive environment plays a key

role in successful communication between the

writer and target reader. 7

(مصنف اور ہدفی قارئین کے درمیان کامیاب ترسیل میں مترجم کا وقوفی ماحول
کلیدی کردار ادا کرتا ہے)

مترجم کا کردار کلیدی اس لیے ہے کہ وہ پہلے تو اصل متن میں موجود ان عناصر کو منشائے مصنف کے مطابق سمجھتا ہے۔اس مرحلہ میں اس کا وقوفی ماحول بہت اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ مترجم کا وقوفی ماحول اس کے ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول سے تھوڑا سا اس اعتبار سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ دونوں وقوفی ماحول کا جز ہوتا ہے۔اس کے بعد وہ ترجمہ کو ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول کے مطابق ڈھالتا ہے۔دونوں زبانوں سے واقف ہونے کی وجہ سے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مترجم کا جھکاؤ اصل زبان کی طرف ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے قارئین بھی اس سے واقف ہیں جب کہ درحقیقت وہ اس سے نابلد ہوتے ہیں۔کبھی خود مترجم ہی اصل زبان کے کسی خاص عنصر کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے اسے ترسیل میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اگر مترجم اپنے وقوفی ماحول اور اپنے قارئین اور زبان کے وقوفی ماحول کی رعایت نہ کرے تو کچھاٹ پٹا سا محسوس ہوتا ہے۔جیسے اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں

"أتيتنا مكذباً فصدقناك، و مخذولاً فنصرناك، وطريداً
فآويناك، و عائلاً فواسيناك" 8

مبشرات فی حل مختارات میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

''اے محمد ﷺ تو ہمارے پاس اس حال میں آیا کہ لوگوں نے تیری تکذیب کی اور
ہم نے تیری تصدیق کی اور تو بے سہارا و بے یار و مددگار تھا ہم نے تیری امداد کی
اور دھتکارا ہوا تھا ہم نے تجھے ٹھکانہ دیا اور تو فقیر تھا ہم نے تیری غم خواری کی: 9

مذکورہ بالا ترجمہ اصل سے قریب تر ہے اس میں متن کی اتباع میں عربی زبان کے واحد مذکر حاضر کے لیے اردو کے صحیح ترین متبادل کو منتخب کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود جب ہم اس کی قرأت کرتے ہیں تو طبیعت

پے یک گونہ گرانی محسوس ہوتی ہے اور زبان رکنے سی لگتی ہے۔ اس کے مقابل میں ایک دوسرا ترجمہ ملاحظہ کریں جس میں مترجم نے ہدفی زبان کے اس متبادل کا استعمال کیا ہے جو واحد کے لیے بغرض احترام اور بہ اعتبار شخصیت استعمال کیا جاتا ہے۔ ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول سے ہم آہنگ اس تبدیلی کی وجہ سے ترجمہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

''آپ ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ آپکی تکذیب کی گئی تھی ہم نے آپ کی تصدیق کی، آپ کی قوم نے آپ کو بے یارومددگار چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ کی مدد ونصرت کی، آپ دھتکار دیے گئے تھے ہم نے آپ کو پناہ دی، آپ ہمارے پاس مفلس ہوکر آئے تھے ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی''۔10ے

مذکورہ بالا دونوں ترجموں کے جائزہ سے یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں صرف ایک لفظ کا ہی فرق نہیں ہے؛ بلکہ پہلے ترجمے میں اس کے ساتھ ایسے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جس سے یک گونہ گرانی ہوتی ہے جیسے ''تو بے سہارا و بے یارومددگار تھا'' جب کہ دوسرے ترجمے میں ''آپ کی قوم نے آپ کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا تھا'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک میں فقیر اور دوسرے میں مسکین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ بہرحال دونوں الفاظ معنوی اعتبار سے جدا ہیں۔

ایک ہی لفظ کے کئی معنی بھی ہوتے ہیں۔ اس کی مثالیں قریب کی زبانوں میں زیادہ دیکھنے کو ملیں گی۔ اس صورت حال کا سامنا مستعار الفاظ میں زیادہ ہوتا ہے۔ مستعار لفظ کو اپنی زبان کے اعتبار سے معنی دے دیا جاتا ہے جو کہ بسا اوقات اصل زبان میں موجود معنی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''خلافت'' ہے، اردو میں اس کا معنی ''ایک قسم کی طرز حکومت'' یا ''جانشینی'' ہے جب کہ ہندی میں اسی لفظ کو ''مخالفت'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بہت سے الفاظ ذومعنی ہوتے ہیں مثلاً عربی میں ''قصد'' کا معنی ''میانہ روی'' اور ''ارادہ'' دونوں ہے جب کہ اردو میں صرف ''عزم وارادہ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اردو میں عربی زبان سے مستعار ایک لفظ 'شعار' استعمال ہوتا ہے، جس کا عمومی معنی لیا جاتا ہے

’چلن، طور، طریقہ‘۔ اردو میں یہی معنی مروج و مستعمل ہے۔ بسا اوقات اسے شعائر کے معنی بھی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کا ایک اور معنی بھی ہے ’’بدن سے لگا ہوا کپڑا‘‘ یہ دراصل عربی زبان میں اس کا معنی ہے؛ لیکن اس معنی سے بہت کم ہی اردو داں واقف ہوں گے یا بہت ہی کم لوگ شعار کو اس معنی میں استعمال کرتے ہوں گے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

"الأنصار شعار والناس دثار" 11۔

مختارات کا ایک ترجمہ لمعات الذہب کے نام سے عتیق الرحمٰن سیف نے کیا ہے۔ انہوں نے اس عبارت کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے:

’’انصار تو شعار ہیں (یعنی مجھ سے ان کا اتصال بہت ہی قوی اور مستحکم ہے) اور دیگر لوگ دثار ہیں (یعنی ان کا اتصال مجھ سے اتنا مستحکم نہیں ہے)‘‘۔ 12۔

اس ترجمے کا جائزہ لیں تو یہ نظر آتا ہے کہ مترجم نے اصل متن میں موجود لفظ کو ہو بہو ترجمے میں استعمال کیا ہے اور پھر قوسین میں اس کی تشریح کر دی ہے۔ اگر عام اردوں داں کی نظر سے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے تو پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک شعار کا معنی کچھ اور ہے اور اس کی تشریح کچھ اور کی گئی ہے۔ وہ تذبذب کا شکار ہوتا ہے، حتی کہ اس کے سامنے دوسرا معنی یعنی ’’بدن سے لگا ہوا کپڑا‘‘ نہ واضح ہو جائے۔ یہ دشواری ایک ہی لفظ کے دو الگ الگ زبانوں میں الگ الگ معنی میں مستعمل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

یہی حال موضوعات کا بھی ہے۔ ان کی افہام و تفہیم میں بھی وقوفی ماحول کو خاصا دخل ہے۔ کوئی موضوع یا بات ایک زبان میں بہت ہی اہم ہوتی ہے جب کہ دوسری زبان میں اسے اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوتی۔ حسن الدین احمد لکھتے ہیں:

’’بہت سی باتیں جو ایک زبان میں اس کی خصوصیات کے لحاظ سے معمولی ہوتی ہیں وہی دوسری زبا میں بالکل نئی یا بعید الفہم ہوتی ہیں۔‘‘ 13۔

مختلف اقوام میں علم وفکر کی سطحیں مختلف ہوتی ہیں؛ کیوں کہ علمی ترقی مختلف اقوام میں الگ الگ انداز میں ہوتی ہے۔اسی طرح ہر زبان کی فکری صلاحیت یکساں نہیں ہوتی ۔ ہر زبان کا علمی وتحقیقی مزاج مختلف ہوتا ہے۔ترقی یافتہ زبانوں میں اس کی سطح بہت بلند جب کہ کم ترقی یافتہ زبانوں میں پست ہوتی ہے۔فکری معیار کے اختلاف سے ترجمہ کے دوران مترجم کو خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اسے دونوں متون کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ایک طرف اسے اس بات کو ملحوظ کھنا پڑتا ہے کہ اصل متن میں موجود مضمون اور مطلب ہاتھ سے نہ جائے اور دوسری طرف اسے اس انداز سے پیش کیا جائے کہ وقوفی ماحول کے لیے قابل فہم اور قابل استفادہ ہو۔ایسی صورت میں مترجم ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول میں اس کی مماثلت تلاش کرتا ہےاوراصل متن کو اس سے تبدیل کرتے ہوئے منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اگر مماثلت نہیں ملتی تو تشریحی طرز اختیار کرتا ہے۔ مترجم کو اس قسم کے کئی راستے اسے اختیار کرنے پڑتے ہیں جو مداخلت سے ہو کر گزرتے ہیں۔

مترجم اپنے ہدفی وقوفی ماحول کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ وقوفی قارئین کے کس طبقہ کی توقعات کے مطابق اوران کی ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے قرآن کریم کا جب فارسی زبان میں ترجمہ کیا تو اپنے مقدمہ میں اس بات کی وضاحت کی کہ ''یہ ترجمہ ان لوگوں کے لیے ہے جو شرعی علوم حاصل نہیں کر سکتے یا عصری علوم کی تحصیل میں مشغول ہونے کی وجہ سے ان کے پاس اتنا موقع نہیں ہے۔''14؎

وقوفی ماحول کی رعایت کی وجہ سے ترجمہ میں مداخلت کی ضرورتوں میں دو باتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ اول یہ کہ زبانوں میں وقت کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہر عہد کی زبان کا مخصوص مزاج ہوتا ہے۔لفظیات سے لے کر زبان کی ساخت تک بہت کچھ تبدیل ہو جاتا ہے۔اس تبدیلی کے ساتھ وقوفی ماحول کا تبدیل ہونا بھی ناگزیر ہے۔یہی وجہ ہے ایک ہی زبان میں موجود قدیم متون کو از سر نو ترتیب دینے اور ترجمہ شدہ کتابوں کے باز ترجمے کی ضرورت پیش آتی ہے تا کہ موجودہ وقوفی ماحول سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔باز ترجمہ میں مترجم کو وقوفی ماحول کی رعایت سے بہت کچھ مداخلت کرنی پڑتی ہے۔

وقوفی ماحول کی وجہ سے ہونے والی مداخلتوں کا ایک اہم میدان تراجم ادب اطفال کی وہ شاخ بھی ہے جس

میں ایک ایسے متن کو ترجمہ کیا جاتا ہے جو بنیادی طور پر بالغوں یا بڑوں کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن بعد میں اسے بچوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ کام اصل زبان میں بھی ہوتا ہے یعنی بڑوں کے لیے لکھی ہوئی تحریر کو بعد میں بچوں کے لیے پیش کیا جاتا ہے اور ترجمے میں یہ عمل ہوتا ہے جو ادب اطفال کی تیاری کے ضمن میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر Zoher Shavit نے اپنے مضمون Translation children's Literature 15 میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ اس نے اپنے مضمون میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ بات بتائی ہے کہ اس قسم کے متن کی تیاری میں کردار، ماحول، لفظیات، محاورے اور متن کے مزاج کو کس طرح اور کس حد تک تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دراصل یہ تبدیلی بھی وقوفی ماحول کی رعایت کے زمرہ میں شامل ہے؛ کیوں کہ بڑوں کا وقوفی ماحول کچھ اور ہوتا ہے اور بچوں کا وقوفی ماحول اس سے جدا ہوتا ہے۔

تسہیل

مداخلت کا دوسرا سبب عمل تقلیل یعنی فہم ترجمہ کے لیے کی جانے والی کوشش کو کم کرنا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا کہ ہے متن کو قارئین کے لیے آسان بنانا۔

دنیا کی مختلف زبانوں کا معیار یا ان کی لسانی ثروت مندی کی سطح مختلف ہے۔ زبانوں میں قدامت، وسعت، ذخیرۂ الفاظ کی کثرت، فکری جہتوں کے تنوع، احساساتی کیفیات کے بیان کی قوت، تراکیب کی ندرت، معنوی تہہ داری، ساختیاتی کاملیت جیسے مختلف عناصر کی بنیاد پر فرق مرتب ہوتا ہے۔ جن زبانوں کو ان عناصر سے زیادہ حصہ حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ فائق اور کامل مانی جاتی ہیں اور جو زبانیں جس حد تک ان سے محروم ہوتی ہیں ان کا درجہ اسی اعتبار سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔ زبانوں کا نقطۂ عروج بھی مسلسل قائم نہیں رہتا۔ مثلاً کسی زمانے میں یونانی، سریانی، لاطینی زبانیں اعلیٰ سمجھی جاتی تھیں، بعد کے ادوار میں یہ درجہ عربی زبان کو حاصل ہوا اور اب یہ مقام انگریزی کو حاصل ہے۔

مذکورہ بالا گفتگو کو ذہن میں رکھتے ہوئے عہد حاضر میں اردو اور انگریزی زبان کے تناظر میں اس پر غور کرتے ہیں۔ اس وقت انگریزی کو بین الاقوامی رابطہ کی زبان کا درجہ ہے۔ اس کا شمار اہم ترین علمی زبان کے طور پر ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے علوم اس کے اندر موجود ہیں خصوصاً جدید علوم کا سب سے بڑا ماخذ اور سب سے اہم وسیلہ انگریزی زبان ہی ہے۔ اس کے مقابلے میں اردو زبان ایک جدید اور غیر ترقی یافتہ زبان ہے۔ ایسی صورت حال میں اگر انگریزی زبان میں موجود جدید علوم مثلاً سیل فون ٹکنالوجی کے متعلق کسی متن کا اردو میں ترجمہ کرنا ہو تو اس میں مترجم کو تسہیل بھی کرنی ہوگی اور جگہ جگہ توضیح بھی۔ اس کے برعکس اگر اس قسم کے اردو متن کا ترجمہ انگریزی میں کرنا ہو (گو کہ یہ بات سچ ہے کہ عموماً ایسے متون کا ہی ترجمہ کیا جاتا ہے جس کی ہدفی زبان و قارئین کو ضرورت ہوتی ہے اور جس قسم کے متون ہدفی زبان میں موجود نہیں ہوتے) تو کسی قسم کے توضیح کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ اردو میں موجود توضیح کو مزید کم کرنے کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر اردو میں جڑی بوٹیوں سے معالجہ سے متعلق کوئی متن ہو اس کو انگریزی میں ترجمہ کرنا ہو تو اس کی

توضیح کی ضرورت پیش آئے گی اور اگر ترجمہ برعکس ہو یعنی اس قسم کے انگریزی متن کا اردو میں ترجمہ کیا جائے تو اس قدر تسہیل وتوضیح کی حاجت نہیں ہوگی کیوں کہ اردو زبان میں اس کی قدیم روایت رہی ہے۔

اس گفتگو کا مقصد دراصل تسہیل وتوضیح کے صحیح مفہوم اور س کی نوعیت کی وضاحت تھی؛ تا کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ترجمہ حتمی طور پر اصل سے آسان ہی ہوگا؛ بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا انحصار متن کی نوعیت پر ہے۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عموماً یہی صورت حال پیش آتی ہے کہ ترجمہ شدہ متن بمقابلہ اصل کے آسان ہوتا ہے یا یہ کہ اس کو اصل کے مقابلہ میں آسان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مترجم مختلف طریقۂ کار اختیار کرتا ہے جو آئندہ ذکر کیے جائیں گے۔

جملوں میں اختصار

ترجمہ میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ مختصر جملے استعمال کئے جائیں۔ متن کے طویل جملوں کو مفہوم کو سلامت رکھتے ہوئے مترجم کئی حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مختصر جملوں کے استعمال کے پس بشت یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ قاری کو فہم متن میں آسانی ہو۔ جملوں کی پیچیدگی کو سلجھانے میں اس کی ذہنی قوت اور وقت صرف نہ ہو۔ کم وقت اور محنت صرف کر کے مفہوم تک رسائی حاصل کی جا سکے۔

یہاں ایک چیز واضح کرنا ضروری ہے۔ اردو زبان میں بہت سے مترجمین اس رویہ کے خلاف ہیں۔ طویل کو مختصر کرنے کو وہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے؛ کیونکہ اس سے اردو میں طویل اور پیچیدہ جملے لکھنے کی کوئی راہ نہیں نکلتی۔ مرزا حامد بیگ صاحب اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سو کہا جا سکتا ہے کہ ہماری زبان اور ادبیات نے ترجمے کے ایک عظیم جوکھم سے
> نبرد آزما رہنے کے باوجود خاطر خواہ حد تک فائدہ نہیں اٹھایا۔‘‘ 16

یہ خیال صرف مرزا صاحب کا ہی نہیں بلکہ اردو زبان کے بہت ادبا و ناقدین اور مترجمین اس کے شاکی نظر آتے ہیں کہ اردو زبان میں طویل اور پیچیدہ جملے لکھنے کی سکت نہیں ہے۔ طویل جملوں اور پیچیدہ اظہار خیال پر قدرت سے اردو زبان کو کس قسم کے فائدہ ہوگا اس سے قطع نظر میرے نزدیک زبانیں دوسری زبانوں کی پیروی میں ان کے نقش قدم پر نہیں چلتیں بلکہ ہر زبان کی اپنی مخصوص ساخت ہوتی ہے۔ کسی زبان میں پیچیدہ اور طویل

جملے لکھے جاتے ہیں اور کسی میں سادہ اور مختصر۔ اب ساری زبانوں کی نوعیت اس سلسلہ میں یکساں ہو جائے تو ان میں تفریق کی کیا بنیاد باقی رہے گی۔ زبانیں دراصل ضدی بچے کے مانند ہوتی ہیں۔ جس طرح ضدی بچہ تمام تر فہمائش کے باوجود اپنی مرضی کی چیز حاصل کر کے دم لیتا ہے۔ اسی طرح خواہ کتنا ہی جتن کیا جائے زبان اپنے مزاج سے ہم آہنگ عناصر مستعار لے ہی لیتی ہے۔ اردو زبان کی ساخت میں طویل جملوں کا رواج اسی لیے نہیں ہوسکا کیوں کہ وہ اس کے مزاج کے خلاف ہے ورنہ تو ہمارے یہاں بھی طویل جملے لکھنے اور طویل جملوں کو منتقل کرنے کی روایت ملتی ہی ہے۔ خود مرزا حامد بیگ نے دو مثالیں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد حسن عسکری نے فلائبیر، محمد سلیم الرحمٰن نے ہومر اور مظفر علی سید نے لارنس کو ترجمہ کرتے وقت گنجلک اور طویل جملوں کو اردو جیسی بے مایہ زبان میں منتقل کرنے کا جتن کیا ہے۔''17؎

جملوں کے اختصار کے سلسلے میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ اصل متن کے مقابلے میں ترجمے کے متن کے جملے مختصر ہوتے ہیں لیکن ایسا کرنا ناگزیر نہیں ہے۔ دوسرے ایسا کرنے یا نہ کرنے کا انحصار مترجم کی صوابدید پر ہوتا ہے وہ اپنی فہم کے اعتبار سے اس کا فیصلہ کرتا ہے۔ البتہ عام طور پر مترجم کی جانب سے جملے میں اختصار کی روش ہی اختیار کی جاتی ہے۔ بیشتر ترجموں میں اس امر کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ثعلبة: يا صاحب رسول الله، امرأتي توشك أن تضع و ماعندنا شئ و توصينى أنت بالأحطاب في الجبل؟!

أبوذر: امرأتك توشك أن تضع؟

ثعلبة: ماكنت لأحضر اليك لو لا ذلك.

أبوذر: (يغيب داخل البيت لحظة ثم يعود حاملاً معه كيسين) ما عندى غير هذا الصاع من التمر و هذا الصاع من الشعير فخذهما يا ثعلبة و لوكان عندى أكثر لأعطيتك.18؎

اب اس جملے کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

ثعلبہ: اے صحابیِ رسول ﷺ میری بیوی کے ہاں عنقریب ولادت ہونے والی ہے اور

آپ مجھے پہاڑوں سے لکڑیاں کاٹ کر بیچنے کی نصیحت کر رہے ہیں۔

ابوذرؓ: کیا جلدی ہی ولادت متوقع ہے؟

ثعلبہ: میں آپ کے پاس ہرگز نہ آتا اگر ایسی بات نہ ہوتی۔

(ابوذرؓ تھوڑی دیر کے لیے گھر کے اندر جاتے ہیں۔ واپسی پر ہاتھ میں دو تھیلے پکڑے ہوئے ہیں، تھیلے نوجوان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں)

ابوذرؓ: میرے پاس اس وقت یہ کھجوریں اور تھوڑے سے جو ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ بھی نہیں، یہ قبول کرو؛ اے ثعلبہ! بخدا اگر میرے پاس اس سے زیادہ ہوتا تو ضرور عطا کرتا۔19ؕ

مذکورہ بالا ترجمہ شدہ اقتباس میں زیر گفتگو آخری اور اس سے پہلے والا جملہ ہے۔ اصل متن میں ابوذرؓ کے مکالمے کے تحت قوسین میں اس وقت کی صورت حال اور کیفیت بیان کی گئی ہے جب کہ مترجم نے قوسین کے جملے کو الگ کر دیا۔ اصل متن میں قوسین میں ایک ہی جملہ تھا جسے مترجم نے تین اجزا میں تقسیم کر کے ترجمہ کیا۔ اس کے بعد ابوذر کے مکالمے والے جملے کو جز جز کر کے ترجمہ کیا۔ اس طرح اصل متن میں مذکور جملے کے مقابلے میں ترجمہ شدہ متن کے جملے مختصر ہو گئے۔ اس طرز کی مثال کے لیے ایک اور جملے پر غور کرتے ہیں:

(في بيت ثعلبة)

ثعلبة: (يضع الصاعين أمام زوجته زهيرة) زهيرة، خذي هذا فاحفظيه ليوم وضعك.

زهيرة: ماذا تقول يا ثعلبة؟ اني بعد فى شهري السادس.

ثعلبة: سيجئ شهرك التاسع وشيكاً فينفعك يومئذ، اياك أن تصيبي منه شيئاًقبل يوم وضعك.20ؕ

مذکورہ بالا اقتباس کا ترجمہ قلب بشیر خاور بٹ نے یوں کیا ہے:

(ثعلبہ اپنے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں تھیلے ہیں۔ وہ اپنی بیوی زہیرہ کے سامنے دونوں تھیلے رکھتے ہوئے کہتا ہے:

ثعلبہ: یہ لوز ہیرہ اور بچے کے یوم ولادت کے لیے سنبھال رکھو۔

زہیرہ: کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ابھی تو چھٹا مہینہ ہے۔

ثعلبہ: جلد ہی نواں مہینہ بھی آنے والا ہے۔ یہ چیزیں اس وقت کام آئیں گی۔ خبر دار اس دن سے پہلے ان کو نہ چھیڑنا۔ 21ؔ

مذکورہ بالا ترجمے میں یوں تو تمام ہی جملے میں اختصار اور تسہیل کی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن جملہ اول خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ پہلا جملہ ڈرامے کے دوسرے منظر کا آغاز ہے۔ مصنف نے اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ''في بيت ثعلبة'' کا جملہ استعمال کیا۔ اس کا لفظی ترجمہ ہوگا 'ثعلبہ کے گھر میں' یا اگر ڈرامے کے اعتبار سے ترجمہ کریں تو ترجمہ ہوگا ''ثعلبہ کا گھر ہے''۔ مترجم نے اس جملے کا الگ سے ترجمہ کرنے کے بجائے اس جملے اور اس کے بعد کے جملے میں ملا کر چھوٹے چھوٹے کئی جملوں ترجمہ کیا اور اس میں اپنی جانب سے جملے میں اضافہ بھی کیا ہے۔ جملوں میں اختصار اور اضافہ دونوں باتوں کو ملحوظ رکھ کر ہدفی قارئین کے لیے قابل رسا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سادگی اظہار بیان

ترجمہ کا بنیادی مقصد مفہوم کی ترسیل ہے۔ مترجم کی اولین ترجیح یہی ہوتی ہے وہ ہدفی متن کے مفہوم کو منتقل کرے۔ اس مقصد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ اظہار بیان کی سادگی ہے؛ کیوں کہ اگر اظہار بیان میں پیچیدگی پیدا کی جائے یا پیچیدگی برقرار رکھی جائے تو ترجمہ کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس لیے ترجمہ میں اظہار بیان سادہ اور آسان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ تصنیف اور ترجمہ میں فرق یہ ہے کہ ترجمہ دو زبانوں کا تعامل ہے۔ مصنف کو صرف اپنی زبان سے سروکار ہوتا ہے۔ وہ زبان کے مزاج اور تقاضے کے مطابق اظہار بیان اختیار کرتا ہے؛ لیکن مترجم کو یہ آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مترجم کسی ایک زبان کی کلی پابندی نہیں کرسکتا۔ اگر مترجم اصل متن کے اظہار بیان کی پابندی کرتا ہے تو ہدفی متن کی صحت متاثر ہوگی اور اگر ہدفی زبان کے مزاج اور تقاضوں کی پاسداری کرتے ہوئے اظہار بیان کا معیار متعین کرتا ہے تو اصل متن بے روح ہو جائے گا اس لیے مترجم درمیان کا راستہ اختیار کرتا ہے اور دونوں

زبانوں ومتون سے ہم آہنگ طرز یعنی اظہار کی سادگی کو کوترجیح دیتا ہے۔اس کوایک مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے:

(في بيت أبي ذر الغفارى الصحابى الزاهد يدخل عليه فتى شاب فيستقبله أبوذر مرحباً)22

مذکور بالا جملے سے ڈرامہ کا آغاز ہوتا ہے۔قلب بشیر خاور بٹ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

(ایک نوجوان حضرت ابوذرؓ غفاری کے گھر آتا ہے۔آپ اس کا استقبال کرتے ہیں۔نوجوان کا نام ثعلبہ ہے۔وہ کہتا ہے:)23

مترجم نے جملے کا ترجمہ ڈرامے کے اسلوب میں کرنے کے بجائے ذرا سا آسان کر دیا ہے۔ابوذرؓ کے لیے بیان کردہ صفات 'الصحابى الزاهد' کو حذف کر دیا۔آخری جملہ 'فيستقبله أبوذر مرحباً' کو آسان اردو اسلوب کے پیرائے میں بیان کر دیا۔اگر عربی عبارت کے ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا جاتا تو اس کا ترجمہ ہوتا ''وہ خوش آمدید کہتے ہوئے استقبال کرتے ہیں''۔اسی طرح مترجم نے ایک جملہ ''نوجوان کا نام ثعلبہ ہے۔وہ کہتا ہے'' درج کیا ہے۔یہ جملہ بھی مکمل طور پر مترجم کی جانب سے اضافہ ہے۔متن میں اس کے لیے کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔اس اضافے کا مقصد آگلے جملے کے فہم کو آسان کرنا ہے۔

متن کے مفہوم کو آسانی سے قاری تک پہنچانے کے لیے مترجم مختصر کے ساتھ آسان جملے استعمال کرتا ہے۔لفظوں کا انتخاب اور ان کا استعمال اس انداز سے کرتا ہے کہ قاری کے لیے اخذ مفہوم میں گرانی یا دشواری نہ ہو۔نیز متن سے قاری کی دلچسپی قائم رہے اسے اجنبیت کا احساس نہ ہو۔یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مترجم اس مقصد کے حصول کے لیے مداخلت کے راستے سے ہی سفر کرتا ہے۔اس کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

يابني ان صاحب الدنيا يطلب ثلاثة أمور، لن يدركها الا بأربعة أشياء: أما الثلاثة التى يطلب فالسعة في الرزق، والمنزلة في الناس، والزاد للآخرة: وأما الأربعة التي يحتاج

اليها في درك هذه الثلاثة فاكتساب المال من أحسن وجه يكون، ثم حسن القيام على ما اكتسب منه ثم استثماره۔ ثم انفاقه فيما يصلح المعيشة و يُرضى الأهل و الاخوان، فيعود عليه نفعه في الآخرة۔[24]

بیٹو! دنیا کا ہر شخص تین چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر وہ تین چیزیں حاصل کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تین چیزیں جن کو حاصل کرنے کا ہر شخص خواہشمند ہے وہ یہ ہیں (۱) روزی کی کشادگی (۲) لوگوں میں منزلت و مقام (۳) آخرت کے لیے توشہ، اور ان کو حاصل کرنے کے لیے جن چار چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہیں (۱) مال کو سب سے اچھے ذریعے سے کمایا جائے (۲) جو کچھ اس نے کمایا ہے اس کی حفاظت اور نگہداشت کرے (۳) اس کی سرمایہ کاری کر کے اس میں بڑھوتری کے لیے کوشش کرے (۴) اس کو ایسی جگہوں میں خرچ کرے جس سے زندگی صحیح گزرے، اہل وعیال اور دوست و احباب خوش ہوں اور آخرت میں اس کا فائدہ ہو۔[25]

مذکورہ بالا ترجمے کو نہایت سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ الفاظ موقع ومحل کی مناسبت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسے 'سرمایہ کاری' کا لفظ جدید ہے اور قاری کے لیے سہل الفہم بھی۔ پھر تمام باتوں کو الگ الگ نمبروار انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا ترجمے میں جو سہل رویہ اختیار کیا ہے اس کو سمجھنے کے لیے ایک اور ترجمہ کا مطالعہ بہت معاون ہوگا۔

اے میرے لڑکو! دنیا والا تین چیزوں کا طالب ہوتا ہے، جسے وہ چار چیزوں سے حاصل کرتا ہے، تین وہ چیزیں جن کا وہ طالب اور خواہش مند ہوتا ہے: رزق میں کشادگی، لوگوں میں قدر وعزت اور آخرت کے لیے زادِ راہ، وہ چار چیزیں جن کی ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے ضرورت ہوتی ہے: بہترین طریقے سے مال حاصل کرنا، پھر اپنے مال کی بہترین حفاظت کرنا، پھر اس میں بڑھوتری،

پھر اس سے معاش کی درستگی، اہل وعیال اور بھائیوں کی رضا جوئی میں خرچ کرنا،

جس کا فائدہ اسے آخرت میں حاصل ہوگا۔26

دونوں ترجموں کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ پہلا ترجمہ زبان اور تکنیک کے اعتبار سے زیادہ آسان ہے بالمقابل دوسرے ترجمے کے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا اس صورت میں مداخلت کے زیادہ امکان ہوتے ہیں اور یہاں بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔ دوسرا ترجمہ متن سے زیادہ قریب ہے اس میں اصل کے اسلوب اور ترتیب کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہی طرز اختیار کی گئی ہے جو اصل کی ہے۔ الفاظ میں جدت لانے کے بجائے حقیقی معنوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔

فقال دمنة لأخيه كليلة: ياأخي، ماشأن الأسد مقيماً مكانه لايبرح ولاينشط؟! قال له كليلة: ماشأنك أنت والمسألة عن هذا؟! نحن على باب مَلِكنا آخذين بما أحبّ، وتاركين مايكره. ولسنا من أهل المرتبة التي يتناول أهلها كلام الملوك والنظر في أمورهم. فأمسك عن هذا. واعلم أنه مَنْ تكلّف من القول والفعل ماليس من شأنه أصابه ماأصاب القرد من النجار۔27

دمنہ نے اپنے بھائی کلیلہ سے کہا: بھائی! کیا بات ہے کہ شیر آجکل اپنی جگہ سے کہیں جاتا نہیں، وہیں جما بیٹھا ہے، کلیلہ نے کہا: تمہیں اس بات سے کیا تعلق؟ ہم تو اپنے بادشاہ کے ماتحت ہیں، جو اس کو پسند ہو اس کو انجام دینا اور جو ناپسند ہو اس کو چھوڑ دینا بس یہی ہمارا کام ہے، ہم ان اہل مقام ومنزلت میں سے نہیں ہیں جن کو بادشاہوں کے معاملات میں غور وفکر کرنے یا دخل دینے کا حق ہوتا ہے، لہذا تم اس کے چکر میں مت پڑو، اور یہ بات دھیان میں رکھو کہ جو شخص بتکلف ایسی بات کہے یا ایسا کام کرے جو اس کے مطلب یا حیثیت کا نہیں ہے تو اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو بندر کا بڑھئی کی جانب سے ہوا۔28

مذکورہ بالا ترجمے میں مترجم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ترجمے کو سہل اور آسان رکھا جائے ۔ مترجم نے اصل عبارت کے الفاظ کی پیروی کے بجائے اس کے مفہوم کو اخذ کر کے اپنے طور پر بیان کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس سے اخذ مفہوم بہت آسان ہو جاتا ہے؛ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس مرحلے تک رسائی کے مترجم کو کئی طرح کی مداخلت سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے اسی متن کا دوسرا ترجمہ ملاحظہ کریں جس میں اصل عبارت کی اتباع کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

دمنہ نے اپنے بھائی کلیلہ سے کہا: بھائی جان! یہ شیر اپنی جگہ پڑا ہوا کیوں رہتا ہے؟ نہ اپنی جگہ سے ہلتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی چستی پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہے، اس سے کلیلہ نے کہا: تمہیں اس کے بارے میں پوچھنے کی کیا ضرورت؟ ہم اپنے بادشاہ کے در سے اس کی پسند کو لیں گے، اور اس کی ناپسند کو ترک کر دیں گے، ہمارا وہ مقام و مرتبہ نہیں کہ ہم بادشاہ کو موضوع بحث بنائیں، اور اس کے امور پر نظر کریں، لہٰذا تم اس سے رک جاؤ، جو شخص اس بات کو یا اس کام کو بتکلف اپناتا ہے جس کا وہ اہل نہیں ہوتا تو اسے اسی چیزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس سے بندر بڑھئی کی جانب سے دوچار ہوا تھا۔29

مابعد الذکر ترجمہ متن سے قریب ہے، اصل عبارت کے مطابق ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ تسہیل کے نظریہ سے دیکھیں تو پہلا ترجم زیادہ آسان ہے۔

فأصبح لا مالٌ ولا جاهَ يُرتجى
ولا حسناتٌ تلتقي في كتابهِ
وجُوزِى بالأمر الذي كان فاعلا
وصبَّ عليه اللهُ سَوط عذابه

پس مال رخصت ہو گیا اور جاہ کی توقع بھی باقی نہ تھی اور نامہ عمل نیکیوں سے خالی ہو گیا۔

اسے اسکے [اس کے] کرتوتوں کا بدلہ اور بھی دیا جائیگا [جائے گا] اور اللہ تعالیٰ اسپر [اس پر] اپنے عذاب کا کوڑا برسائینگے [برسائیں گے]۔30

اظہار بیان کو سادہ اور قابل رسا بنانے کے لیے مترجم نے دونوں شعروں کے ترجمے میں مفہوم کو بیان کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔الفاظ کا تتبع نہیں کیا بس مفہوم کو اخذ کیا اور اسے اپنے پیرائے میں بیان کر دیا۔ جیسا کہ سابق میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں مترجم کو مداخلت سے کام لینا پڑتا ہے۔اس سے متن کی ترکیب اور ساخت ترجمے میں نظر نہیں آتی۔

توضیح

مونا بیکر نے توضیح کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"an overall tendency to spell things out rather than leave them implicit in translation to make implicit information more explicit." 31

(عمومی رجحانی یہی ہے کہ ترجمہ میں چیزوں کو مبہم چھوڑنے کے بجائے مبہم اطلاعات کو واضح کیا جاتا ہے)

ہر زبان میں کچھ مخصوص الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا۔اس لفظ کا مکمل معنی صرف اسی زبان میں ادا ہوسکتا ہے۔اس قسم کے الفاظ عموماً تہذیبی ساخت اور سماجی رسوم ورواج کے لیے ہوتے ہیں۔یہی حال نئے الفاظ یعنی اصطلاحات کے ساتھ ہوتا ہے۔جس سے زیادہ تر سابقہ علمی متون کے ترجموں میں پڑتا ہے۔مختلف نئی اصطلاحیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔دوسری زبانوں میں ان اصطلاحات کے متبادل اصطلاحات تیار کرنے میں وقت لگتا ہے۔نیز اگر اصطلاحات تیار بھی ہو جاتی ہیں تو ابتدا میں ان کے مفہوم کو واضح کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔یہ الفاظ متن میں اتنے اہم ہوتے ہیں جب تک ان کو سمجھ نہ لیا جائے مفہوم تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

اس سلسلہ میں مترجم اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے اپنی زبان میں مناسب لفظ تلاش کرتا ہے اگر مل جائے تو بہتر ورنہ ہدفی متن میں اصل لفظ کو رکھ دیتا ہے اور اس کی توضیح یا تو قوسین کا استعمال کر کے کرتا ہے یا حاشیہ میں اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔بہت سے مترجمین اس قسم کے الفاظ کی توضیح کے لیے علاحدہ فرہنگ

الفاظ تیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ طریقہ علمی متون کے ترجمے میں عام ہے۔ صحافتی تراجم میں چونکہ آزادی ہوتی ہے اس لیے متن میں اس کی توضیح کر دی جاتی ہے۔ ادبی تراجم میں قوسین وغیرہ کا استعمال عبارت کی روانی اور قاری کے مزاج پر گراں گزرتا ہے اس لیے زیادہ تر حاشیہ لگانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پیچیدہ الفاظ کی توضیح کے ساتھ ساتھ ترجمہ میں اکثر ایسی چیزوں کو بھی واضح کر دیا جاتا ہے جو واقعی پیچیدہ نہیں ہوتی ہیں بس ذرا سا مبہم ہوتی ہیں یا ان کی تعیین نہیں ہوتی ہے۔ اس کی مثال ہے:

> For example, "students of St. Mary's" may become "étudiantes de l'école St. Mary" in translation, where the French specifies that the students are women and St. Mary's is a school. 32

انگریزی میں صرف students کہا گیا ہے ان کے جنس کی وضاحت نہیں تھی لیکن فرنچ میں اس کی وضاحت ہے۔ اسی طرح St. Mary کیا ہے، اسکول ہے یا کالج اور کوئی ادارہ یہ بھی واضح نہیں تھا لیکن فرنچ ترجمہ میں یہ توضیح کر دی گئی کہ وہ اسکول ہے۔

مختارات کے ترجمے لمعات الذہب میں الخطابۃ المعجزہ کے عنوان سے حضرت ابوسعید خدریؓ کی گفتگو مذکور ہے۔" عن ابی سعید الخدری قال "مترجم نے اس کا ترجمہ کیا:

> ''حضرت ابوسعید (سعد بن مالک الانصاری متوفی 74ھ بعمر 84 سال) خدریؓ سے روایت ہے۔'' 33

مترجم نے قوسین میں راوی کا نام، ولدیت، سن وفات اور عمر سب واضح کر دیا۔ اسی طرح مترجم نے ایک طویل حاشیہ بھی لکھا ہے جس میں اس تحریر کا تفصیلی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ یہ بھی دراصل مذکورہ تحریر کی توضیح کے لیے ہی لکھا گیا ہے تا کہ قاری کے سامنے پورا نقشہ آ جائے۔ اسی طرح مختارات کے ہی ترجمہ بیان المختارات میں بھی ابوسعید خدری پر حاشیہ لگایا گیا ہے اور دیگر تفصیلات نام، کنیت اور نسبت وغیرہ

ذکر کی گئی ہیں۔34

بسا اوقات مترجم پیچیدگی یا اغماض کو دور کرنے کی غرض سے نہیں بس توضیح مفہوم کے لیے بھی جملے میں اضافہ کر دیتا ہے۔ جملے میں چند الفاظ ذکر کر دیتا ہے جس سے بات مزید واضح ہو کر سامنے آجائے۔ مختارات کی ایک عبارت کا ترجمہ دیکھیے:

"قال يا رسول الله ما أنا الا من قومي"35

مبشرات فی حل مختارات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''تو اس نے کہا یا رسول اللہ میں بھی اپنی قوم میں سے ہوں اور ان کا ایک فرد ہوں۔''36

اصل متن اور ترجمہ شدہ متن کا تقابل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'اور ان کا ایک فرد ہوں' یہ جملہ اضافی ہے، متن میں موجود الفاظ سے اضافہ کرتے ہوئے برائے وضاحت اسے بڑھایا گیا ہے۔ یہاں کسی قسم کا ابہام نہیں ہے لیکن اس کے باوجود مترجم نے محض مطلب کو مزید منکشف کرنے کے لیے ایک مختصر جملے کا اضافہ کر دیا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک دوسرا ترجمہ بھی ملاحظہ کریں۔ صاحب بیان المختارات نے اس کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ میں اپنی قوم ہی سے ہوں۔''37

اس ترجمے کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل متن نے جتنی گنجائش دی اسی اعتبار سے الفاظ استعمال کیے گئے۔ جتنی عبارت ہے اتنا ہی ترجمہ ہے۔ مترجم نے مفہوم کی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی اور کسی زائد لفظ کا اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔

کسی ابہام یا پیچیدگی کے نہ ہوتے ہوئے لفظ کو بڑھانے کی اور مثال ملاحظہ کریں:

''راوی کہتے ہیں مہاجرین صحابہؓ آئے آپ نے ان کو جانے دیا وہ اندر داخل ہو گئے اور دوسرے لوگ آئے تو آپ نے ان کو لوٹا دیا (واپس کر دیا)''۔38

اس ترجمے میں قوسین میں 'واپس کر دیا' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ بطور وضاحت بھی اس اضافے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی ہے پھر بھی مترجم نے اس کا اضافہ کیا ہے ظاہر ہے اس کا مقصد توضیح متن ہی ہوگا۔ متن کی وضاحت کے لیے ایسا اضافہ بھی مداخلت کے ضمن میں آتا ہے۔ اس کو ایک اور مثال سے اور بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے:

أبوذر: كلّا و انما أردت نصيحتك. انك شاب جلد تستطيع أن تعمل فتكسب من عملك.

ثعلبه: أي عمل أعمل؟39

اس کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے:

ابوذرؓ نہیں۔ نہیں، بلکہ میرا ارادہ تو صرف نصیحت کرنے کا ہے کہ تو ایک مضبوط جسم کا نوجوان ہے اور کام کر کے کما سکتا ہے۔

ثعلبہ: لیکن کون سا کام کروں؟ مجھے کوئی کام نہیں ملتا۔40

اصل متن میں دوسرے مکالمے میں صرف ایک جملہ ہے 'أي عمل أعمل؟ مترجم نے اپنے ترجمے میں اس جملے کا تو ترجمہ کیا ہی ساتھ میں ایک اور جملہ 'مجھے کوئی کام نہیں ملتا' اپنی طرف اضافہ کر دیا۔ اگر یہ اضافہ نہ ہوتا تب بھی اخذ مفہوم میں کسی قسم کی کوئی دشواری پیش نہیں آتی بالکل یہی معنی لیا جاتا؛ لیکن مصنف نے بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اور ذہنی مشقت کو یکسر ختم کرنے کے لیے اس جملہ کا اضافہ کر دیا جو کہ مداخلت برائے توضیح کے ذیل میں داخل ہے۔

بسا اوقات مترجم اصل متن کو واضح کرنے کے لیے جو توضیح کرتا ہے وہ تشریح کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ کبھی عبارت میں اور اکثر و بیشتر قوسین میں پورے پس منظر کو بیان کر دیتا ہے۔ مختارات من ادب العرب کا ایک جملہ ہے:

"تألفت بها قوماً ليُسلموا"41

اس عبارت کا اصل سے قریب ترین ترجمہ اس طرح ہوسکتا ہے:

''جس کی وجہ سے میں نے ایک قوم کو مانوس کیا ہے تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں'' 42

قریب قریب یہی ترجمہ بیان المختارات میں حافظ بلال اشرف نے کیا ہے:

''میں نے اس کے ساتھ ایک قوم کو مانوس کیا ہے تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں'' 43

یہ دونوں ترجمے اصل سے قریب ہیں اوران میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کیا گیا نہ ہی کوئی توضیح کی گئی ہے بس اتنے ہی مفہوم کو بیان کیا گیا ہے جتنا اصل متن کی عبارت میں الفاظ کی گنجائش ہے؛ لیکن ایسے ترجمے بھی موجود ہیں جن میں وضاحت کی گئی ہے۔ مترجم نے اپنی جانب سے واقعہ کو یا مفہوم کو مزید قابل رسا بنانے کے لیے توضیح و وضاحت سے کام لیا ہے۔ دو ترجمے ایسے ہیں جن میں اس طریقہ کار کو اختیار کیا گیا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو:

''جس کے ذریعے میں نے ایک قوم کو (اسلام سے) مانوس کیا۔ اور (تالیف قلبی کی) تا کہ وہ اسلام لے آئیں'' 44

مذکورہ بالا ترجمہ بھی سابق میں مذکور دونوں ترجموں کے مشابہ ہے بس اس میں دو جگہوں پر قوسین کا اضافہ کر کے تشابہ کو رفع کر دیا گیا ہے اور تالیف قلبی کا ذکر کر کے ایک خاص اصطلاح کو ذکر کر دیا گیا ہے۔ اب ایک اور ترجمہ ملاحظہ کریں جس میں طویل توضیح سے کام لیا گیا ہے:

''اس کے ذریعے میں کسی قوم کے ساتھ الفت و محبت سے پیش آیا تا کہ وہ اسلام لے آئیں (اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو مولفہ قلوبہم میں داخل تھے آپ ﷺ نے انکو مال دیا تا کہ وہ اسلام پر جمے رہیں)''۔ 45

جہاں تک صرف ترجمے کا تعلق ہے اس ترجمے میں بھی قریب اصل کے ہی ترجمہ کیا گیا ہے صرف دو مترادف ''الفت و محبت'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے بعد قوسین میں ایک طویل تشریح کی گئی ہے جو کہ متن کے مفہوم کی توضیح کے لیے کی جانے والی مداخلت ہے۔

بسا اوقات اصل متن میں ایسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن کی معنوی جہت وسیع ہوتی ہے۔ ایسی

صورت میں مترجم یوں کرتا ہے کہ اصل لفظ کو استعمال کر کے قوسین میں یا بلا قوسین اس کی تشریح کر دیتا ہے۔ ایسے مقامات پر تشریح کی ضرورت بلاشبہ محسوس ہوتی ہے لیکن تعبیر تو اسے مداخلت سے ہی کیا جائے گا۔اس کی مثال ملاحظہ کریں؛

"الأنصار شعار والناس دثار" 46

مختارات کا ایک ترجمہ لمعات الذہب کے نام سے عتیق الرحمٰن سیف نے کیا ہے۔ انہوں نے اس عبارت کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے:

''انصار تو شعار ہیں (یعنی مجھ سے ان کا اتصال بہت ہی قوی اور مستحکم ہے) اور دیگر لوگ دثار ہیں (یعنی ان کا اتصال مجھ سے اتنا مستحکم نہیں ہے)''۔ 47

اس ترجمے میں بالکل لفظ کے مطابق ترجمہ کیا گیا ہے لیکن قوسین میں اس کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ تشریح برائے توضیح مطلب ومفہوم ہے۔لفظ کے اصل معنی کو ذکر نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس سے نکلنے والے مرادی مفہوم کو ذکر کیا گیا ہے۔اس کے دیگر تراجم میں بھی یہ اس قسم کی توضیح موجود ہے۔کسی ترجمے میں قوسین کی خاصی پابندی کی گئی ہے جب کہ بعض میں قدرے اغماض سے کام لیا گیا ہے۔البتہ لفظ کے اصل معنی کی طرف ضرور اشارہ کیا گیا ہے۔

''انصار، شعار (بدن سے لگا ہوا کپڑا) کی مانند ہیں اور دوسرے لوگ دثار (اوپر اوڑھنے والا کپڑا) کی مانند ہیں۔ 48

اس ترجمے میں لفظ کا متبادل لانے کے بجائے اصل لفظ کو ہی ضبط کیا گیا اور اس کا معنی قوسین میں ذکر کر دیا گیا ہے۔غور کرنے کی بات ہے کہ اس میں تشبیہ کا معنی پیدا کیا گیا ہے حالانکہ متن میں تشبیہ کا لفظ موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔اس کے علاوہ جو ترجمے دیکھے گئے سب میں مبتدا خبر کی ترکیب سے ہی ترجمہ کیا گیا ہے۔توضیح متن کے لیے مترجم کی جانب سے کی جانے والی مداخلت ہے۔

بیان المختارات میں درج ترجمہ ملاحظہ کریں:

''انصار نیچے والا کپڑا ہیں اور لوگ اوپر والا کپڑا ہیں، (یعنی انصار کی حیثیت

اسلام میں ایسے ہے جیسے نیچے والا کپڑا ہے)''۔49

اس ترجمے میں ترجمے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دونوں مشکل الفاظ کو بعینہ استعمال کرنے کے بجائے ان کا آسان ترجمہ کیا گیا ہے؛ لیکن قوسین میں اس کی توضیح کی گئی ہے۔ توضیح میں بھی اسی ترجمے کے لفظ کو باقی رکھا گیا ہے جس سے توضیح کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے اس لیے مترجم نے اخذ مطلب قاری کے ذہن کے حوالے کر دیا ہے۔

مبشرات میں اس کا ترجمہ اس انداز سے کیا گیا ہے:

''انصار بدن سے متصل ہونے والا کپڑا ہیں یعنی میرے قریبی ہیں اور باقی لوگ

گرم کپڑا ہیں''۔50

اس ترجمے میں ترجمہ اور توضیح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے قوسین کا التزام نہیں کیا گیا ہے۔ پورا ترجمہ ہی وضاحت آمیز ہے۔ اصل متن کے لفظ کو استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ پہلے لفظ کا ترجمہ کرنے کے بعد اس کی توضیح کی گئی 'یعنی میرے قریبی ہیں'؛ لیکن دوسرے لفظ کا ترجمہ کرنے بعد اس کی توضیح نہیں کی گئی مزید یہ کہ دثار کا ترجمہ گرم کپڑا کیا گیا ہے۔ مترجم نے متن کا لحاظ کرنے کے بجائے مرادی معنی مذکور کر دیا۔ حالانکہ یہ معنی درست نہیں معلوم ہو رہا ہے؛ کیوں کہ یہ ضروری تو نہیں کہ گرم کپڑا بدن سے منفصل ہو، متصل بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کے معنی متعین کرنے اور توضیح متن دونوں اعتبار سے متن میں مداخلت سے کام لیا گیا ہے۔

علی احمد باکثیر کا ڈرامہ الأسیر الکریم ''خبیب بن عدی'' کچھ اس انداز سے شروع ہوتا ہے:

"(فی بیت من بیوت سراۃ مکۃ)

(الصبی عامر یقبل مسرعاً الی أمه الجاسة فی الحجرة)"51

اس ٹکڑے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''(سرداران مکہ کے گھروں میں سے ایک گھر۔ ایک بچہ تیزی سے دوڑتا ہوا اپنی

ماں (جلیلہ) کے پاس آتا ہے جو کہ ایک کمرے میں بیٹھی ہے۔ بچہ، جس کا نام
عامر ہے کہتا ہے)''۔52؎

اس ڈرامے کا ایک کردار جلیلہ ہے جو کہ عامر کی ماں ہے۔ مصنف نے مذکورہ اصل عبارت میں اس نام کو ذکر نہیں کیا ہے لیکن مترجم نے قوسین میں ہی سہی اس کا نام ظاہر کر دیا۔ مصنف نے قارئین کو پہلے سے مانوس کرنے کے لیے یا برائے توضیح یہ اضافہ کیا ہے جو کہ اصل متن کے اندر مداخلت ہے۔

ہبہ الدباغ کے ناول خمس دقائق وحسب کا ترجمہ میمونہ حمزہ نے کیا ہے۔ توضیح کی ایک مثال اس ترجمے سے ملاحظہ کریں:

کنت وقد دنا منتصف الليل لاأزال أطارد السطور المتراقصه
على كتاب الفقه وأجهد في استيعاب المعلومات استعدادا
لامتحانات آخر السنة صباح الغد۔53؎

اس کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

میں آدھی رات گزرنے کے بعد بھی فقہ کی کتاب پر جھکی ہوئی تھی اور ابھی تک
رقص کرتی سطور سے معنی تلاش کرنے میں لگی ہوئی تھی، بلکہ زیادہ سے زیادہ
معلومات ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی، کیونکہ صبح میرا سال آخر کا امتحان
تھا۔54؎

اصل متن کو سامنے رکھتے ہوئے ترجمہ شدہ متن کا موازنہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مترجم نے متن کو سامنے رکھ کر توضیحی انداز میں واضح اور سلیس ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مداخلت ضرور ہوئی ہے لیکن ترجمہ نہایت عمدہ معلوم ہو رہا ہے۔

محذوف کا بیان

زبان کی ایک اہم خاصیت محذوفات ہیں۔ یہ ایجاز کی ایک قسم ہے۔ ایجاز بلاغت کا اہم جز ہے۔ ایجاز سے مختصر عبارت میں زیادہ معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ اس کا استعمال درحقیقت ذہن کو غور و فکر کی دعوت

دینے کے لیے کیا جاتا ہے۔اس کے پس پشت یہ منطق کارفرما ہوتی ہے کہ جب قاری کومفہوم تک رسائی کے لیے ذہن لگانا پڑے گا تو اس کولطف بھی آئے گا اور مطلب بھی ذہن نشین ہوگا۔اگر سب کچھ واضح ہوتو پھر مزا پھیکا ہوجاتا ہے۔شاعری کی معنوی تہہ داری اسی لیے تو مستحسن قرار پائی ہے۔

اس جگہ دو باتیں ذہن نشین رہنی چاہئیں ۔اول یہ کہ ہر زبان میں ایجاز یا محذوفات یکساں نہیں ہوتے اور نہ ہی ہر زبان میں ان کی اہمیت یکساں ہوتی ہے۔بعض زبانوں میں ایجاز کوزیادہ ترجیح دی جاتی ہے اوراس کومتن کی خوبصورتی پرمحمول کیا جاتا ہے مثلاً عربی زبان میں ایجاز کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔عربی کامشہور مقولہ ہے ترك الذكر افصح من الذكر (مذکورنہ کرنامذکورکرنے سے کہیں زیادہ فصیح ہے)۔ابن جنی نے عربی زبان کے متعلق کہا ہے:

"ان اللغة العربية اكثر وسائلهافی التعبير هو المجاز'55

(عربی زبان میں تعبیر کااہم ترین وسیلہ مجاز ہے)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایجاز کے لیے عربی میں کس قدر محذوفات سے کام لیا جاتا ہے۔ چنانچہ عربی میں جملے، لفظ، حروف، اسماء، افعال تک حذف کئے جاتے ہیں۔ جب کہ بعض زبانوں میں محذوفات کارواج ہوتا ہے لیکن اس قدر نہیں بلکہ ان میں ایجاز یا حذف کے بجائے بیان کوترجیح دی جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ یہ محذوفات اہل زبان کی حدتک پسندیدہ ہوتے ہیں۔ وہ اس کے محذوف تک رسائی حاصل کرلیتے ہیں اوراس سے محظوظ بھی ہوتے ہیں؛لیکن بسا اوقات اہل زبان کوبھی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔غوروفکر کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو مسئلہ بغیر ماہر زبان کی مدد کے حل ہونا مشکل ہوجاتا ہے۔ان محذوفات کودوسری زبان میں اسی طرح منتقل کرنا دشوار ہے۔اولاً اس بات کاعلم ہونا ضروری ہے کہ ہدفی زبان کے مزاج میں ایجاز کا عنصر کتنا ہے اوراہل زبان محذوفات سے آشنا ہیں یا نہیں؛ کیوں کہ ہر زبان کے محذوفات کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے۔ دوم یہ کہ اگر محذوفات کی تکشیف میں اہل زبان مشکلات سے دوچار ہوسکتے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ ہدفی قارئین ایک غیر زبان کے محذوف تک کس طرح بہ آسانی رسائی حاصل کرسکیں گے۔

عربی میں لفظ قسم کے لیے باللہ کا استعمال عام ہے؛ حالانکہ یہ محذوف ہے اقسم باللہ کا لیکن عام ہونے کی وجہ سے ذکر کی ضرورت نہیں۔ ہم ہر روز بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہیں اس میں لفظ ابتدا محذوف ہے یعنی ابتدا باسم اللہ۔ اگر صرف باسم اللہ الرحمن الرحیم کا ترجمہ کریں تو معنی ہوگا ''اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان بڑا رحیم ہے''۔ ظاہر کہ اس صورت میں یہ جملہ مفید نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس میں ابتدا یعنی ''میں شروع کرتا ہوں'' کا اضافہ نہ کریں۔

اسی طرح شرط کا حذف تو بالکل عام ہے۔ مثلاً ''میری بات مان لو ورنہ بہت پچھتاؤ گے''۔ پورا جملہ ہوگا ''مری بات مان لو (اگر نہیں مانوں گے) تو بہت پچھتاؤ گے''۔ قاری یا سامع کے ذہن میں پہلے سے ہی یہ بات موجود ہے یا وہ سمجھ رہا ہے اس لیے اس کو ذکر کرنا محض اضافی ہے۔

محذوفات کی ہزاروں مثالیں ہر زبان میں موجود ہوتی ہیں جو اہل زبان بخوبی سمجھتے ہیں؛ لیکن ترجمہ میں اس بات کا حتمی امکان نہیں ہوتا کہ ہدفی قارئین بھی اس محذوف کو وا کر کے اس کے مفہوم تک پہنچ جائیں گے؛ کیوں کہ ان کے ذہن میں ان محذوفات کے تکملے موجود ہوں یہ ضروری نہیں۔ اس لیے مترجم اس قسم کے محذوفات کو واضح کرتا ہے۔ اگر محذوف کا متبادل نظام زبان میں موجود ہوتا ہے تو اس کو اپنی زبان کے ہم آہنگ محذوف میں منتقل کر دیتا ہے ورنہ اس کی توضیح کو ترجیح دیتا ہے۔

مثال کے طور پر مختارات کی ایک عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"قال فأين أنت من ذلك يا سعد. قال يا رسول الله ما أنا الا من قومي۔"[56]

مبشرات فی حل مختارات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''تو آپ نے فرمایا اس بارے میں تیرا حال اور خیال کہاں ہے تو اس نے کہا یا رسول اللہ میں بھی اپنی قوم میں سے ہوں اور ان کا ایک فرد ہوں۔''[57]

اسی عبارت کا ترجمہ لمعات الذہب میں اس طرح کیا گیا ہے۔

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اے سعد! کیا تم بھی ان میں سے ہو؟ تو سعدؓ نے عرض

کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ) میں اپنی قوم میں سے ہوں!۔'' 58

بیان المختارات میں حافظ بلال اشرف نے یوں ترجمہ کیا ہے:

''آپ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! تو اس معاملے سے کہاں ہے؟ کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اپنی قوم ہی سے ہوں۔'' 59

ایک اور ترجمہ دیکھ لیجئے:

''آپؐ نے فرمایا! اے سعد! تم اس کو لینے کے لیے کہاں تھے؟ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں بھی اپنی ہی قوم میں سے ہوں۔'' 60

ان چاروں ترجموں میں جو لفظ توجہ طلب ہے وہ قال یا رسول اللہ ہے یعنی جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت سعدؓ سے دریافت کیا تو انہوں نے جواباً عرض کیا۔ اصل عبارت میں لفظ قال ہے جو واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اس میں ھو کی ضمیر مخفی ہے جو لوٹ رہی رہے حضرت سعد کی طرف۔ تین ترجموں میں ضمیر کو مخفی ہی رکھ کر بالترتیب ''تو اس نے کہا یا رسول اللہ''، ''کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ!'' اور ''انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ!'' کیا گیا ہے؛ لیکن ایک ترجمے میں اس ضمیر کو واضح کر کے ''تو سعدؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول (ﷺ)'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ ضمیر کی جگہ مرجع کا ذکر کرنا بنیادی طور پر متن میں مداخلت ہی ہے جو مترجم متن کے مفہوم و مطلب کو مزید واضح کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔

عربی زبان میں صیغوں کے اندر ضمائر مخفی ہوتے ہیں۔ ترجمے کے دوران مترجم بسا اوقات ان ضمائر کے مراجع ذکر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ضمائر کے مراجع متعین کرنے کے لیے قواعد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضمیر کے مرجع کی تعیین ذرا مشکل و مشتبہ ہوتی ہے اس صورت میں مترجم کو پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ ایک ہی متن کا ترجمہ کرنے والے کئی مترجمین الگ الگ مرجع بیان کر دیں۔ اس کو ایک مثال کے ذریعے بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔ مختارات من ادب العرب کی ایک عبارت ہے:

"قال فجاء رجال من المهاجرين فتركهم فدخلوا و جاء آخرون فردهم" 61

اس عبارت میں دو ضمائر ہیں جن کا مرجع طے کرنا ہے، ایک قال کی ضمیر اور دوسرے فترك اور فردّ کی واحد مذکر غائب کی ضمیریں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ مترجمین نے اس کے کیا مراجع ذکر کیے ہیں۔ انوارات میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

''آپؓ فرماتے ہیں کہ چنانچہ مہاجرین میں سے کچھ لوگ آئے، انہوں نے (یعنی میں نے) ان کو چھوڑا اور وہ داخل ہو گئے اور کچھ اور لوگ بھی آئے۔ ان کو بھی انہوں نے (یعنی میں نے) روکا''62

اس ترجمہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ راوی اور لوگوں کو چھوڑنے اور روکنے والے فرد دونوں ایک شخص ہیں۔ البتہ یہ طے نہیں ہے کہ یہ حضرت سعد بن عبادہ ہیں یا حضرت سعید خدری، یہ بات یاد رہے کہ اس واقعہ کے راوی حضرت سعید خدری ہیں اور واقعہ سعد بن عبادہ کے متعلق ہے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ دونوں ایک فرد ہیں تو راوی نے خود کو واحد متکلم کے صیغے کے بجائے واحد غائب سے کیوں ذکر کیا۔ بہر حال دوسرا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''ابوسعید کہتے ہیں کہ پھر مہاجرین کے کچھ حضرات آئے تو ان کو آپؐ نے چھوڑ دیا تو وہ داخل ہو گئے اور کچھ حضرات اور آئے تو ان کو واپس کر دیا''۔63

اس ترجمے میں دونوں ضمائر کا مرجع بالکل واضح ہے۔ قال کی ضمیر سے مراد راوی واقعہ ابوسعید خدری ہیں اور فترك اور فردّ کی ضمیر کا مرجع آپؐ ہیں جب کہ سابقہ ترجمے میں دونوں صحابہ میں سے کوئی ایک مرجع تھا اس طرح دونوں ترجموں میں واضح تضاد نظر آ رہا ہے۔ ایک اور ترجمہ کا جائزہ لیا جائے۔

''راوی کہتے ہیں مہاجرین صحابہؓ آئے آپ نے ان کو جانے دیا وہ اندر داخل ہو گئے اور دوسرے لوگ آئے تو آپ نے ان کو لوٹا دیا (واپس کر دیا)''۔64

اس ترجمے میں قال کی ضمیر کا مرجع طے ہے کہ راوی واقعہ یعنی حضرت ابوسعید خدریؓ مراد ہیں لیکن بعد کی دونوں ضمیروں کا مرجع متعین نہیں کیا گیا۔ یہی طریقہ ایک اور ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔

''وہ کہتے ہیں (مراد ابوسعید خدریؓ)، پھر مہاجرین کے کچھ آدمی آئے تو ان کو چھوڑ

دیا سو وہ داخل ہو گئے اور کچھ دوسرے لوگ آئے تو ان کو لوٹا دیا''۔65

سابقہ ترجمے کی طرح اس ترجمے میں بھی قال کی ضمیر کا مرجع ذکر کر دیا گیا ہے لیکن دیگر دو ضمائر کا مرجع ذکر نہیں کیا گیا ہے آیا اس سے کون مراد ہیں۔ راوی کے مراد ہونے کا امکان نہیں لگ رہا ہے بقیہ یا تو سعد بن عبادہ یا آپ ؐ مراد ہو سکتے ہیں۔

ان تمام ترجموں کا ضمیر کے مرجع کو ذکر کرنے یا نہ کرنے اور مرجع متعین کرنے کے حوالے سے جائزہ لیا جائے تو متن میں دو طرح مداخلت نظر آتی ہے۔ اول یہ کہ متن میں ضمیر کو مخفی رکھا گیا تھا۔ اس کے مرجع کو (عربی اسلوب کے مطابق) ذکر نہیں کیا گیا تھا لیکن اردو ترجمے میں کہیں مرجع کو ذکر کیا گیا اور کہیں مخفی رکھا گیا۔ جہاں مخفی رکھا گیا وہاں اصل سے مطابقت پیدا کی گئی لیکن جہاں ظاہر کر دیا گیا وہاں متن سے اختلاف کیا گیا۔ دوم یہ کہ مرجع متعین کرنے میں اختلاف اور تضاد موجود ہے۔ بہر دو صورت یہ ترجمے میں مداخلت ہی ہے۔

مخففات کی تکمیل

انگریزی زبان میں مخففات کے لیے دو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ایک abbreviations اور دوسرا acronyms۔ اردو میں بالترتیب اس کا متبادل ''مخفف'' اور ''سرنامیہ، تتمہ'' ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ سرنامیہ کا تلفظ ایک لفظ کی طرح کیا جاتا ہے جیسے NATO (ناٹو)۔

مخففات کا استعمال زیادہ تر ناموں، علوم، اصطلاحات اور فارمولوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ گزشتہ نصف صدی سے اس کا استعمال بہت عام ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں ہمیشہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے حتی کہ عام زندگی میں ہم ہر وقت SIM, SMS, CD, DVD, PD, PC جیسے الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں اور اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ہم اس شئے کے پورے نام سے ناواقف ہوتے ہیں اور اس مخفف کو پورا نام سمجھتے ہیں۔ مخفف اپنی ہیئتی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی طور پر اصطلاح ہی کی طرح ہوتا ہے۔ اس سے بولنے اور لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مخففات کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس کا استعمال بڑی حد تک زبان کے مزاج پر منحصر ہے۔ مخففات کا سب سے زیادہ اور کثرت سے استعمال انگریزی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ انگریزی کی بیشتر کتابوں میں مخففات کی علاحدہ فہرست شائع کی جاتی ہے۔ تاکہ تحریر کی طوالت سے بچا جاسکے اور حسب ضرورت قارئین ان کی مکمل شکل سے استفادہ کرسکیں۔

اردو زبان میں مخففات کا رواج بہت کم ہے۔ ہمارے یہاں رائج مخففات انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ ہمارے یہاں بہت سے نشانات اور علامات کا شمار بھی مخففات میں ہوتا ہے مثلاً ''ع'' مصرع کے لیے ''ص'' صفحہ کے لیے، ''ج'' جلد کے لیے، ''ق'' ورق کے لیے۔ اسی طرح کچھ مخففات دعائیہ جملوں کے رائج ہیں جیسے علیہ السلام کے لیے ''ؑ''، رضی اللہ عنہ کے ''ؓ''، رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ''ؒ'' وغیرہ۔ ان کا استعمال بھی بہت عام نہیں ہے بلکہ اس کے بجائے اب ان کو مختصراً دوسرے انداز سے لکھنے کو ترجیح دی جاتی ہے جیسے ﷺ۔ اس کے علاوہ ناموں میں بھی کہیں کہیں مخففات دیکھنے کو نظر آجاتے ہیں جیسے ن۔ م۔ راشد، ظ۔ انصاری وغیرہ۔ اس کے علاوہ عموماً جو مخففات نظر آتے ہیں وہ انگریزی زبان سے ہی مستعار یا دخیل ہوتے ہیں؛ کیوں کہ مخففات اردو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں تو انگریزی سے مستعار الفاظ کے مخففات کا رواج بھی نہیں ہے جیسے کہ عربی میں ڈاکٹر کے لیے ''د'' لکھتے ہیں۔

مخففات مترجمین کے لیے بہت ہی اہم مسئلہ ہوتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ کہ ایک مخفف کی کئی کئی مکمل شکلیں بھی ہوتی ہیں مثلاً PO کی تین مکمل شکلیں ہوسکتی ہیں: post office, postal order, petty officer۔ ایسی صورت میں اگر کتاب میں اس کی فہرست موجود ہے تو بہتر ورنہ مترجم کو صحیح مکمل شکل کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے مخففات کی منتقلی کا معاملہ ہے۔ مثلاً کسی انگریزی متن کا اردو میں ترجمہ کرنا ہو اور اس میں مخففات ہوں تو مترجم کو دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ انہیں مخففات کو باقی رکھے اور ترجمہ میں بھی اس کی فہرست شامل کردے تو سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوگا کہ اسے کس رسم الخط میں لکھے انگریزی میں یا اردو رسم الخط میں۔ اگر انگریزی رسم الخط میں Target Lnaguage کا مخفف TL ہے اور اسے اردو میں استعمال کرے اور بار بار TL کی تکرار ہو تو متن کی سلاست اور خوبصوری متاثر ہوگی اور اگر اس کے اردو متبادل ''ہدفی زبان'' کا مخفف تشکیل دے کر ''ہ، ز''

استعمال کرتا ہے تو زبان کے مزاج سے ٹکراؤ کی صورت سامنے آئے گی۔ایسی صورت میں مترجم کے لیے ایک ہی راہ ہوتی ہے کہ وہ اس مخفف کو مکمل شکل میں لکھے۔اس سے زبان کا مزاج بھی سلامت رہے گا۔قارئین کو گرانی نہیں ہوگی دوسرے قارئین کو مفہوم تک رسائی میں آسانی ہوگی۔انہیں مخففات کے تکملات کی تلاش کے پیچھے نہیں بھاگنا پڑے گا۔

رموز واوقاف کا اضافہ

متن کی تفہیم میں رموز واوقاف کی بڑی اہمیت ہے۔اس میں معمولی ہیر پھیر سے مفہوم غارت اور کچھ کا کچھ ہوجائے۔ایک مثبت بات بالکل برعکس ہوکر منفی ہوجائے گی۔ان کیفیات یا احساسات کی ترجمانی میں بڑی مدد لی جاتی ہے۔پوری صورت حال بیان کرنے کے بجائے اگر ان کا استعمال کردیا جاتا ہے تو قاری کے سامنے پوری کیفیت واضح ہوجاتی ہے۔مثلاً ایک جملہ ہے ''خون خرابہ ہوگیا'' اگر اس کے بعد ختمہ کی علامت ''۔'' ہے تو یہ ایک بیان ہوگا،اگر سوالیہ نشان ''؟'' ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ کوئی سوال کررہا ہے،اگر سکتہ ''،'' ہے تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کے بعد بھی کچھ کہنا ہے،اگر فجائیہ ''!'' ہے تو اس سے حیرت واستعجاب اور کرب کی کیفیت کا اظہار ہوگا۔اس طرح محض رمز سے کیفیت بیان ہوجاتی ہے اس کی تشریح کے لیے مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔اسی طرح ان کی مدد سے جملہ کے درمیان ربط بھی معلوم ہوتا ہے۔اگر یہ علامتیں نہ ہوں تو مفہوم میں التباس کا اندیشہ رہے گا۔

اگر متن میں رموز واوقاف کا استعمال نہ کیا جائے تو تحریر ذہن پر گراں گزرنے لگتی ہے۔نجیب محفوظ کے ناول 'الحب تحت المطر' کا ترجمہ 'بارش تلے محبت' کے نام سے عائشہ کمال نے کیا ہے جو برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال کے زیر اہتمام قومی کونسل کے تعاون سے 2002 میں شائع ہوا ہے۔اس ترجمے میں رموز و اوقاف کا قدرے لحاظ نہیں رکھا گیا ہے:

> ''لوگوں کی بھیڑ ایک سیلاب کی طرح جو ہر سمت موجیں ماررہا تھا اس میں مختلف
> طبقات کی آوازیں اٹھ رہی تھیں جو اپنی مجموعی شکل میں خواب نظر آنے والے
> مختلف خیالات کی عکاسی تھیں وہ دونوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے وہ کتھئی مختصر کی
> میکسی پہنے تھی اس کے سیاہ بال سر اور پیشانی پر پڑے تھے وہ نیلی قمیص اور بھورا

پتلون پہنے تھا اس کے بال داہنی طرف گرے ہوئے تھے اس کی آنکھوں میں
حقیقت امر دریافت کرنے کی میٹھی خواہش تڑپ رہی تھی اس کی آنکھوں میں ہلکا
سا ابھار تھا یہ ابھار اس کی سیدھی، کھڑی ستواں ناک کے موافق تھا جتنی وہ چلنے
میں مگن تھی اتنا ہی وہ موقع کی تلاش میں تھا''۔66

اگر بغیر توجہ کے سرسری طور پر مذکورہ عبارت پڑھی جائے تو طبیعت پر شاق گزرنے کے ساتھ مفہوم کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔رموز واوقاف متن کو انہیں نقائص سے پاک کرنے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔قاری کے ذہن کو خلط معنی سے بچاتے ہیں۔

ترقی یافتہ زبانوں میں اس کا چلن عام ہے۔جیسے کہ انگریزی زبان میں رموز واوقاف سے بڑا کام لیا جاتا ہے۔خصوصاً انگریزی کے طویل جملے انہیں کی مدد سے لکھے جاتے ہیں۔ جملہ معترضہ کو بیان کرنے کے لیے ان کا استعمال ہوتا ہے اگر یہ نہ ہو تو ایک ایسا جملہ، جس کا جملہ کے تسلسل سے ربط نہیں ہے جملے کا حصہ بن جائے گا اور اس کو حل کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں اس کا رواج نہیں تھا۔بغیر کسی علامت کے پوری پوری تحریر لکھ دی جاتی تھی۔یہی وجہ ہے کہ قدیم کتابوں کی تدوین جدید کر کے ان میں رموز واوقاف کا اضافہ کیا جاتا ہے تاکہ مفہوم میں خلط ملط نہ ہو۔اگر مفہوم میں التباس کے ڈر سے خود اسی زبان میں اس کا التزام کیا جاتا ہے تو ترجمہ میں اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جہاں زبان ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔

مترجم مفہوم تک رسائی کو آسان بنانے کے لیے ایسی کتابوں کے ترجمہ کے دوران جن میں رموز واوقاف کا التزام نہیں کیا گیا ہے ہدفی متن میں حسب ضرورت ان کا اضافہ کرتا ہے۔خصوصاً ڈراموں اور ناولوں کے ترجمے میں اس کا استعمال خوب ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہاں کیفیات کا اظہار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اگر اصل متن میں اس کا التزام نہیں کیا گیا تو مترجم اپنی طرف سے ان کا اضافہ کرتا ہے۔جس سے ربط مضمون بھی قائم ہوتا ہے، کیفیات کا اظہار بھی ہوتا ہے اور قاری تک معنی کی رسائی بھی آسان ہوتی ہے۔مختارات کی ایک عبارت بطور مثال ملاحظہ فرمائیں۔اصل عبارت میں رموز واوقاف کا بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔

عـن ابـي سـعيـد الخدرى قال لما اعطى رسول الله صلى الله عـليـه وسـلم ما أعطى من تلك العطايا الكبار في قريش و في قبـائل الـعرب ولم يكن في الأنصار منها شيٌ وجد هذا الحي مـن الأنـصـار فـى أنـفسهـم حتـى كثرت فيهم القالة حتى قال قـائـلهـم لـقـي والـلـه رسول الله صلى الله عليه وسلم قومه، فـدخـل عليه سعد بن عبادة فقال يا رسول الله ان هذا الحي مـن الأنـصـار قد وجدوا عليك في أنفسهم لما صنعت في هذا الـفـيٌ الذي اصبت قسمت في قومك واعطيت عظامافي قبائل الـعرب ولم يكن في هذا الحيمن الأنصار منها شيٌ۔ قال فأين انـت مـن ذلك يـا سـعد؟قال يا رسول الله ماأنا الا من قومي! قـال فـاجـمـع لـي قومك في هذه الحظيرة قال فجاء رجال من المهاجرين فتركهم فدخلوا وجاء آخرون فردّهم فلما اجتمعوا أتـى سـعـد فـقـال قد اجتمع لك هذا الحي من الأنصار فأتاهم رسـوالله صلى الله عليه وسلم فحمد الله و أثنى عليه بما هو أهله ثم قال:67

لیکن اس کا ترجمہ کیا گیا تو مترجم نے اپنی صوابدید اور جدید اصول تحریر کوملحوظ رکھتے ہوئے رموز و اوقاف کا اضافہ کر کے اسے مزین کر دیا:

''ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قریش اور قبائل عرب میں ان بڑے بڑے عطیوں سے دیا جو دیا، اور انصار میں ان سے کوئی چیز نہیں تھی، انصار کے اس قبیلے نے اپنے دلوں میں غصہ پایا حتیٰ کہ ان میں افواہ زیادہ ہوگئی، یہاں تک کہ ان کے کہنے والے نے کہا: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ اپنی قوم سے مل گئے ہیں، تو آپ پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ داخل ہوئے اور کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بلا شبہ انصار کے اس قبیلے

نے یقیناً آپ پر اپنے دلوں میں غصہ پایا ہے، اس وجہ سے کہ جو آپ نے اس مال فئ میں کیا ہے، جسے آپ نے پایا ہے، آپ نے اپنی قوم میں تقسیم کیا ہے اور عرب کے قبائل میں بڑے بڑے عطیے دیے ہیں اور انصار کے اس قبیلے میں ان سے کوئی چیز نہیں ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! تو اس معاملے میں کہاں ہے؟ کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اپنی قوم ہی سے ہوں، آپ نے فرمایا: تو اپنی قوم کو میرے لیے اس حویلی میں جمع کر، وہ کہتے ہیں (مراد ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ)، پھر مہاجرین کے کچھ آدمی آئے تو ان کو چھوڑ دیا سو وہ داخل ہو گئے اور کچھ دوسرے لوگ آئے تو ان کو لوٹا دیا، چنانچہ جب وہ جمع ہو گئے تو سعد رضی اللہ عنہ آئے، اور کہا: بے شک انصار کا یہ قبیلہ آپ کے لیے اکٹھا ہو گیا ہے، پھر رسول اللہ ﷺ! ان کے پاس تشریف لائے تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اس چیز کے ساتھ بیان کی جس کا وہ لائق ہے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا:'' 68

اصل متن کے مذکورہ پورے پیراگراف میں محض چند رموز واوقاف کا استعمال ہوا تھا جب کہ اس کے مقابلے میں ترجمہ شدہ عبارت میں بے شمار رموز واوقاف کا استعمال کیا گیا ہے۔ ترجمے میں ہونے والی یہ مداخلت مفہوم کی ترسیل میں بے حد موثر و معاون ثابت ہوتی ہے۔

اردو زبان میں چوں کہ اس کا رواج بہت زیادہ نہیں ہے جب کہ انگریزی متون میں جیسا کہ بیان کیا گیا اس سے بڑا کام لیا جاتا ہے لہذا ہمارے مترجم کو بسا اوقات اس کے برعکس بھی کرنا پڑتا ہے اور مصنف کی علامات سے مترشح ہونے والی کیفیات کو کبھی لفظوں میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈرامے کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"جليلة: عامر، ماخطبك؟

عامر: (يدخل لاهثاً) ان خالي عقبة قد جاء بأسير معه.

جليلة: أين يا عامر؟

عامر: أدخله المربد فحبسه فيه. يقولون انه من أصحاب

محمد۔

جليلة: من أصحاب محمد... ما الذي جاء به الى خالك؟"69

خاور بٹ صاحب نے اس کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے:

جلیلہ: کیا بات ہے عامر؟

عامر: (بچہ ہانپتے ہوئے) ماموں عقبہ اپنے ساتھ ایک قیدی لائے ہیں۔

جلیلہ: کہاں ہے وہ؟

عامر: اصطبل میں اسے قید کردیا ہے۔وہ کہتے ہیں یہ محمدﷺ کے صحابیوں میں سے ہے۔

جلیلہ: (انتہائی حیرانی اور تعجب کے انداز میں کہتی ہے) اصحاب محمدﷺ میں سے؟ اور وہ تمہارے ماموں کے ہاتھ کیسے لگا؟70

اس پوری عبارت اور اس کے ترجمے میں موضوع گفتگو صرف آخری جملہ ہے لیکن امر واقعہ کی توضیح کے لیے اس سے پہلے کی عبارت بھی نقل کی گئی۔عربی عبارت کے اعتبار سے جب جلیلہ کا بیٹا عامر اسے یہ بتاتا ہے کہ وہ اصحاب محمدﷺ میں سے ہیں تو اس کی ماں اسی جملے کو دہراتی ہے۔عربی املا میں اس کے ساتھ نہ تو فجائیہ ہے نہ سوالیہ نشان ہے صرف ایک دو وقفے کا نشان ہے پھر دوسرا جملہ شروع ہو رہا ہے کہ''وہ تمہارے ماموں کے ہاتھ کیسے لگا''اور اس کے بعد سوالیہ نشان ہے۔ترجمے میں مترجم نے اس صورت حال کی مزید بہتر منظر کشی کے لیے قوسین میں ایک جملے کا اضافہ کردیا''انتہائی حیرانی اور تعجب کے انداز میں کہتی ہے''۔یہ اضافہ بنیادی طور پر متن کے اندر مداخلت کے ذیل میں آتا ہے۔مترجم کبھی رموز واوقاف کا اضافہ کردیتا ہے اور کبھی اس سے مترشح ہونے والے معانی کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔دونوں صورتیں مداخلت ہی کے زمرے میں داخل ہوں گی۔ہاں یہ ضرور ہے کہ اس سے اخذ مفہوم کی راہ آسان ہوجاتی ہے۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

خبيب: يـا أخـت بني الحارث لو قد سمعت من محمد كما سمعنا ما قلت هذا. أتحبين أن أسمعك شيئاً مما جاء به من عند الله؟ 71

خبیب: اے بہن! کاش تم نے بھی نبیﷺ سے سنا ہوتا جو ہم نے سنا ہے۔

(جیسے رسول اللہ ﷺ سے کلام سننے کی حلاوت اس وقت محسوس کر رہے ہوں) کیا

وہ آپ سننا پسند کریں گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔؟72

مترجم نے پورے منظر نامے کو اور بہتر انداز میں پیش کرنے کے لیے قوسین میں خبیبؓ کی اس وقت کی کیفیت کو بیان کیا۔ اسی کے ساتھ مصنف نے 'اے بہن' کے بعد فجائیہ کا بھی اضافہ کیا ہے جو کہ اصل متن میں نہیں تھا۔ مترجم کا یہ اقدام مداخلت کا حصہ ہے۔

رموز واوقاف کے استعمال سے لہجے کی شناخت کرنے اور کیفیت کا ادراک کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اگر اصل متن میں رموز واوقاف کا استعمال نہ ہو یا کم ہو تو مترجم اس کا اضافہ کر دیتا ہے، کبھی ان سے مترشح ہونے والی کیفیت یا اس کے لہجے کو الفاظ میں بیان کر دیتا ہے۔ کبھی ایسی صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ مترجم بحیثیت ہدفی قاری خود اس لہجے کی گرفت سے معذور ہو جاتا ہے یا اس سے سہو ہو جاتا ہے۔ اس کو ایک مثال سے بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے:

قال التاجر: صدقت، قد بلغني هذا الحديث.73

خورشید انور ندوی اس کا ترجمے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تاجر نے کہانی سن کر کہا: تم سچ کہتے ہو، یہ کہانی میں نے بھی سنی ہے۔74

کلیلہ دمنہ کے ایک اور اردو مترجم رفیع الدین حنیف کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

تاجر نے کہا: کیا تم نے سچ کہا: مجھے یہ بات معلوم ہو چکی ہے۔75

مذکورہ ترجموں کے جائزے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلے ترجمے میں اصل کے مطابق رموز واقاف استعمال ہوئے ہیں اور اخذ مفہوم میں بھی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں لگ رہی ہے، وہیں دوسرے ترجمے میں رموز واوقاف کا استعمال صحیح نہیں ہے۔ 'کیا تم نے سچ کہا' کے بعد کولن (:) کا استعمال صحیح نہیں ہے کیوں کہ یہاں سے کوئی بات نہیں کہی جا رہی ہے؛ بلکہ لہجہ سوالیہ لگ رہا ہے لہذا سوالیہ نشان ہونا چاہیے تھا، اور اگر سوالیہ جملہ ہے جیسا کہ لگ رہا ہے تو یہ اصل کے ساتھ مداخلت ہے؛ کیونکہ اصل میں تو صدقت، خبریہ ہے۔

ڈسکورس

مداخلت کے اسباب میں ایک اہم سبب ڈسکورس ہے۔ڈسکورس بہت ہی پیچیدہ اصطلاح ہے۔مختلف شعبہ ہائے علم اور موضوعات میں اسے مختلف انداز سے برتا جاتا ہے۔لسانیاتی تحقیق میں جملہ کو بنیادی لسانی اکائی قرار نہیں دیا جاسکتا؛ کیوں کہ زبان لفظ یا جملوں کے بجائے متصل ڈسکورس میں سامنے آتی ہے۔ڈسکورس سے وہ معنی اور خصوصیات آشکارا ہوتے ہیں جو متفرق جملے سے ظاہر نہیں ہوتے۔اس لیے ڈسکورس کے تجزیہ میں زبان کا مطالعہ استعمال کنندگان اور اس سیاق کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے جس میں وہ زبان استعمال کر رہے ہیں۔

ڈسکورس طریقۂ سخن، زبان کا استعمال، لہجے اور کسی مخصوص معاشرے میں قابل قبول بیانات سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔کسی بھی ڈسکورس میں یہ تمام اجزا شامل ہوتے ہیں۔ڈسکورس کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مخصوص نظریات کے حامل افراد کسی چیز یا نظریہ کے متعلق کیا اور کس طرح گفتگو کرتے ہیں اور وہ اس گفتگو سے کیا معنی مراد لیتے ہیں؛ کیوں کہ ہر گفتگو کا اپنا خاص مزاج اور رنگ بھی ہوتا ہے۔مذکورہ بالا تعریف دراصل ڈسکورس کے متعلق فوکو کے نظریہ کی توضیح ہے۔فوکو ڈسکورس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ways of constituting knowledge, together with the social practices, forms of subjectivity and power relations which inhere in such knowledges and relations between them. Discourses are more than ways of thinking and producing meaning. They constitute the 'nature' of the body, unconscious and conscious mind and emotional life of the subjects they seek to govern. 76

(سماجی افعال، موضوعیت کی اقسام اور طاقت کے رشتوں کے باہم علم کی تشکیل کے

طریقے جو اس قسم کے علوم اور ان کے درمیان رشتوں میں موجود ہوتے ہیں۔اس
سے بڑھ کر ڈسکور طرز فکر اور تولید معنی کے طریقے ہیں۔وہ جسم کی 'ماہیئت'، شعوری اور
غیر شعوری ذہن اور عاطفی زندگی اپنے مرضی کے مطابق تشکیل کرتے ہیں)

گوپی چند نارنگ ساختیات پس ساختیات میں ڈسکورس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب کوئی امر واقعہ بیان کیا جائے تو وہ بیان 'ڈسکورس' نہیں ہے۔وہ 'روداد' یا بیان
محض ہے۔لیکن جب بیان میں 'موضوع' یعنی بولنے والے کا تداخل ہو، اور راوی
اور سامع (یا مصنف اور قاری) کا تصور در آئے، نیز یہ منشا بھی کہ سامع (یا قاری)
کو بدلیل متاثر کرنا مقصود ہے، تو ایسا بیان، بیان محض نہیں، 'ڈسکورس' ہے۔'' 77

مذکورہ بالا تعریفات سے ڈسکورس کے متعلق جو نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اس میں باقاعدہ خیالات کی تشکیل اور نظریات کا تبادلہ ہوتا ہے۔یوں کہہ سکتے ہیں کسی موضوع پر موزوں اور منظّم اظہار خیال، سماجی یکسانیت، زبان اور اس کے مستحکم سیاق میں پیوست علم، خیالات، یا تجربہ کو منظّم کرنے کا طریقہ ڈسکورس ہے۔لسانی اعتبار سے ڈسکورس تحریر و تقریر کا وہ مربوط نظام ہے جو جملوں کی بڑی لسانی یونٹ ہے۔

انسانوں کی ذہنی ساخت مختلف ہے۔یہی وجہ ہے کہ موجودات عالم اور دنیا میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق ہر فرد کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ہر فرد کسی چیز کے متعلق مختلف انداز سے غور و فکر کرتا ہے۔نقاط نظر کا مرکز تفریق محدود ہوتا ہے بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے ان میں نقطۂ امتزاج ہوتا ہے جو کسی مخصوص مقام پر متحد ہو جاتا ہے۔اگر مجموعی طور پر متحد نہیں ہوتا ہے تو کم از کم ایک خاص طبقے، علاقے یا گروہ میں ضرور متحد ہو جاتا ہے۔اس اتحاد کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مخصوص طبقے یا علاقے کے لوگ مختلف چیزوں میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں۔یہی شرکت ان کے تجربات میں یکسانیت پیدا کرتی ہے اور تجربات میں یکسانیت نظریات میں اتحاد کا موجب بنتی ہے۔مثال کے طور پر ہندوستان میں بدعنوانی کے متعلق لوگوں کے الگ الگ نظریات ہوں گے۔اس کی توضیح و تعریف، اس کے پھیلاؤ پر لوگ مختلف اراء رکھتے ہوں گے لیکن اس بات پر سب متحد ہوں گے ہندوستان کی ترقی کی راہ میں اہم رکاوٹ بدعنوانی ہے۔

اس طرح نظریات کا اتحاد زندگی کے مختلف میدانوں میں پایا جاتا ہے۔اس کے پس پشت بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جن میں مذہب، ثقافت، تعلیم، ماحول اور علاقہ بہت ہی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسئلہ فلسطین کو لے لیجئے پورے عالم اسلام میں عوام الناس کے نظریات تقریباً متحد ہیں کہ فلسطین مظلوم ہے؛ چنانچہ کوئی بھی مسلمان مصنف جب بھی فلسطین کا ذکر کرے گا یا فلسطین کے متعلق کوئی بھی مضمون لکھے گا تو چاہے اس کا موضوع کچھ بھی ہو اور کسی بھی قسم کے اعداد و شمار تیار کیے جائیں، چاہے وہاں کی حکومت کا ذکر کیا جائے، وہاں کے جغرافیائی حالات بیان کئے جائیں جو کچھ بھی ہو اس کی تحریر میں فلسطین کی مظلومیت کا کہیں کہیں عکس ضرور نظر آئے گا۔اس کے برخلاف کئی مسلم ممالک کی حکومتیں اس سلسلہ میں عام مسلمانوں سے مختلف نظریہ رکھتی ہے لہذا جب سرکاری سطح پر کوئی متن تیار کیا جائے گا تو اس میں مظلومیت کی جھلک مدھم نظر آئے گی۔

تحریر و تقریر میں اس قسم کے اثرات کا ظہور یوں تو ہوتا ہی ہے اس میں مصنف کی دانستہ کوشش کو دخل نہیں ہوتا لیکن بسا اوقات اس زبان، موضوعات اور معاشرے میں رائج ڈسکورس کی وجہ سے اس کا غلبہ ہوتا ہے۔مصنف و مقرر کی دانستہ کوشش اس کے پس پردہ کام کرتی ہے۔دانستہ تاثر کی مثال ہمیں سیاسی تحریروں و مباحث میں بہ آسانی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔اسی طرح اس کی بہترین نظیر صحافتی تحریریں بھی ہیں۔

اگر متن کی تیاری کسی مخصوص ڈسکورس سے کے دائرے میں ہوئی ہو تو ممکن ہے کہ وہ دوسرے ڈسکورس سے مزاحم ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہم تحریروں میں سماجی سیاق اور مقصدیت پر بھی غور کرتے ہیں کہ اس کے پس پشت کون سے عوامل کارفرما ہیں؛ کیوں کہ متون اپنے ظاہری معنی کے ساتھ کچھ داخلی کیفیات بھی رکھتے ہیں۔مثلاً ایک شخص کی سوانح ترتیب دینی ہے۔اس کی سوانح تین لوگ لکھتے ہیں ایک ایسا فرد جو اس شخص کا معتقد ہے، دوسرا جس کے دل میں اس شخص کے تئیں منفی رجحان ہے، تیسرا وہ شخص جو نہ معتقد ہے او رنہ ہی اس کے متعلق منفی رجحان رکھتا ہے۔تینوں کی تحریریں یکے بعد دیگرے پڑھیں ہر تحریر جدا معلوم ہوگی؛ گو کہ سب ایک شخص کی سوانح لکھ رہے ہیں ظاہر ہے حالات بھی ایک ہی لکھیں گے۔اسی وجہ سے متن کو لسانی یونٹ کے بجائے مکمل طور پر دیکھنا چاہیے۔

مستشرقین کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جنہوں نے علوم اسلامیہ جیسے سیرت، اسلامی تاریخ، مغازی، اسلامی اصول وقوانین وغیرہ بہت سے موضوعات پر بے شمار لکھا۔ کیا ان کی تحریریں اسلامی علوم کا سرمایہ ہیں؟ نہیں ہیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کے پس پردہ ایک بہت بڑا عامل اسلام کے متعلق ان کا ڈسکورس تھا۔ وہ اسلام کے متعلق لکھتے تو تھے لیکن ان کا ڈسکورس مسلمانوں کے ڈسکورس سے مختلف ہے۔

ہندوستان میں سامراجی استعمار کے تسلط کے بعد آزادی کی اولین منظّم کوشش 1857 میں ہوئی۔ اس کوشش کو اہل ہند پہلی جنگ آزادی کہتے ہیں اور سامراجی انگریزوں نے اسے ''غدر'' کا نام دیا۔ انگریزی حکومت کے خلاف لڑنے والے افراد ہماری نظر میں مجاہد آزادی freedom fighter ہیں جب کہ انگریزی حکومت کی نظر میں وہ باغی تھے۔

اسی طرح حقوق نسواں، حقوق انسانی، حقوق اطفال کے متعلق مختلف ڈسکورسز قائم ہیں۔ نسائیت کے تعلق سے مغربی ڈسکورس کے مطابق دونوں جنس کو کلی یکساں حقوق حاصل ہیں۔ جب کہ اسلامی ڈسکورس اس سلسلے میں مختلف ہے یہاں عورت و مرد دونوں برابر تو ہیں لیکن کلی طور پر نہیں۔ دونوں بحثیت انسان ہونے کے برابر حقوق رکھتے ہیں لیکن دونوں کے میدان کار مختلف ہیں۔

کوئی بھی نیا نظریہ یا ڈسکورس ہدفی زبان، ثقافت اور ہدفی قارئین کے لیے ایک اجنبی چیز ہوتا ہے چناں چہ ان کے لیے اس میں وضاحت کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ اسے قبول نہیں کر پاتے۔ ہدفی سیاق کے فریم میں وہ چیز اس لیے فٹ نہیں ہو پاتی کیوں کہ زبان مزاحم ہوتی ہے۔ ڈسکورس کی تبدیلی کا مطلب ہے ہدفی زبان میں رائج قدیم تصورات کی مخالفت اور یہ عمل زبان اور اہل زبان دونوں پر بہت شاق ہوتا ہے۔

ڈسکورس کی ترجمہ میں منتقلی بہت دشوار گزار مرحلہ ہے۔ گو کہ مترجم کا اصل مقصد اور منشا نقل مفہوم ہے لیکن مترجم کو اپنی زبان اور ہدفی قارئین کے مزاج و ماحول کا پاس ولحاظ کرنا ہی پڑتا ہے اور اگر نہ کرے تب بھی کسی نہ کسی حد تک لحاظ ہو ہی جاتا ہے۔ اس بات کا بہت امکان ہوتا ہے کہ مترجم کا ڈسکورس بھی مصنف کے ڈسکورس سے مختلف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل ڈسکورس اور دوسرے ڈسکورس کی حامل زبان میں ترجمہ شدہ ڈسکورس میں کسی نہ کسی حد تک اختلاف ہوگا۔

آئیڈیالوجی ڈسکورس کا حصہ ہوتی ہے جس کے اظہار کا ذریعہ زبان بنتی ہے۔ Van Dijk(1997, 2001) نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ آئیڈیالوجی ڈسکورس میں مرتسم ہوتی ہے۔اور چوں کہ آئیڈیالوجیز یا ڈسکورسز جدا ہوتے ہیں اس لیے ترجمہ میں اس کا اثر ہونا ناگزیر ہے۔ یہ اثر کیوں ہوتا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''آئیڈیالوجی ڈسکورس میں مرتسم ہوتی ہے۔اس لیے ترجمے بھی آئیڈیالوجی میں مرتسم ہوں گے کیوں کہ ترجمہ تشکیل اور بازتشکیل کا عمل ہے۔آئیڈیالوجی انفرادی معتقدات کا نام ہے نتیجتاً مختلف مترجمین الگ الگ آئیڈیالوجی کے حامل ہوتے ہیں؛ چنانچہ وہ سیاسی متون کا ترجمہ مختلف انداز سے کرتے ہیں۔اس بات کا امکان ہے کہ جو مترجمین حزب اختلاف کی حمایت کرتے ہیں وہ سیاسی ڈسکورس کا ترجمہ الگ انداز سے کریں گے اور اصل زبان میں بیان کردہ آئیڈیالوجیز کی تئیں مختلف موقف پیش کریں گے۔یہی وجہ ہے کہ مختلف ترجموں میں الگ الگ آئیدیالوجیز کی جھلک ملتی ہے۔اس بات کا امکان ہے کہ یہ چیز ساخت میں اختلاف کے طور پر ظاہر ہو۔''(ترجمہ)[78]

چناں چہ جب کسی ایسے متن کا ترجمہ ہوتا ہے جس کے ڈسکورس اور مترجم یا مترجم کے ہدفی قارئین کے وقوفی ماحول کے ڈسکورس میں اختلاف ہوتا ہے تو اس سے ہدفی متن کافی کچھ تبدیل ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی مختلف سطح پر ہوتی ہے۔اس اختلاف کی وجہ بہت حد تک استعمال کنندگان کی تفریق ہے کیوں کہ ہر کوئی اس کے ساتھ الگ برتاؤ روا رکھتا ہے:

the meaning potential of items within the language system (...) is exploited by a variety of users, each within their own context and for their own purposes.[79]

(لسانی نظام میں مختلف استعمال کنندگان کی جانب سے معنوی قوت کا استحصال

ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے سیاق اور اپنے مقصد کے لیے اس کا استعمال کرتا ہے)

ہر شخص کسی خاص نظریے کا حامل یا کسی عقیدے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ کفیت انسان کے اندرون میں اس طرح پیوست ہوجاتی ہے کہ اس کے اعمال وافعال اور اقوال سے اس کی غیر شعوری طور پر بھی ترجمانی ہونے لگتی ہے۔ اگر مصنف یا مترجم اس جانب خصوصی توجہ نہ دے تو بسا اوقات صورت حال یکسر تبدیل ہوجاتی ہے۔ اصل متن یا اصل متن کے کرداروں نظریاتی اختلاف یا تفریق میں بھی اس صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ڈرامے چند مکالمے مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

عامر: أدخله المربد فحبسه فيه. يقولون انه من أصحاب محمد.

جليلة: من أصحاب محمد..ماالذي جاء به الى خالك؟

عقبة: كان محمد قد بعثه فيمن بعث الى بني حذيل ليعلموهم الاسلام فوثب الهذليون وباعوهم الينا.

عقبة: (يضحك) أجل..ليتركُنّ تجارة الأنعام. و يتجرنّ في أتباع محمد!

جليلة: (في غيظ) ويلك، تُضرب و تقول الحمد لله. أهكذا أمركم صاحبكم محمد؟

جليلة: اسكت. و الله لأضربنك حتى تكفر بصاحبك.80

ان جملوں کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے۔

عامر: اصطبل میں اسے قید کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ محمدﷺ کے صحابیوں میں سے ہے۔

جلیلہ: (انتہائی حیرت اور تعجب کے انداز میں کہتی ہے) اصحاب محمدﷺ میں سے؟ اور وہ تمہارے ماموں کے ہاتھ کیسے لگا؟

عقبہ: محمدﷺ نے بنی ہذیل کو اسلام سکھانے کے لیے اپنے جن صحابیوں کو بھیجا تھا۔ یہ انہیں میں سے ایک ہے، بنی ہذیل نے ان پر دھوکے سے حملہ کر کے گرفتار کر لیا

اور پھر گرفتار کر کے ہمارے ہاتھ بیچ دیا۔

عقبہ: (ہنستے ہوئے) ہاں انہوں نے مویشیوں کی تجارت چھوڑ کر اصحاب محمد ﷺ کی تجارت شروع کر دی ہے۔

جلیلہ: (غصے کی حالت میں) تمہیں موت آئے، مار کھاتے اور الحمد للہ کہتے جاتے ہو، کیا تمہارے رسول ﷺ نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟

جلیلہ: خاموش رہو! خدا کی قسم تمہیں اتنا ماروں گی کہ محمد ﷺ کا انکار کر دو گے۔81

مذکورہ بالا اقتباس میں درج کردہ مکالمے جن تین کرداروں نے ادا کیے ہیں وہ تینوں ہی حالت کفر میں ہیں اور انہوں نے ایک صحابی رسول کو اپنے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بہ ارادہ قتل قید کیا ہوا ہے۔ مصنف نے جن الفاظ کا انتخاب کیا ہے وہ کرداروں کے عقیدے اور عربی اسلوب و مزاج سے ہم آہنگ اور کرداروں کے ڈسکورس کے مطابق ہیں لیکن مترجم نے کرداروں کے ڈسکورس اور نظریے کی طرف بقدر ضرورت توجہ نہیں دی اور ایسے لفظوں کا انتخاب کیا جو مترجم کے ڈسکورس سے تو میل کھاتے ہیں لیکن کرداروں کے ڈسکورس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ جہاں جہاں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام آیا ہے وہاں وہاں مترجم نے درود یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کا استعمال کیا ہے۔ ایک کافر رسول اللہ ﷺ پر درود کیوں کر بھیج سکتا ہے وہ بھی ایسی حالت میں جب وہ مسلمانوں کا جانی دشمن بنا ہوا ہے۔

پہلے جملے میں عامر اپنے ماموں عقبہ کے حوالے سے کہتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ انہ من أصحاب محمد 'یہ محمد ﷺ کے صحابیوں میں سے ہے'۔ اسی طرح تیسرے جملے میں عقبہ یہ کہتا ہے کہ 'محمد ﷺ نے بنی ہذیل کو اسلام سکھانے کے لیے اپنے جن صحابیوں کو بھیجا تھا۔ یہ انہیں میں سے ایک ہے'۔ صحابی ہماری اردو زبان میں بطور لفظ نہیں بلکہ بطور اصطلاح استعمال ہوتا ہے۔ صحابی وہ مسلمان جس نے حالت ایمان میں نبی ﷺ کو دیکھا ہوا اور اسلام کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا ہو۔ عامر کا کردار جس عقیدے کی نمائندگی کر رہا ہے وہ اس نبوت کو تسلیم ہی نہیں کرتا اسلامی عقائد کا منکر ہے تو صحابی کا خطاب کیسے دے سکتا ہے۔

جلیلہ اپنے بھائی عقبہ سے خبیب بن عدی کے بارے میں پوچھتی ہے کہ یہ تمہارے ہاتھ کیسے لگا تو وہ

اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ بنی ہذیل کے لوگوں کو اسلام سکھانے کے لیے جن لوگوں کو بھیجا گیا تھا یہ ان میں سے ایک ہے، پھر اصل واقعے کے طرف اشارہ کرتا ہوئے کہتا ہے کہ 'بنی ہذیل نے ان پر دھوکے سے حملہ کر کے گرفتار کر لیا اور پھر گرفتار کر کے ہمارے ہاتھ بیچ دیا'۔ مترجم نے مصنف کے ذریعے استعمال کردہ لفظ 'وثب' کا ترجمہ 'دھوکے سے حملہ کرنا لکھا ہے' جو کہ لفظ کا حقیقی معنی نہیں ہے۔ 'وثب' کے معنی ہیں:

وَثَبَ یَثِب وَثباً: کودنا، اچھلنا، اٹھ کھڑا ہونا

وَثَبَ علیٰ فلان: کسی پر غالب آنا، حملہ کرنا، چڑھ دوڑنا۔82

امر واقعہ تو یہی ہے کہ بنی ہذیل کے لوگوں نے دین سیکھنے کے لیے کچھ مسلمانوں کو اپنے پاس بلایا اور ان پر دھوکے سے حملہ کر دیا۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ ایک کافر اپنے ہم نواؤں کے بارے میں ایسا کیوں کر کہے گا کہ 'حملہ دھوکے سے کیا گیا'۔ وہ تو اس کو کامیابی اور بہترین چال متصور کرے گا جو اس کے لیے لائق تحسین بھی ہو سکتی ہے۔ نیز مصنف کے استعمال کردہ لفظ سے بھی یہ بات مترشح نہیں ہوتی۔ مترجم نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ اس کے ڈسکورس کا حصہ ہے جو کہ کردار اور وہ جن کے حوالے سے گفتگو کر رہا ہے ان کا ڈسکور مختلف ہے۔ دونوں کے ڈسکورس کے اختلاف کی وجہ سے ترجمے میں مداخلت کی یہ صورت حال درپیش آئی۔

جلیلہ خبیب بن عدیؓ کو مار رہی ہے اور وہ الحمدللہ کہتے جاتے ہیں، اس بات پر جلیلہ اور غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے کہ 'تمہیں موت آئے، مار کھاتے ہو اور الحمدللہ کہتے جاتے ہو، کیا تمہارے رسول ﷺ نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟'۔ مصنف نے اصل عبارت میں 'صاحبکمْ' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صاحب کا معنی ہے:

الصاحب: ساتھی، ایک ساتھ زندگی بسر کرنے والا، مالک، وزیر، گورنر۔83

مترجم نے صاحب کا ترجمہ رسول سے کیا ہے جو کہ مکمل طور پر متن میں مداخلت ہے۔ جلیلہ کفر کی حالت میں ہے۔ کفار کا اصل اعتراض تو آپ ﷺ کی رسالت سے ہی تھا۔ اگر وہ رسول مان لیتے تو سارا مسئلہ ہی رفع تھا۔ اس لیے کردار کی زبان سے رسول کا لفظ کسی طرح موزوں نہیں ہے۔ اس مداخلت کی بنیادی وجہ دونوں کے ڈسکورس کا اختلاف ہے۔

کسی متن کا معنی اگر ہر کوئی اپنے سیاق اور اپنے مقصد کے اعتبار سے اخذ کرے گا تو ڈسکورس پر بھی اس کا اثر ظاہر ہوگا۔ چناں چہ Célia Maria Magalhães لکھتی ہے:

> Thus when there are different worldviews and discursive histories divergent discourses and texts are created. The process of text interpretation may then be affected by the ideological shifts realised through lexical choices, cohesive relations, syntactic organisation, text structure and text types. 84
>
> (لہذا جب دنیا میں مختلف عالمی نظریات اور استدلالی تواریخ ہیں تو مختلف ڈسکورسز اور متون تخلیق ہوتے ہیں۔ چناں چہ نظریاتی منتقلی سے ترسیل متن کا عمل بھی متاثر ہوسکتا ہے جس کا ادراک انتخاب الفاظ، مربوط تعلقات، نحوی تنظیم، متنی ڈھانچہ اور متن کی اقسام سے ہوگا)

ڈسکورس کے اختلاف کا اثر متن میں کس طرح اور کہاں کہاں ظاہر ہوسکتا ہے اس کا اندازہ مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

مترجم کو بہر طور پر اپنے معاشرے میں رائج اور وقوفی ماحول میں قابل قبول ڈسکورس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مترجم چاہتے ہوئے اس سے انحراف نہیں کرسکتا خواہ اسے ترجمے میں کوئی راہ نکالنی پڑے اور اس میں حذف و اضافہ سے کام لینا پڑے۔ مثال کے طور پر نوبل انعام یافتہ ناول نگار نجیب محفوظ کے ایک شاہکار ناول 'القاہرہ الجدیدۃ' کا ترجمہ شعبۂ عربی علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر فیضان بیگ نے 'آئین نو' کے نام سے کیا ہے۔ ناول میں جنسی مسائل پر کھل کر گفتگو کی گئی اور کسی مخصوص حجاب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے جس کا اردو کے اندر منتقل کرنا دشوار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کے مروجہ ڈسکورس میں اس کی گنجائش نہیں بنتی۔ لوگوں کے لیے اس کو ہضم کرنا دشوار ہوگا۔ چنانچہ مترجم موصوف خود رقم طراز ہیں:

’’دوسرا مسئلہ جنسی مسائل میں ان کی بے حجابی کا تھا۔ یہاں دخل اندازی کر کے
قابل برداشت حد تک اسے ڈھکے چھپے انداز میں منتقل کرنے کے علاوہ میرے
سامنے کوئی چارہ نہیں تھا‘‘۔85

مترجم کے اعتراف واقرار نے خود بات واضح کر دی کہ ہندوستانی یا اہل اردو کا ڈسکورس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اصل متن میں موجود بیان کو بعینہ منتقل کر دیں چنانچہ انہوں نے اصل متن میں دخل اندازی کرتے ہوئے اس میں کو ڈھکے چھپے انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی جو کہ متن میں مداخلت ہی ہے۔

اردو عربی ترجمے کے حوالے سے یہ ذکر نا ضروری ہے کہ ان دو زبانوں میں ترجمہ کردہ زیرِ مطالعہ کتابوں میں ڈسکورس کی بنیاد پر مداخلت کی مثالیں کم دیکھنے کو ملیں۔ ڈسکورس کا فرق عام طور پر نظریاتی، سیاسی اور عقائد کی سطح پر تفریق کی حامل زبانوں یا تحریروں میں دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ سیاسی نظریات اس کا ایک اہم سبب ہوتے ہیں چناچہ سیاسی اور صحافتی تحریروں میں میں اس کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ادب میں اس کے کم امکانات ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں تو ایسی زبانوں میں جن میں سیاسی ونظریاتی اختلاف ہو۔ جہاں تک عربی سے اردو میں ترجمے کا معاملہ ہے تو اولاً زیادہ تر تراجم قدیم ادب کے ہیں جدید ادب کے تراجم کی طرف خاطر خواہ توجہ مرکوز ہی کی گئی ہے، جو ترجمے ہوئے بھی ہیں ان کی دستیابی مشکل رہی۔ نیز یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اردو زبان نظریاتی اور عقائد کی سطح پر عربی سے قریب ہے؛ اس لیے اس کی مثالیں کم مل سکیں۔

ثقافت

مداخلت کے اسباب میں ایک اہم سبب ثقافت ہے۔ ثقافت نہ صرف زبان کے اہم ترین عنصر کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اس کی شناخت کا ذریعہ بھی ہے۔ جب مترجم ترجمہ کے عمل سے گزرتے ہوئے ہدفی متن کی تشکیل کرتا ہے۔ یا یوں کہیں کہ جب اصل کو ہدفی زبان میں ازسرنو تحریر کرتا ہے تو اسے مداخلت کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ زبان ثقافت سے الگ کوئی مجرد چیز نہیں ہے بلکہ زبان اور ثقافت دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اس لیے جب ایک زبان کا متن دوسری زبان کا لبادہ پہنتا ہے تو دوسری زبان کی ثقافت سے اس کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ امر تقریباً مسلمہ ہے کہ کبھی بھی دو ثقافتیں کلی طور پر یکساں نہیں ہوسکتیں۔ اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ دونوں زبان میں جس قدر قربت ہوگی ثقافت میں اسی قدر ہم آہنگی ممکن ہوگی اور جس قدر بعد ہوگا ثقافتوں کا تضاد بھی بڑھتا جائے گا۔

ثقافت کا تصور تو بہت قدیم ہے لیکن وقفہ وقفہ سے اس کے عناصر یا مشمولات میں کمی زیادتی یا تبدیلی ہوتی رہی، نیز ثقافت تغیر پذیر تصور ہے۔ ثقافت اردو زبان کا لفظ ہے جس کا انگریزی متبادل Culture ہے۔ عربی میں اس کے لیے الثقافة کی اصطلاح رائج ہے۔ اس کا لغوی معنی ہے رسوم اور عقائد، فن، زندگی گزارنے کا طریقہ اور کسی خاص ملک یا گروپ کی سماجی تنظیم۔ کسی چیز کے متعلق ایسے عقائد اور رویے جو لوگ مخصوص گروپ یا تنظیم میں شیئر کرتے ہیں۔ اسی طرح عقلمند ہونا، نیک ہونا، تہذیب، ذہنی تربیت وغیرہ۔

برطانوی ماہر بشریات ٹیلر ثقافت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

> Culture ... is that complex whole which includes knowledge, belief, art, morals, law, custom, and any other capabilities and habits acquired by man as a member of society. 86
>
> (ثقافت بہت ہی پیچیدہ چیز ہے جس میں علم، عقیدہ، فن، اخلاق، قانون، رسم و رواج، اور سوسائٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے انسان جو بھی صلاحیتیں اور

عادات واطوار سیکھتا ہے سب شامل ہے)

دراصل ثقافت وہ امتیازی وصف جو کسی خاص گروپ، قوم یا نسل میں موروثی طور پر پایا جاتا ہے۔اس امتیاز میں بدلتے وقت کے ساتھ تغیر بھی رونما ہوتا ہے۔

زبان اور ثقافت کا رشتہ

زبان و ثقافت کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ ماہر لسانیات چامسکی نے زبان کو تہذیب سے مختص کیا ہے 25؎ تو Susan Petrilli نے ثقافت کو بھی زبان کا امتیازی وصف قرار دیا ہے۔ 26؎ زبان و ثقافت دونوں ہی کا وجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔

> "No language can exist unless it is steeped in the context of culture and no culture can exist which does not have at its center, the structure of natural language." 87؎
>
> (کوئی زبان اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ وہ ثقافت کے سیاق میں ڈوبی ہوئی نہ ہو اور کوئی ثقافت زندہ نہیں رہ سکتی جس کے مرکز میں فطری زبان کا ڈھانچہ نہ ہو)

زبان اور ثقافت ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں کہ دونوں کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور اگر جبراً کیا گیا تو دونوں میں سے کسی ایک کا امتیاز ختم ہو جائے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں نا قابل تقسیم ہیں۔

زبان و ثقافت مشترکہ طور پر ایک زندہ جسم کے مانند ہیں۔ جس میں زبان کی حیثیت گوشت کی ہے اور ثقافت خون کا درجہ رکھتی ہے۔ ثقافت کے بغیر زبان مردہ ہو جائے گی اور زبان کے بغیر ثقافت کا وجود ہی نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دو زبانوں کے یکساں معنی رکھنے والے لفظ بھی یکساں مفہوم نہیں رکھتے یا دونوں زبان بولنے والے اس سے یکساں مفہوم نہیں اخذ کرتے یا یکساں مفہوم میں نہیں استعمال کرتے ہیں؛ کیوں کہ ''ہر زبان کا ہر لفظ اپنی تہذیب کا نمائندہ ہوتا ہے۔'' 88؎

چناں چہ جب ایک انگریز Lunch بولتا ہے تو اس سے بڑا یا برگر مراد ہوتا ہے لیکن جب ایک ہندوستانی Lunch بولتا ہے تو اس سے روٹی یا چاول جیسی غذا مراد ہوتی ہے۔انگریزی لفظ Dog اور اس کا اردو متبادل 'کتا' دونوں علامیوں کا خارجی مظہر ایک ہی جانور ہے۔مغربی ممالک میں کتا پالتو جانور ہے، ان کے نزدیک وہ ایک جانور سے بڑھ کر ایک بہترین دوست ہے۔ان کے محاورے میں یہ لفظ انتہائی مثبت اور پیارے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً top dog، Lucy dog، وغیرہ۔جب کہ ہندوستانی ثقافت میں کتا رکھوالی کرنے اور بھونکنے والا جانور مانا جاتا ہے۔اس جانور کو نہ صحیح (گو کہ مغربی ثقافت کے زیر اثر اس کی بھی حیثیت بدل چکی ہے) لیکن اس لفظ کو انتہائی مکروہ بلکہ مترادف گالی کے تصور کیا جاتا ہے۔اسے غصے اور نفرت کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

زبانوں کے اندر الفاظ کی تشکیل و آمد بھی ثقافتی پس منظر میں ہوتی ہے۔جیسے عربی میں گھوڑے، اونٹ اور شراب کے لئے سیکڑوں سے زیادہ اسماء ہیں جس کو وہ بہ آسانی سمجھتے ہیں اور ان الفاظ کے معنوی فرق سے آگاہ ہیں۔اس کے برعکس اردو میں ان کے لیے بمشکل ہی چند الفاظ مل سکتے ہیں، کیوں کہ ہماری ثقافت میں ان کا وہ مقام یا حیثیت کبھی نہیں تھی جو عرب ثقافت میں تھی۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ زبان، ملک اور کسی بھی طبقہ کی ثقافت کی شناخت کا اہم جز ہے۔

ثقافت اور ترجمہ

جب لسانی اعتبار سے دو اجنبی افراد ملتے ہیں تو انہیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں اسی طرح جب دو ثقافتوں کی امین دو زبانوں کا آپسی تعامل ہوتا ہے تو ان کے درمیان بھی مسائل و مشکلات پیدا ہوتی ہیں؛ کیونکہ مترجم جب کسی متن کا ترجمہ کرتا ہے تو صرف ان الفاظ کو منتقل نہیں کرتا جو اصل متن میں موجود ہوتے ہیں بلکہ ان الفاظ کے ساتھ وہ اس زبان کی ثقافت کو بھی منتقل کرتا ہے۔

گویا کہ زبان سے زبان میں ترجمہ فی نفسہ ثقافت سے ثقافت میں ترجمہ ہے۔ثقافتیں یکساں نہیں ہوتیں کیوں کہ ثقافت کے عناصر تشکیلی مقامات، عہد، وقوفی سطح وغیرہ مختلف چیزوں کے بدلنے سے ان میں افتراق پایا جاتا ہے۔کہیں یہ افتراقی رنگ زیادہ گہرا اور کہیں ہلکا ہوتا ہے۔ثقافتی افتراق یا بعد ترجمہ کے میدان

کا ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہے۔جس کا سامنا مترجم کو ہر وقت کرنا پڑتا ہے۔

ثقافتی تفریق کے ہی باعث اکثر و بیشتر ترجمے دوسری زبان کے ادب میں وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جو اس زبان میں تخلیق کردہ فن پاروں کو ملتا ہے۔ ہماری اردو زبان میں سیکڑوں افسانے، ڈرامے اور ناولیں ترجمہ ہوئیں لیکن اردو قارئین کی بڑی تعداد بمشکل ان میں سے ایک دو کے ناموں سے واقف ہوگی۔موپاساں اور چیخوف جیسے بڑے اور عالمی ادب کا اٹوٹ حصہ مانے جانے والے افسانہ نگاروں کے افسانوں کے اردو میں بہت ترجمے ہوئے لیکن مقبولیت ہماری اپنی ثقافت کے پروردہ افسانہ نگاروں کو ملی۔انتظار حسین لکھتے ہیں:

''چیخوف کے افسانے تو بڑی تعداد میں ترجمہ ہوئے۔مگر عجیب ماجرا ہے کہ ایک طرف اس عہد نے چیخوف کے سامنے زانوئے ادب تہہ کر رکھا اور دوسری طرف سب سے زیادہ مقبولیت کا شرف کرشن چندر کے افسانے کو حاصل تھا۔'' 89

اس مقبولیت کے پس پردہ ترجمہ کی کیفیت، موضوعات وغیرہ مختلف عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں لیکن ان تمام کے ساتھ ثقافت بھی ایک بڑا عنصر ہے۔ثقافتی ناہم آہنگی قارئین کو ان بڑے افسانہ نگاروں کا گرویدہ نہ کر سکی بلکہ اردو نے ان سے استفادہ کر کے انہیں الگ رکھا اپنی راہ بنالی۔

یہی ثقافتی افتراق مترجم کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بنتا ہے۔اسے ہر وقت دوطرفہ جنگ سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے کیوں کہ کوئی بھی زبان خواہ وہ علاقائی یا زمانی اعتبار سے کتنی ہی قریب ہو اس میں کچھ نہ کچھ ثقافتی فرق ہونا لازمی ہے۔اس کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہر علاقے کی ثقافت مختلف ہوتی ہے۔ ماحول، مقامات، آب وہوا، قدرتی مناظر، مزاج، رہن سہن، طور طریقے، انداز فکر، کیفیات، جذبات و احساسات وغیرہ ہر سماجی گروہ میں مختلف ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہندوستان کی دو زبانوں ہندی اور اردو کو ہی دیکھ لیجئے دونوں میں قدریں اس حد تک مشترک ہیں کہ ایک عام آدمی بھی بغیر مترجم کے بلا تکلف بآسانی بات چیت کر سکتا ہے، اپنی بات پہونچا سکتا اور سامنے والے کی بات کما حقہ سمجھ سکتا ہے۔منور راؔنا کا شعر ہے:

سگی بہنوں کا رشتہ ہے جو ہندی اور اردو میں کہیں دنیا کی دو زندہ زبانوں میں نہیں ملتا

لیکن اس قربت کے باوجود آپ ہندی کا ایک پیراگراف خصوصا ادبی ٹکڑا لیجئے اور اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کیجئے دیکھئے کہ کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرپڑتا ہے،اس وقت اندازہ ہوگا کہ اتنی قریب کی دو زبانوں میں جب ثقافتی تفاوت کا یہ حال ہے تو دوایسی زبانوں میں جوآپس میں بہت بعد رکھتی ہیں ان کا کیا حال ہوگا۔اوران کے ترجمے میں کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

امراؤ جان ادا اردو کا شاہکار ناول ہے۔اردوادب میں خاص امتیاز کا حامل ہے۔اس میں اس وقت کے لکھنوی مزاج ومعاشرت کی پوری پوری عکاسی کی گئی۔اس پورے ماحول کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو اس وقت لکھنو کا عام شیوہ تھا۔مشاعرے کی محفلیں ہوتی ہیں، مجرے کروائے جاتے ہیں،نوابین، امراء،شرفاءان میں شریک ہوتے ہیں دادوتحسین سے نوازتے ہیں،طوائفوں پر اپنی جان چھڑکتے ہیں،طوائفوں کے ناز و نخرے ہیں، ان کی دلکش ادائیں، زبان وبیان کا جادو ہے، رسم وراہ کی داستانیں ہیں، تیتر وبٹیر بازی ہے، اجڑتے لکھنو کی پرکیف شامیں ہیں۔کیا جس ثقافت میں یہ چیزیں ناپید ہوں وہاں کے قارئین وناظرین کے لیے ان واقعات وکیفیات سے لطف اندوز ہونا، ان سے ثقافتی طور پر محظوظ ہونا نیز درس عبرت لینا ممکن ہے، ممکن تو کیا ان کے لیے ناقابل حل بھی ہے۔امراؤ جان کے نام سے ہندوستان اور پاکستان دونوں میں فلمیں بنیں لیکن دونوں فلموں کی کیفیت جداگانہ ہے۔اس کی وجہ بھی دراصل ثقافتی تفریق ہے؛ کیوں کہ اولاً ہندوستان کے انتہائی شمالی علاقوں (موجودہ پاکستان) کی ثقافت اور لکھنو واطراف کی ثقافت پہلے ہی کافی مختلف تھی دوم تقسیم نے اس رنگ کو اور گہرا کردیا۔

اردو میں ہندو مذہب کا ایک بڑا سرمایہ موجود ہے،صرف سرمایہ ہی نہیں اردو کے ہندو مذہب سے قریب ہونے کی وجہ سے اس کے اساطیر، رسم ورواج، ہندوتشبیہات وتلمیحات بھی اردو کا حصہ ہیں اور بڑی آسانی سے سمجھی جاتی ہیں؛لیکن انہیں علاقوں میں جہاں ہندو اثر ہے۔یہی تشبیہات وتلمیحات موجودہ پاکستان کے شمال میں افغانستان کی طرف بڑھتے چلے جائیں تو ان کی تفہیمی سطح کم ہوتی چلی جائے حالاں کہ وہاں کے لوگ اردو سے واقف ہیں۔خود وہ اردوداں جو ایک دونسلوں سے مغربی ممالک میں قیام پذیر ہیں

ان کے زبان و بیان اور خاص برصغیر میں رہنے والے اردوداں حضرات کے زبان و بیان کا موازنہ کر کے دیکھ لیں تو اس کا بخوبی اندازہ ہوجائے گا۔ اگر ان میں کچھ فرق ہے تو وہ صرف اور صرف ثقافت کا۔

بسا اوقات ادب کا کوئی ٹکڑا ایسا ہوتا ہے کہ اہل زبان تو اس سے خوب محظوظ ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے وہ چیز انتہائی بے معنی اور بے وقعت ہوتی ہے۔ ان کے لیے اس میں کوئی معنویت ہوتی ہے نہ کوئی لذت۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں کی ثقافت میں بہت زیادہ بعد یا اجنبیت ہے جیسے عربی کے ایک قصیدے کا شعر ہے

تری بعرالآرام فی عرصاتها و کیعانها کانه حب فلفل

(اس کے صحن اور آنگن میں اونٹ کی مینگنیاں ایسے نظر آتی ہیں گویا کہ کالی مرچ کے دانے ہوں)

ظاہر ہے کہ اس شعر میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی لیکن اس کے باوجود آج بھی عربی زبان و ادب کا طالب علم اس کو بڑھتا ہے اور اس سے محظوظ ہوتا۔ اگر قاری کے ذہن میں اس ثقافت کا پس منظر نہ ہو تو اس کے لیے اس کی تفہیم مشکل ہو جائے گی۔

ہر زبان کے کچھ خاص اساطیری و دیومالائی کردار ہوتے ہیں جو اہل زبان تو خوب سمجھتے ہیں لیکن غیر زبان کے افراد کے لیے ان کا سمجھنا اس وقت تک انتہائی مشکل ہوتا ہے جب تک کی اس کی تہہ تک نہ پہنچ جائیں اور اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ثقافت سے واقفیت لازم ہے۔ اگر اسے نہ سمجھا جائے تو ترجمہ بھی مشکل ہوگا اور فہم ترجمہ بھی:

''ہومر کی 'ایلیڈ' کا مترجم کے لیے ترجمہ کرنا اور قاری کا اس سے لطف اندوز ہونا ایک حد تک مشکل ہے محض اس لیے کہ 'ایلیڈ' میں خون کی طرح رواں قدیم یونانی دیومالا سے شُد بُد ضروری ہے۔''[90]

ہر زبان میں محاورے کی مخصوص اہمیت ہوتی ہے۔ محاورے میں الفاظ مخصوص معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان معنوں کی تفہیم خاص سیاق اور دائرہ میں ہی ممکن ہوتی ہے۔ محاورہ پیدا ہی تہذیب کے بطن سے ہوتا ہے:

ہر زبان میں محاورے بولنے والوں کی روایت اور تہذیبی قدروں کے مطابق ہوتے ہیں وہ جو مفہوم ادا کرتے ہیں، ان کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ایک خاص محاورے کے ذریعہ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بہت ممکن ہے کہ دوسری زبان میں اس خیال کوادا کرنے کے لیےکوئی محاورہ سرے ملتا ہی نہ ہو۔'' 91

محاوروں کے ترجمہ کے دوران مترجم کودوسری زبان میں محاورہ کی عدم موجودگی کے باعث ترجمہ میں ایک مشکل یہ بھی پیش آتی کہ ایک ثقافت کےمحاورے دوسرے ثقافت میں بے معنی اور برعکس بھی ہوجاتے ہیں۔

'' کچھ یہی معاملہ محاورے کے معنی اور پس منظر کا بھی ہے۔۔۔مثال کے طور پر ہمارے یہاں 'گربہ کشتن روز اول' اور 'ہماری ہی بلی اور ہمیں سے میاؤں میاؤں' کے مروج استعمال میں برتری کا احساس بنیادی محرک ہےاور کالی بلی کے راستہ کاٹنے کومنحوس خیال کیاجاتا ہے۔لیکن انگریزی میں (مغرب میں) 'بلی' باقاعدہ جنس کی علامت ہے۔اس علامت کی بھرپور تشریح ارنسٹ ہیمنگوے کے افسانے Cat in the Rain سے ہوتی ہے.......انگریزی میں افسانے کا عنوان Cat in the Rian ایک بلیغ استعارہ بنتا ہے جب کہ ہمارے ہاں عنوان: بارش میں بلی، معنی اور تاثیر کے اعتبار سے انتہائی غریب ٹھہرتا ہے۔'' 92

استعارات اور تشبیہات بھی ثقافت سے جنم لیتی ہیں۔ثقافتی تفریق سے یہ بھی مختلف ہوتی ہیں۔نصیر احمد خاں کا کہنا ہے:

''تشبیہات اور استعارات کا بہت بڑا تعلق اس زبان کے بولنے والوں کے رجحانات، احساسات اور سوچنے کے انداز سے ہے۔ظاہر ہے کہ ہر زبان میں یہ چیزیں یکساں نہیں ہوتیں۔'' 93

رجحان، احساس اور طرزفکر کی پرورش ثقافت کی ہی آغوش میں ہوتی ہے۔جب یہ چیزیں ہر زبان میں یکساں نہیں ہوتی ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کو سمجھنے اور ترجمہ کرنے میں دشواری پیش آئے گی۔اس کی ایک مثال مرزا حامد بیگ پیش کرتے ہیں وہ انگریزی کے ایک جملہ "He beats his breast" کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ہمارے یہاں سینہ کوبی کرنا 'احتجاج' کی علامت ہے جبکہ مرکزی افریقہ کی "Chokwe" زبان میں اس سے 'کسی کو مبارکباد دینا' مراد لیا جائے گا، بعینہ "Pat himself on the back" کے معنوں میں۔'' 94

اسی طرح ضرب الامثال کی تشکیل بھی ثقافت کے اندر ہوتی ہے۔ جیسے ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا، نہ نومن تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملیں جن کا تعلق صرف ہماری ثقافت سے ہوگا۔ اسی طرح تشبیہات کا معاملہ ہوتا ہے۔ ہم انہیں چیزوں سے تشبیہ دیتے ہیں جو ہمارے مخاطب سمجھتے یا یہ کہ ان کے سامنے ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کی تشبیہ ہے "as white as snow" ہمارے یہاں یہ تشبیہ نہ صرف بے معنی بلکہ غلط بھی ہے۔ اولاً ہمارے یہاں خوبصورتی کے لیے گورا (سفید) رنگ حتمی معیار نہیں ہے، دوم یہ کہ ہمارے یہاں جسمانی رنگ سفید نہیں بلکہ گندمی، انگوری وغیرہ ہوتا ہے، سوم برف نہ ہمارے سامنے ہوتی ہے نہ ہم اسے ان معنوں میں بطور تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔

اسی طرح ہر جگہ علاماتی اظہارات بھی یکساں نہیں ہوتے۔ مختلف علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے علاماتی اظہارات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ یہ علامتیں آپس میں مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ متضاد بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً جنوبی ہندوستان میں اثبات کا اشارہ کرنے کے لیے دائیں بائیں سر ہلاتے ہیں جب کہ شمالی ہندوستان میں دائیں بائیں سر ہلانا انکار کی علامت ہے۔ مختلف مقامات پر مختلف انداز سے لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں۔

یہی حال لباس وغیرہ کا بھی ہوتا ہے ہر جگہ الگ الگ انداز کے لباس پہنے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ایک خاص موقعے پر ہر جگہ ایک قسم کا لباس ہی رائج ہو بلکہ الگ الگ موقعوں کے لباس جدا گانہ ہوتے ہیں۔ رنگوں کے انتخاب پر بھی ثقافتی اثر نمایاں ہوتا ہے کسی علاقے کے لوگ شوخ رنگ پسند کرتے ہیں تو کہیں کے لوگ ہلکے رنگ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ثقافت میں شادی کے وقت دلہن سرخ جوڑے میں ملبوس ہوتی ہے جب کہ عیسائیوں کے یہاں شادی کے دن دلہن سفید گاؤن پہنتی ہے مزے کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی ثقافت میں سفید جوڑا (کفن) مرنے پر پہنایا جاتا ہے اور مرنے والے کے ساتھ اظہار ہمدردی وغم کے لیے دوسرے افراد بھی سفید جوڑا پہن لیتے

ہیں۔اس سلسلہ کی ایک بہت ہی دلچسپ مثال Susan Petrilli نے نقل کی ہے کہ انگلینڈ میں بہت امیر لوگ معمولی کپڑے پہنتے ہیں۔ان کا یہ نظریہ ہے کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے تو ہمیں دکھانے کی کیا ضرورت ہے۔95؎

رشتوں کا نظام بھی مختلف ثقافتوں میں جدا ہے۔مثلاً برصغیر میں خاندانی نظام کافی مضبوط ہے، یہاں پورا خاندان ایک ساتھ رہتا ہے۔دور دور تک رشتے ناتے جوڑے جاتے ہیں جب کہ اس کے برعکس مغربی ممالک میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ بہت کمزور ہے۔فیملی چھوٹی ہوتی ہے لوگ زیادہ دور تک رشتے نہیں جوڑتے۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں رشتوں کے متعلق بکثرت الفاظ ملتے ہیں انگریزی میں نہیں ملتے۔اسی طرح ہمارے یہاں کے بہت سے رشتوں کے لیے وہاں الفاظ ہی نہیں ہیں کیوں کہ ان کے یہاں ان رشتوں کا تصور ہی موجود نہیں ہے۔یہی حال رشتوں کے ساتھ سلوک کا بھی ہوتا ہے۔احترام اور عزت کا تعلق بہت کچھ ثقافت پر مبنی ہوتا ہے۔رشتوں کے ساتھ سلوک و رویہ کے معیارات جگہ جگہ بدلتے رہتے ہیں۔

ایک خاندان کی زبانوں میں یا قریب کی زبانوں میں اس قسم کے مسائل کم پیدا ہوتے ہیں۔مثلاً اردو فارسی اور عربی میں آپس میں ترجمہ کرنا ہو تو ثقافتی قدروں کی یکسانیت کی وجہ سے مماثلت کی تلاش آسان ہوتی ہے اسی طرح انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور لاطینی زبانوں کے درمیان ترجمہ کی صورت میں مترجم کو اس قدر دشواری نہیں ہوگی۔البتہ دو مختلف خاندانوں یا دو الگ الگ ثقافت کی حامل زبانوں میں قدروں کے افتراق کے باعث مترجم کو زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔پی۔ کے کلیانی نے اس ضمن میں McGuire کی رائے نقل کی ہے:

> McGuire is of the opinion that even in such a situation translation can be made only loosely.96؎
>
> (McGuire کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کی صورت حال میں آزادانہ (لچر) ترجمہ کیا جا سکتا ہے)

McGuire کی رائے بہت پختہ نہیں معلوم ہوتی اور نہ ہی یہ حتمی ہے۔تمام ترجموں پر اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔لسانی سطح پر جو ثقافتی مسائل سامنے آتے ہیں یعنی اساطیر، استعارے،تشبیہات وروزمرہ وغیرہ ان کے متبادلات یا قریبی متبادلات تو دوسری زبان میں مل سکتے ہیں۔جن کو مترجم اپنی صوابدید کے مطابق تبدیل کرلیتا ہے۔اگر متبادل مل گئے تو اس سے بدل دے گا مثلاً Might is Right کو''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کردے گا۔جن کے متبادلات نہیں ملتے مترجم ان کا وضاحتی ترجمہ کر کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔حالانکہ یہ وضاحتی ترجمہ بھی متن میں مداخلت ہی ہے جو وہ ہدفی زبان کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے انجام دیتا ہے۔

البتہ زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ مترجم ایسی ثقافتی اقدار جو مواد میں شامل ہیں مثلاً رہن سہن،طرز معاشرت وغیرہ کے افتراق کو کیسے حل کرے۔اس سلسلہ میں کوئی متعین اصول نہیں قائم کیا جاسکتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر مترجم اصل متن کی کلی رعایت کرے تو ہدفی زبان میں تشکیل پانے والا متن ہدفی قارئین کے لیے نا قابل فہم ، نا قابل استفادہ ہونے کے ساتھ ساتھ نا قابل مطالعہ (Unreadable) بھی ہوجائے گا۔محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> ''میرا خیال ہے کہ ایک مربوط معاشرے میں رہنے والا آدمی کسی دوسرے معاشرے کے ادب کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔اس کے اعصاب اجنبی تجربات کو قبول نہیں کرتے۔''[97]

اسی طرح اگر ہدفی زبان کی ثقافت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے کلی طور پر ہدفی زبان کے رنگ میں رنگ دیا جائے تو وہ ترجمہ کے بجائے نئی تخلیق ہوجائے گی۔مصنف اس تحریر سے غائب ہوجائے گا اور ایسے متن کو ترجمہ کے بجائے تلخیص یا تاخیذ وغیرہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مترجم کو درمیانی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔اس راہ پر چلتے ہوئے وہ ترجمہ کے منشا و مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔مواد کو تبدیل تو نہیں کیا جاسکتا ہے یعنی باپ بیٹے کے ایک ساتھ بیٹھ کر شراب پینے کے منظر کو کاٹ نہیں سکتا اور نہ ہی شراب کو شربت سے تبدیل کرسکتا ہے کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ آگے شراب کے نشہ کا بھی اثر ہوگا تو شربت میں نشہ کہاں سے پیدا کیا جائے گا۔لہذا تبدیلیوں کا

تسلسل بن جائے گا۔ اس ضمن میں وہ حواشی کا بھی سہارا لیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہر جگہ حواشی نہیں لگائے جا سکتے خصوصاً ادبی تحریریں اس کی متحمل نہیں ہوتیں۔ اس لیے ایسے مقامات جہاں حواشی بہت ضروری ہوں وہاں تو حواشی دے اور جہاں ممکن ہو وہاں اس طرح کا اسلوب بیان اختیار کرے کہ قاری کے غور و فکر سے وہ چیز واضح ہو جائے۔ اس کے علاوہ مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں اور یہ تمام طریقے متن میں کسی نہ کسی طرح کی مداخلت کے بعد سامنے آتے ہیں۔

مذکورہ گفتگو سے یہ گمان نہیں ہونا چاہئے کہ ثقافت کا تعلق صرف ادب سے ہی ہے اور ادبی ترجمہ میں ہی ثقافت کی بنیاد پر مداخلت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ یہ واضح ہونا چاہئے کہ ثقافت کی وسعت علوم، افکار، عقائد سب پر محیط ہے۔ اور یہی صورت حال علمی، فلسفیانہ اور مذہبی تراجم میں بھی پیش آئے گی گو کہ کم۔

مثال کے طور پر قانونی ترجمہ کو ہی لیں، کسی بھی قوم یا ملک میں جو قوانین وضع کئے جاتے ہیں وہ وہاں کے حالات و کیفیات کے مدنظر ہی وضع کئے جاتے ہیں، ان حالات کی تشکیل ثقافت کے زیر اثر ہی ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے قانون کا ترجمہ بالکل اسی رنگ میں کر دیا جائے تو دوسری زبان کے لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہوگا۔ چناں چہ یا تو انہیں اس ثقافت سے روشناس ہونا پڑے گا یا ترجمہ میں وہ انداز اختیار کیا جائے گا جس سے ہدفی قارئین کا وقوفی ماحول ہم آہنگ ہو۔

یہی حال سائنسی تراجم کا بھی ہے۔ جب ہم کسی غیر محتاط انداز میں کئے ہوئے ترجمہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری طبیعت میں اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ انداز ہمارے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ سائنسی و علمی تراجم کا بڑا مسئلہ اصطلاحات یا اصطلاحی الفاظ ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں دوسری زبان کے الفاظ مستعار لینے پڑتے ہیں؛ کیوں کہ ہماری ثقافت اس درجہ تک نہیں پہونچی ہوتی ہے جو اس مدنیت تک پہونچا سکے۔

یہی فرق ترجمہ میں کھل کر سامنے آتا ہے اور جب مترجم ترجمہ کرتا ہے تو اسے اس خلیج کو پاٹنا پڑتا ہے۔ وہ اس بات کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ جس طرح اصل زبان کے قارئین اس تحریر سے لطف اندوز ہوتے ہیں، ادبی چاشنی و لذت محسوس کرتے ہیں وہی لذت وہی چاشنی ہدفی زبان کے قارئین بھی محسوس کریں، اصل زبان کے اس فن پارے کی قدر و قیمت اصل زبان کے قارئین کی طرح ہدفی زبان کے قارئین کی نظر میں بھی قائم

رہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے اسے متن میں مختلف عمل انجام دینے پڑتے ہیں۔وہ ہدفی زبان میں اصل کی مشابہتیں تلاش کرتا ہے۔ثقافتی ہم آہنگی قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے،اس خلیج کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لیے ثقافتی یکسانیت کا ایک پل تعمیر کرتا ہے۔اس بات کی از حد کوشش کرتا ہے کہ ہدفی قارئین کو اصل کے قریب سے قریب لے جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا اپنا مذاق بھی برقرار رکھے۔گویا ایک کشتی تیار کرتا ہے جس میں ہدفی زبان کے قارئین کو سوار کر کے اصل زبان کے دریا کی سیر کراتا ہے۔درحقیقت یہ پوری کوشش ہی ترجمہ میں ثقافتی پس منظر میں ہونے والی مداخلت سے تعبیر کی جاسکتی ہے۔

مداخلت کی مثالیں

ہر زبان ایک خاص خطے کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔زبان سے وابستہ یا اس بولنے والے افراد کے عروج اور ان کے پھیلاؤ سے زبان کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے لیکن اس کی بنیاد اور جڑ کسی ایک خطے کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے۔مثلاً اردو اور ہندی زبانوں کا مبدا و مولد ہندوستان ہے۔انگریزی بنیادی طور پر انگلستان کی زبان ہے۔زبان کا علاقہ مخصوص ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لوازمات بھی مخصوص ہوتے ہیں۔مثلاً علاقے، ان کے نام،شہر،صوبے، درخت، پھل، پھول،مرگزار، ندیاں، دیو مالائی کردار،عشقیہ کردار، اشارات، علامات سب زبان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہر زبان ان عناصر سے مملو ہوتی ہے اور زبان بولنے والے ان چیزوں، ناموں اور کرداروں سے مانوس ہوتے ہیں جب کہ دوسری زبان بولنے والے اس پہلو سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔مثال کے طور پر ہر اردو داں غالب سے واقف ہوتا ہے لیکن اس کے لیے شکسپیئر اور کیٹس اجنبی ہوتے ہیں۔لیلیٰ مجنوں کا علم اسے ہوتا ہے لیکن جولیٹ سیزر کے بارے میں بھی اسے معلوم ہو ایسا ضروری نہیں ہے۔گنگا ، جمنا ندیوں کے نام اس کی سماعت سے مانوس ہوں گے لیکن آسٹریلیا کی ندیوں کے نام کس کس کو معلوم ہوں گے۔

ان تمام چیزوں کا تعلق ثقافت سے ہے۔ہر زبان کی تحریر اس قسم کے ثقافتی عناصر سے بھری ہوتی ہے۔ نام و مقامات خاص طور پر اجنبی ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے مترجمین جب ایک زبان کے متن کو دوسری زبان میں منتقل کرتے ہیں تو وہ اس اجنبیت کو دور کرنے اور ترجمے کو ہدفی قارئین کی وقوفی سطح سے

مانوس کرنے کے لیے اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں اور متن میں موجود ان عناصر کو علاقائی عناصر سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ اردو زبان کے مشہور ناول نگاری عبدالعلیم شرر نے کئی ترجمے اس طرح کیے ہیں۔ عربی سے اردو ترجمے میں بھی اس کی مثال دیکھنے کو ملتی ہے۔

عرب کے نامور انشا پرداز اور صاحب اسلوب نثر نگار مصطفیٰ لطفی منفلوطی کے مشہور ناول 'ماجدولین' کا ترجمہ مشہور عربی اردو مترجم حبیب اشعر دہلوی نے 'شہناز' کے نام سے کیا ہے۔ ماجدولین طبع زاد ناول نہیں بلکہ فرانسیسی سے ترجمہ ہے اور اس کے کردار مسیحی تھے۔ منفلوطی نے اس کو عربی کا قالب پہنایا۔ حبیب اشعر نے جب اس کو اردو میں منتقل کیا تو اس کے ناموں کو ہندوستانی ناموں سے تبدیل کر دیا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ماجدولین کے کردار مسیحی تھے اور فضا جرمنی سے متعلق، میں نے ناموں کی اجنبیت کے سبب۔۔۔ کردار اسلامی کر دیے اور فضا تخیلی۔''98

مترجم نے اصل متن میں مداخلت سے کام لیتے ہوئے ناموں کو تبدیل کر دیا۔ اسی کے ساتھ اس کا منظر جو جرمنی سے متعلق تھا اسے تبدیل کر کے تخیلی کر دیا۔ ہدفی قارئین کے وقوفی ادارک سے ہم آہنگ کرنے کے لیے متن میں کی جانے والی اس تبدیلی میں نام کے ساتھ ساتھ بہت کچھ تبدیل کرنا پڑا ہوگا۔ منظر نامے کو بدلنے سے مواد میں ضرور تبدیلی لانی پڑے گی۔

مصطفیٰ لطفی منفلوطی کی طبع زاد اور ترجمہ شدہ کہانیوں کے مجموعہ العبرات میں ایک طویل کہانی الضحیة کا ترجمہ حبیب اشعر دہلوی نے 'رخسانہ' کے نام سے کیا ہے۔ یہ ایک فرانسیسی الاصل کہانی ہے اس لیے اس کے کرداروں کے نام اور فضا بھی اسی ملک اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے مماثلت رکھتے ہیں۔ مترجم نے اس ترجمے میں بھی سابقہ ترجمے کی روش اختیار کرتے ہوئے ناموں وغیرہ میں تبدیلی کر دی۔ اس تعلق سے حبیب اشعر لکھتے ہیں:

> ''اجنبیت کے خیال سے 'شہناز' کی طرح 'رخسانہ' کی فضا اور کرداروں کے نام بھی بدل دیے گئے ہیں اور اب یہ کہانی ہمارے ہی ملک کی کہانی معلوم ہوتی ہے''۔99

اجنبیت کی اس دیوار کو گرانے اور فضا و ماحول پر ہندوستانی رنگ چڑھانے کے لیے جب مترجم نے کرداروں اور مقامات کے ناموں کے تبدیلی کی ہوگی تو ساتھ ہی ساتھ اصل متن کے مواد میں بھی لازمی طور پر حذف واضافہ سے کام لینا پڑا ہوگا۔اس طرح دہری مداخلت اختیار کرنی پڑے گی۔اولاً تو ناموں اور مقامات کی تبدیلی خود اصل متن میں مداخلت ہے ساتھ ہی یہ مداخلت متعدی بھی ہے کہ اس کی وجہ سے متن کے دوسرے حصے بھی متاثر ہوں گے۔کرداروں کے ساتھ جڑی ہوئی خصوصیات میں بھی فرق آئے گا۔افسانے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''رخسانہ، بمبئی کے آسمان پر نجم درخشاں بن کر طلوع ہوئی، جو اپنی نور افشانیوں سے نگاہوں کو خیرہ اور فضا کو روشنی وشادمانی سے لبریز کرتی۔عقلیں اس کے گرد اس طرح چکر لگاتیں، جیسے پھولوں کے گرد شہد کی مکھیاں، اور دولت اس کے سامنے اس طرح بہتی، جیسے ڈوبتے سورج کی شعاعوں تلے تیز رو دریا۔پر وقار چہرے اس کی بارگاہ میں خم تھے اور بلند پیشانیاں اس کے قدموں میں سر بسجود''۔100؎

مترجم نے نام تو تبدیل کر دیے ہیں لیکن عبارت کا اسلوب یہ بتا رہا ہے کہ تحریر اردو میں کسی اور زبان سے منتقل کی گئی ہے۔یہ زبان اردو کی ٹکسالی زبان، روزمرہ اور محاورہ سے میل نہیں کھاتی۔یہی وجہ ہے کہ عبارت دہرے معیار کی غماز ہے۔نام تو اس کے مانوس ہیں لیکن زبان مانوس نہیں ہے۔

بہت سے مترجم اس دیوار کو گرانے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور ترجمہ شدہ متن کا رنگ ہدفی زبان سے ہم آمیز کرنے کے لیے ایسا اسلوب یا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اجنبیت کی دیوار میں دراڑ پڑے۔ہدفی قاری اخذ مفہوم میں غرابت معنوی ومفہوم میں نہ الجھے۔اسے وہی فضا اور ماحول ملے جو اس کی اپنی زبان میں تخلیق کردہ متن میں میسر آتا ہے۔اس نوعیت کی ایک کوشش ڈاکٹر فیضان بیگ نے بھی کی ہے۔انہوں نے نجیب محفوظ کے ناول 'القاہرہ الجدیدہ' کا ترجمہ آئین نو کے عنوان سے کیا ہے۔ترجمے کے دوران انہوں نے ترجمے میں ہندوستانی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اس کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مشکل یہ تھی کہ نجیب کے ناولوں میں آفاقیت کے باوجود مقامی مصری بلکہ قاہرہ کے ماحول کی جوانمٹ اور گہری چھاپ ہے اس کی وجہ سے برصغیر کے سماجی ماحول سے اس کا تبادلہ ممکن نہیں تھا، لیکن پھر بھی کہیں کہیں کہاوتوں اور گیت کے ٹکڑوں میں میں نے ہندوستانیت کو پرونے کی کوشش کی ہے''۔101؎

تمام فن پاروں خصوصاً ادبی متن میں ثقافتی رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اس پر دوسرا رنگ چڑھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ نیز دوسرا رنگ رنگنے کے لیے پہلے رنگ کو ہٹانا ومٹانا بھی پڑ جاتا ہے جو اصل متن میں موجود ثقافت میں مداخلت کا عمل ہے۔

رشتوں کے ساتھ بطور احترام لگائے جانے والے القاب وآداب بھی ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں۔ بعض علاقوں میں رشتوں کی قدر زیادہ ہوتی ہے بعض میں کم، کسی ثقافت میں کوئی رشتہ زیادہ محترم ہوتا ہے اور کسی ثقافت میں کسی رشتے کو زیادہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی جگہ پر کسی خاص رشتے کو اس کے نام کے ساتھ مخاطب یا ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ اصل اور ہدفی زبان کی ثقافت کے اختلاف کی وجہ سے ترجمے میں مداخلت ہوتی ہے۔ اس کی ایک مثال پیش ہے:

جليلة: من أصحاب محمد۔۔ماالذي جاء به الى خالك؟

عامر: لا أدرى۔ (ينظر الى جهة الباب) ها هو ذا خالى عقبة فاسأليه۔

(يدخل عقبة بن الحارث)

جليلة: من هذا الذى جئت به يا عقبة؟

عقبة: هذا قاتل أبينا يا جليلة۔ قاتل الحارث ببدر۔102؎

مذکورہ بالا جملوں کے ترجمے پر غور کریں:

عامر: معلوم نہیں (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) ٹھہریے ماموں جان آرہے ہیں انہی سے پوچھئے۔

(عقبہ بن حارث آتا ہے)

جلیلہ: عقبہ بھائی یہ کون ہے جسے آپ ساتھ لائے ہیں؟

عقبہ: جلیلہ بہن! یہ ہمارے باپ کا قاتل ہے۔۔۔۔۔ہمارے والد محترم کو میدان بدر میں اسی نے قتل کیا تھا۔103

مذکورہ جملوں میں تین کرداروں کی زبانی مکالمات ادا کیے گئے ہیں: عقبہ اور جلیلہ دونوں بہن بھائی ہیں، عامر جلیلہ کا بیٹا اور عقبہ کا بھانجا ہے۔ آپس میں انہوں نے اپنے درمیان رشتوں کا بیان جس احترام کے ساتھ کیا ہے وہ اصل متن کی عبارت سے میل نہیں کھاتا ہے۔ عامر جب عقبہ کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو کہتا ہے 'ماموں جان'، جب کہ متن میں احتراماً لگائے گئے لاحقہ 'جان' کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح جلیلہ عقبہ سے سوال کرتی ہے تو کہتی ہے 'عقبہ بھائی' حالاں کہ اصل متن میں صرف نام مذکور ہے 'بھائی' کے لیے کوئی لفظ نہیں ہے۔ اسی طرح عقبہ بھی جلیلہ کو بہن سے مخاطب کرتا ہے یہاں بھی اصل متن سے تجاوز کیا گیا ہے۔ عقبہ خبیب بن عدی کے بارے میں کہتا ہے ''ہمارے والد محترم کو میدان بدر میں اسی نے قتل کیا تھا''۔ اصل متن میں جو الفاظ لائے گئے ان کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ 'بدر میں حارث کا قاتل'؛ لیکن مترجم نے عقبہ کی زبان سے والد محترم کہلوایا اور نام کو حذف کر دیا۔

مترجم کے ذریعے استعمال کیے گئے یہ الفاظ: ماموں جان، عقبہ بھائی، جلیلہ بہن اور والد محترم یعنی رشتوں کو ظاہر کرنا، رشتوں کے ساتھ احترام کے الفاظ لگانا اور باپ کا ذکر نام سے کرنے کے بجائے والد محترم کہنا سب ہماری اردو تہذیب کا حصہ ہے۔ عربی عبارت میں یا تو براہ راست نام ذکر کیا گیا ہے یا صرف رشتہ مذکور ہے۔ مترجم نے اصل زبان کی ثقافت کو بروئے کار لانے کے بجائے ہدفی ثقافت کو ملحوظ رکھا ہے۔ دونوں ثقافتوں میں تفریق اور اجنبیت کی وجہ سے مترجم کی جانب سے یہ مداخلت پیش آئی ہے۔

جس طرح ہر زبان کے پھل، پھول، درخت، مرگزار، ندیاں، رسوم و رواج، ادب آداب، طرز معاشرت اور ثقافت سے تعلق رکھنے والے دیگر عناصر مختلف ہوتے ہیں اسی طرح الگ الگ خطوں میں اور الگ الگ زمانوں میں رائج سکے اور کرنسیاں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ کرنسی کی قیمت عالمی بازار میں کم و زیادہ ہوتی رہتی ہے، کرنسی خود بھی بدلتی رہتی ہے، اس کی قدر اور نام بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ہر زبان میں مال و دولت سے متعلق بے شمار کہاوتیں، تشبیہیں اور محاورے مشہور ہوتے ہیں۔ غربت اور مالداری کو ظاہر کرنے

کے لیے کہاوتیں ہوتی ہیں۔ان محاوروں، کہاوتوں میں ایک زبان سے دوسری زبان میں کرنسی کی نوعیت، نام، قدر وغیرہ کئی اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔اس طرح کے محاورے اور کہاوتیں روزمرہ کا حصہ بن کر ثقافت کا جز بن جاتی ہیں۔لہذا جب کسی تحریر میں اس قسم کے الفاظ آتے ہیں تو ان کو اپنی زبان کے مزاج میں تبدیل کر کے ہی ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔مثال کے طور پر یہ عبارت اور ترجمہ دیکھیں:

أبوذر: (في استغراب) أنت فتى مسكين؟!

ثعلبة: اى و الله يا أباذر لا أملك شروى نقير۔104؎

اب ترجمہ پر غور کرتے ہیں:

ابوذرؓ: (حیران ہوکر) اے نوجوان کیا تو غریب ہے؟

ثعلبہ: بخدا اے ابوذرؓ، میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔105؎

ثعلبہ اپنے آپ کو غریب و نادار بتا رہا ہے۔وہ اپنی غربت اور محتاجگی کو ظاہر کرنے کے لیے ایک کہاوت کا سہارا لیتا ہے اور کہتا ہے لا أملك **شروى نقير**۔اس لفظ کے معنی معلوم کرنے کے لیے لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں:

شَرْوَىٰ الشئ: مثل، مانند۔کہتے ہیں: هُوَ لَا يَمْلِكُ شَرْوَىٰ نَقِيْر :اس کے پاس معمولی چیز بھی نہیں ہے۔مفلس ہے۔نقیر معمولی اور حقیر چیز کو کہتے ہیں۔ کھجور کی گٹھلی کے گڑھے کو بھی کہتے ہیں۔106؎

مصباح اللغات میں تقریباً یہی معنی درج ہیں لیکن اس میں اور وضاحت ہے:

الشَرْوىٰ ۔مثل یہی لفظ واحد تثنیہ جمع مذکو مونث سب کے لیے مستعمل ہے۔کہا جاتا ہے۔"هو و هي و هما و هم و هن شَرْواك" یعنی تمہارے مثل ہیں اور کا جاتا ہے۔ "انه لا يملك شَرْوَىٰ نقير" وہ نقیر کے برابر کسی چیز کا مالک نہیں۔فقیری کے لیے بطور مثال کے بولا کرتے ہیں۔اور نقیر اس گڑھے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے۔107؎

مذکورہ لغات کے حوالے سے اس لفظ کے اصل معنی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ

عربی زبان میں فقیری اور غربت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ مصنف نے اس کہاوت کا ترجمہ پھوٹی کوڑی سے کیا ہے۔ ہماری اردو زبان میں مستعمل یہ محاورہ بالکل اسی مفہوم کی ترجمانی کرر ہا ہے جو عربی عبارت میں مراد ہے لیکن اسی کے ساتھ دونوں میں ثقافتی فرق ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ کوڑی ہندوستان کا قدیم سکہ ہے جب کہ نـــقیـــر میں ایسی بات نہیں ہے۔ دونوں الفاظ کا مفہوم ایک ہونے کے باوجود دونوں زبانوں میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنے علاقے اور ثقافت کی نمائندگی کرر ہے ہیں۔ اس طرح یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ثقافت کی تبدیلی کے باعث دونوں زبانوں میں الگ الگ انداز کے الفاظ استعمال کیے گئے جو مفہوم کے اعتبار سے تو یکساں ہیں لیکن معنی کے اعتبار سے کافی فرق پایا جاتا ہے۔

الفاظ کے انتخاب میں علاقے کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایک ہی زبان میں ایک ہی مفہوم کے لیے الگ الگ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ ایک خاص علاقے میں ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ ثقافت کا حصہ ہوتے ہیں:

وکان معه عجلة يجرّها ثوران۔108؎

خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

اس کے پاس ایک بیل گاڑی تھی جس کو دو بیل لے کر چل رہے تھے۔109؎

اسی کا ترجمہ رفیع الدین حنیف نے یوں کیا ہے:

اس کے ساتھ ایک بنڈی تھی جسے دو بیل کھینچ رہے تھے۔110؎

اصل عبارت میں موجود لفظ عجلة کا متبادل دوسرے ترجمے میں 'بنڈی' کیا گیا ہے۔ مترجم کا تعلق جنوبی ہندوستان کے معروف شہر حیدر آباد سے ہے اور یہ لفظ یہاں بولا جاتا ہے لیکن ترکیب کے ساتھ بولا جاتا ہے جیسے بیل بنڈی، سبزی کی بنڈی وغیرہ۔ شمالی ہندوستان میں بنڈی اس کپڑے کو کہتے ہیں جو قمیص کے نیچے پہنا جاتا ہے۔ خورشید انور ندوی کا تعلق شمالی ہندوستان سے ہے اس لیے انہوں نے بہ آسانی بیل گاڑی ترجمہ کر دیا جہاں عام طور پر یہی لفظ بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ 'بنڈی' کا لفظ مقامی ثقافت کی ترجمانی کرر ہا ہے۔

ثقافت ایک تغیر پذیر شے ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ اس میں تغیر کا عمل جاری رہتا ہے۔ مسلمات و

نظریات، عادات واطوار، طرز معاشرت اور معیار زندگی سب میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ان تبدیلیوں کا سب سے واضح اثر زبان پر محسوس کیا جاتا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ کچھ الفاظ متروک ہوتے رہتے ہیں اور نئے الفاظ ان کی جگہ داخل ہوتے رہتے ہیں۔کسی تحریر میں استعمال ہونے والے الفاظ اس کے عہد اور ثقافت کی نشاندہی کرتے ہیں۔عبداللہ ابن المقفع کی ترجمہ کردہ شہرہ آفاق کتاب کلیلہ دمنہ میں ایک لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کو دو مترجمین نے الگ الگ انداز سے ترجمہ کیا ہے۔

فاكتساب المال من أحسن وجه يكون. ثم حسن القيام على ماالكتسب منه ثم استثماره.

و ان هو وضعه وهم يستثمره لم تمنعه قلة الانفاق من سرعة الذهاب.111؎

اس کے دو ترجمے دستیاب ہیں جنہیں یکے بعد دیگرے بالترتیب درج کیا جاتا ہے۔ پہلا ترجمہ رفیع الدین حنیف کا ہے:

بہترین طریقے سے مال حاصل کرنا، پھر اپنے مال کی بہترین حفاظت کرنا، پھر اس میں بڑھوتری۔

اگر وہ مال کو یوں ہی رکھے، بڑھائے نہیں، تو کم خرچ بھی مال کو جلد ختم ہونے سے نہیں روکے گا۔112؎

دوسرا ترجمہ خورشید انور ندوی کا ہے:

(۱) مال کو سب سے اچھے ذریعے سے کمایا جائے (۲) جو کچھ اس نے کمایا ہے اس کی حفاظت اور نگہداشت کرے (۳) اس کی سرمایہ کاری کر کے اس میں بڑھوتری کے لیے کوشش کرے۔

اور اگر وہ مال کو یونہی حفاظت کے ساتھ رکھے رہے اور سرمایہ کاری کر کے اس میں بڑھوتری کی کوشش نہ کرے تو چاہے وہ اس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرے پھر بھی وہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔113؎

مذکورہ بالا عربی اقتباس میں یہاں قابل غور لفظ ''استثمار'' اور اس سے مشتق لفظ ''یستثمر'' ہے۔لغت میں اس لفظ کا معنیٰ ہے:

استثمر المال: مال کو بڑھانا اور اس سے فائدہ اٹھانا۔114

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو دوسرا ترجمہ بالکل درست ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ اس بات پر بھی توجہ رہنی چاہیے کہ اس وقت لفظ استثمار ایک اصطلاح کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جس کے معنیٰ ہیں:

الاستثمار: سرمایہ کاری، کسی پیداواری کام میں براہ راست مشینری وغیرہ خرید کر سرمایہ لگانا یا بالواسطہ طور پر حصص خرید کر سرمایہ لگانا۔115

اسی طرح سرمایہ کاری کا لفظ بھی اردو میں اصطلاحاً ہی بولا جاتا ہے جس سے موجودہ دور میں ایک خاص قسم کی تجارتی سرگرمی مراد ہوتی ہے۔اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے خورشید ندوی نے سرمایہ کاری کا لفظ استعمال کیا ہے۔غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کلیلہ دمنہ کتاب جب لکھی گئی یا جب عبداللہ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ کیا تو اس طرح کی سرمایہ کاری کا تصور ہی نہیں تھا۔چنانچہ مترجم کا ترجمہ اپنے عہد اور زمانے کی نیابت کر رہا ہے جو دراصل ثقافت کی تبدیلی اور نئے لفظ کی آمد سے واقع ہوا ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ثقافت میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ایک ثقافت سے دوسری ثقافت سے متاثر ہونے یا اخذ واستفادے کے ذرائع بدلتے رہتے ہیں۔مثال کے طور پر ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل عربی اور بالخصوص فارسی یا ایرانی ثقافت کے اثرات تھے۔انگریزوں کی آمد کے ساتھ انگریزی کلچر کی جھلکیاں نظر آنے لگیں جو دھیرے دھیرے تیز تر ہو رہی ہیں۔اردو زبان جس کا خمیر عربی اور فارسی کی آمیزش سے تیار ہوا وہ علوم وفنون کے ساتھ الفاظ کی سطح پر انگریزی سے قریب ہو رہی ہے۔پہلے الفاظ عربی وفارسی سے داخل ہوتے یا ان زبانوں کی مدد سے تعریب وتفریس ہوتی تھی؛ اب انگریزی کے الفاظ زبان کا حصہ بن رہے ہیں۔یہ الفاظ عہد جدید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اس کی ایک مثال دیکھئے:

و ان أنفقه في غير وجهه، ووضعه في غير موضعه، و أخطأ به مواضع استحقاقه صار بمنزلة الفقير۔116

اور اگر وہ مال کو غلط جگہ خرچ کرے گا اور صحیح جگہ خرچ نہ کرے گا تو اس کی پوزیشن

آخر کار فقیر کی سی ہو جائے گی۔117ء

زیر نظر ترجمہ میں مترجم نے 'پوزیشن' کا لفظ اختیار کیا ہے۔قدیم تحریروں میں اس کا استعمال شاید ہی ملے۔ علمی اور تنقید ادب کی تحریروں میں شاید یہ لفظ مل جائے لیکن کسی داستان میں ملنے کا امکان نہ کے برابر ہے۔مترجم کا انتخاب ثقافت کی تبدیلی کا اشارہ دے رہا ہے۔اس فرق کو دیکھنے کے لیے ایک اور ترجمہ ملاحظہ کریں:

اور اگر وہ اسے غیر مصرف اور غلط جگہوں میں خرچ کرتا ہے، اس کے خرچ کرنے

کی جگہوں سے چوک جاتا ہے تو وہ اس فقیر کی مانند ہو جاتا ہے۔۔۔۔118ء

اس ترجمے میں ''مانند' کا لفظ استعمال کیا ہے۔اگر ترجمے میں مفہوم کی منتقلی کے نقطہ نظر سے غور کریں تو 'پوزیشن' کا لفظ سہی ترجمانی کر رہا ہے؛ لیکن اسی کے ساتھ یہ لفظ ثقافت کی تبدیلی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔

حوالہ جات

1. Oxford Advanced lerner's Dictionary, pg, 285
2. English Urdu Dictionary, Beurue for promotion of Urdu
3. The Standerd English Urdu Dictionary, by Abdul Haque, pg, 202
4. قومی انگریزی اردو لغت۔ڈاکٹر جمیل جالبی،ص 391
5. المورد الحدیث،قاموس انکلیزی۔عربی،منیر البعلبکی،ص239، 2008
6. Language and Bilingual Cognition, edited by Vivian Cook and Benedetta Bassetti, pg 3
7. Canadian Social Science, Vol.5 No.1 February 2009, A Cognitive-Pragmatic Model for Translation Studies Based on Relevance and Adaptation, Chang Zixia
8. ابوالحسن علی ندوی،مختارات،ص30،مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991
9. ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات،ص110،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان
10. عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب،ص93،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان
11. ابوالحسن علی ندوی،مختارات،ص30،مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991
12. عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب،ص94،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان
13. حسن الدین احمد،انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ص33
14. الامام ولی اللہ الدھلوی وترجمۃ القرآن،مصباح اللہ عبدالباقی،مجلّہ البحوث والدراسات الاسلامیہ،عدد6،سال3،ص180
15. Zoher Shavit,Politics of Children Literature, The University of Geargia press, Athens and London, 1986
16. مرزا حامد بیگ،اردو زبان میں ادبی تراجم کا جائزہ،مشمولہ اردو زبان میں ترجمے کے مسائل،مرتب اعجاز راہی،ص84
17. ایضاً،ص84
18. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص6،مکتبہ مصر
19. قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص46،الفیصل لاہور، 2010
20. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص7،مکتبہ مصر
21. قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص47-46،الفیصل لاہور، 2010
22. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص5،مکتبہ مصر
23. قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص45،الفیصل لاہور، 2010

24. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص96-95، دار المسیرہ بیروت، 1980
25. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص66-65، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016
26. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص74، قبا گرافکس حیدر آباد، 2014
27. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص100-99، دار المسیرہ بیروت، 1980
28. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص69، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016
29. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص77، قبا گرافکس حیدر آباد، 2014
30. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی، ص54، شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر۔
31. Yu YUAN, Universals of Translation: A Corpus-based Investigation of Chinese Translated Fiction.
32. Vinay and Darbelnet 1958-1972, 117
33. عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب فی شرح مختار الادب، ص91، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی پاکستان)
34. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات، ص21، دار الکتب السّلفیہ، لاہور پاکستان، 2010)
35. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات من ادب العرب، جلد اول، ص29 مجلس نشریات اسلام کراچی)
36. ابو اسامہ عبدالرحمٰن، مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب، ص109، مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان
37. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات، ص21، دار الکتب السّلفیہ، لاہور پاکستان، 2010)
38. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب، ص92، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)
39. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص6، مکتبہ مصر
40. قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص46، الفیصل لاہور، 2010
41. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات من ادب العرب (جلد اول) ص30، مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان 1991)
42. (ابو اسامہ عبدالرحمٰن، مبشرات، ص111، مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)
43. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات، ص22، دار الکتب السّلفیہ، لاہور پاکستان 2010)
44. (خالد محمود، انوارات، ص20، دار القلم لاہور پاکستان)
45. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب، ص93، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)
46. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات، ص30، مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991)
47. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب، ص94، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)
48. (خالد محمود، انوارات، ص20، دار القلم لاہور پاکستان)

49. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص22،دار الکتب السلفیہ لاہور پاکستان 2010)

50. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات،ص111،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

51. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص41،مکتبہ مصر

52. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں،ص10،الفیصل لاہور،2010

53. ہبہ الدباغ،خمس دقائق وحسب،ص7

54. میمونہ حمزہ،صرف پانچ منٹ،ص29،منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز،نئی دہلی،2014

55. (الحذف فی اللغة العربیة، ا. م. د. یونس حمش خلف محمد، مجله ابحاث کلیة التربیة الاساسیة ، جلد 10، عدد 2 ، ص 283)

56. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(جلد اول)ص29،مجلس نشریات اسلام،کراچی پاکستان،1991)

57. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

58. (عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب،ص92،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

59. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص21،دار الکتب السلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

60. (خالد محمود،انوارات،ص19،دار القلم لاہور پاکستان)

61. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(جلد اول)ص29،مجلس نشریات اسلام،کراچی پاکستان،1991)

62. (خالد محمود،انوارات،ص19،درالقلم،لاہور پاکستان)

63. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

64. (عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب،ص92،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

65. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص21،دار الکتب السلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

66. (عائشہ کمال، بارش تلے محبت،ص1، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال،2002)

67. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(جل اول)ص،29،مجلس نشریات اسلام،کراچی پاکستان،1991)

68. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص21،دار الکتب السلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

69. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص41،مکتبہ مصر

70. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں،ص10،الفیصل لاہور،2010

71. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص45،مکتبہ مصر

72. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں،ص14،الفیصل لاہور،2010

73. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص98،دار المسیرہ بیروت،1980

74. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص68، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016

75. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، 76، قبا گرافکس حیدر آباد، 2014

76. (Weedon, 1987, p. 108, http://www.massey.ac.nz/~alock/theory/foucault.htm)

77. (گوپی چند نارنگ، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ص33-32)

78. Applying Critical Discourse Analysis in Translation of Political Speeches and Interviews, Academic Journal of Interdisciplinary Studies Published by MCSER-CEMAS-Sapienza University of Rome, Vol 2, No 1,March 2013

79. Mason, Ian (1992) “Discourse, Ideology and Translation”. Language, Discourse and Translation in the West and Middle East.

80. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص45-41، مکتبہ مصر)

81. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص15-10، الفیصل لاہور، 2010

82. وحید الزماں قاسمی، القاموس الوحید، ص1808، کتب خانہ حسینیہ دیوبند، 2007

83. عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، ص460، مکتبہ برہان دہلی

84. DISCOURSE AND TRANSLATION STUDIES: A CASE STUDY OF GENRE INTERTEXTUALITY, Célia Maria MagalhãesUFMG, pg, 15

85. (فیضان اللہ بیگ، آئین نو، ص4، شعبۂ عربی، اے ایم یو علی گڈھ، 2010)

86. Tyler (British anthropologist) 1870:1; cited by Avruch 1998

87. Susan Petrilli, Translation Translation, Pg. 423

88. سجاد باقر رضوی، افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات، مشمولہ اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل مرتب اعجاز راہی، ص199

89. انتظار حسین، افسانوی ادب کے تراجم: مسائل اور مشکلات، مشمولہ اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل مرتب اعجاز راہی، ص4-203

90. مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص33

91. نصیر احمد خان، ترجمہ اور لسانیات، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص128

92. مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص37

93. نصیر احمد خان، ترجمہ اور لسانیات، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس، ص127

94. مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص34

95. Susan Patrilli, Translation Translation, Pg.420

96. P. K. Kalyani, Translation Studies, Pg. 83

97. محمد حسن عسکری، گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت مرتب قمر رئیس ص 112

98. (حبیب اشعر دہلوی، شہناز، ص 8، یونین پریس دہلی، 1954)

99. (حبیب اشعر دہلوی، رخسانہ، ص 7، مکتبہ ادب، چوک انارکلی لاہور، 1950)

100. (حبیب اشعر دہلوی، رخسانہ، ص 12 مکتبہ ادب، چوک انارکلی لاہور، 1950)

101. (فیضان اللہ بیگ، آئین نو ص 4، شعبۂ عربی، اے ایم یو علی گڑھ، 2010)

102. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص 41، مکتبہ مصر

103. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص 10، الفیصل لاہور، 2010

104. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص 5، مکتبہ مصر

105. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، 45، الفیصل لاہور، 2010

106. وحید الزماں قاسمی، القاموس الوحید، ص 861، کتب خانہ حسینیہ دیوبند، 2007

107. عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات، ص 431، مکتبہ برہان دہلی

108. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص 96، دار المسیرہ بیروت، 1980

109. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص 67، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016

110. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص 75، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

111. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص 96-95، دار المسیرہ بیروت، 1980

112. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص 75-74، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

113. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص 66-65، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

114. وحید الزماں کیرانوی، القاموس الوحید، ص 222، کتبہ خانہ حسینہ دیوبند، 2007

115. وحید الزماں کیرانوی، القاموس الوحید، ص 222، کتبہ خانہ حسینہ دیوبند، 2007

116. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص 96، دار المسیرہ بیروت، 1980

117. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص 66، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

118. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص 75، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

باب پنجم

مداخلت کی مختلف صورتیں

(اردو میں عربی ادب کے ترجمے کے حوالے سے)

خیالات کی منتقلی میں لسانی ساخت کی وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم میں چہرے کی ہے۔ بدن کے اندر جس طرح کی بھی کیفیات پیدا ہوتی ہیں خواہ کسی وجہ سے پیدا ہوں ان کا اظہار چہرے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ انسان پر خوشی، غم، رنج، تکلیف، اطمینان، گھبراہٹ وغیرہ مختلف قسم کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ان کیفیات کا تعلق تو شعور و ادراک اور قلب و ذہن سے ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہم ذہن میں تو جھانک کر دیکھ نہیں سکتے ہمارے سامنے اگر کوئی آلہ اور وسیلہ ہے تو وہ صرف چہرہ ہی ہے۔ اسی طرح مافی الضمیر یعنی وہ معانی و خیالات جو ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں ان کو دیکھنا تو عام حالات میں ممکن نہیں ہے ہاں ان کو سمجھنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے زبان یعنی مختلف اکائیوں کا مجموعہ جسے ساخت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ہم ساخت کی مدد سے ہی کسی رویہ یا رجحان یا معنی خیزی کی جانب رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

زبان مختلف عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہی عناصر زبان کی ساخت کہلاتے ہیں۔

''زبان کی ساخت سے مراد زبان کے مختلف عناصر کے درمیان رشتوں کا وہ نظام ہے جس کی بنا پر زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔'' 1ے

صوتیات وفونیمیات میں مداخلت

زبان کی ساخت کے مختلف عناصر میں سب سے پہلی اور سب سے بنیادی اکائی صوتیات رفونیمیات ہے۔لسانیات میں اس کا مطالعہ بہت اہمیت کا حامل ہے:

''توضیحی یا تجزیاتی لسانیات کی اہم شاخیں صوتیات اور فونیمیات ہیں جن میں زبان میں استعمال ہونے والی آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔'' 2؎

صوتیات اور فونیمیات دونوں کا رشتہ آوازوں سے ہی ہے لیکن دونوں کے درمیان فرق ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے اقتدار حسین لکھتے ہیں:

''صوتیات میں ہم زبان کی آوازوں کی طرز ادائیگی اور ان کے مخرج کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کو صوتیاتی رو سے بیان کرتے ہیں ۔ جب کہ فونیمیات (میں)اہم آوازوں کی پہچان اور ان کا آپس میں ساختی رشتے کا مطالعہ کرتے ہیں۔'' 3؎

لسانیات میں صوتیات رفونیمیات کا مطالعہ بہت اہمیت حامل ہے۔لیکن جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے اس کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا جاسکتا ہے جس طرح لسانیات میں کیا جاتا ہے۔دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ان کا مطالعہ بولی جانی والی زبان کے تحت ہوتا ہے نہ کہ تحریر کے تحت۔اس کے برخلاف ترجمہ کا تعلق تحریر سے ہے۔ بولی جانے والے زبان کی دوسری زبان میں منتقلی کو مطالعات ترجمہ میں ''ترجمانی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن چوں کہ تحریر زبان کا عکس ہے اس حیثیت سے یہاں اس کا مختصر جائزہ لیا جائے گا۔البتہ ترجمہ کے نقطۂ نظر سے بنیادی اکائی فونیم کو بنانے کے بجائے حرف تہجی کو مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کی جائے گی۔

حروف تہجی بنیادی آوازوں کی تحریری شکل یا تحریری عکس ہیں۔دنیا میں تمام زبانوں میں یکساں حروف نہیں ہوتے ۔ ہر زبان کے اپنے حروف تہجی ہوتے ہیں جو اس زبان کی تقریباً آوازوں کو ادا کرنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں۔کچھ آوازیں تمام زبانوں میں مشترک ہوتی ہیں اس لیے ان کی ادائیگی کے لیے حروف بھی موجود ہوتے ہیں؛ جب کہ کچھ آوازیں زبانوں کے ساتھ خاص ہوتی ہیں اور ان کی ادائیگی کے لیے حروف

تہجی اس زبان میں تو ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ ان کے متبادل حروف دوسری زبان میں بھی مل جائیں۔

اردو حروف تہجی اس اعتبار سے نہایت ثروت مند ہیں کہ اس میں بہت سی آوازیں ادا جا سکتی ہیں۔ مثلاً اردو میں ہندی آوازیں ''ٹ، ڈ، ڑ''، اسی طرح ہکائی آوازیں ''بھ، پھ، ٹھ، دھ، ڈھ'' وغیرہ ادا جا سکتی ہیں؛ لیکن عربی اور فارسی میں یہ آوازیں نہیں ادا کی جا سکتیں۔ اسی طرح عربی میں فارسی حروف تہجی ''چ، پ، ژ، گ'' نہیں ہیں۔ ہندی زبان میں ''ث، ز، ظ، غ، ق'' آوازوں کو ادا کرنے کے لیے حروف نہیں ہیں۔ انگریزی زبان میں ''ض'' وغیرہ آوازوں کے لیے حروف نہیں ہیں نیز بعض انگریزی آوازوں کی ادائیگی کے لیے ہمارے پاس حروف نہیں ہیں مثلاً catch, match وغیرہ آوازوں کو ہم ''کیچ، میچ یا کیاچ، میاچ'' سے ظاہر کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان آوازوں کا ہو بہو متبادل نہیں ہیں۔

ترجمہ میں حروف کی عدم موجودگی سے مشکل اس وقت درپیش آتی ہے جب اصل زبان کے لفظ کو ہدفی زبان میں استعمال کرنا ہو۔ ترجمہ میں مترجم کو بارہا اس عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر تحریر میں مقامات، اشخاص اور اشیاء کے مخصوص نام ہوتے ہیں جنہیں جوں کا توں استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اسے لکھنا تو اپنی زبان میں موجود حروف تہجی میں ہی ہے اور جب ہدفی زبان میں اس آواز کو ادا کرنے کے لیے حرف ہی نہیں تو مترجم کو لامحالہ اسے تبدیل کرنا پڑے گا۔ مثلاً ہندی زبان میں لفظ ''وضو'' کو ''وجو''، ''قلم'' کو ''کلم'' لکھا جائے گا۔ ''ارض'' اور ''عرض'' میں تمیز مشکل ہوگی؛ دونوں کو ہندی میں ''ارج'' لکھا جائے گا؛ کیوں کہ نہ تو وہاں ''ع'' کی آواز ہے نہ ہی ''ض'' کی۔ اسی طرح انگریزی میں وضو کو "whdhu" لکھیں گے۔ اس طرح کی تبدیلی سے معنوی فرق کے امکانات کم ہوتے ہیں البتہ اصل لفظ تک بسا اوقات رسائی مشکل ہو جاتی ہے۔

فلسطینی صحافی و ناول نگار امیل حبیبی کے عربی ناول 'الوقائع الغريبة في اختفاء سعيد ابی النحس المتشائل' کا اردو ترجمہ انتظار حسین نے 'سعید کی پراسرار زندگی' کے نام سے کیا ہے۔ اصل ناول عربی میں تھا جسے سلمیٰ خضرا جیوسی اور ٹریور لی گاسک نے انگریزی میں منتقل کیا۔ اسی انگریزی ترجمے سے اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے عربی متن کی طرف شاید رجوع نہیں کیا اور مصنف کا نام ''ایملی حبیبی'' درج کر دیا ہے جب کہ ان کا نام امیل حبیبی ہے۔ دراصل یہ اختلاف عربی اور انگریزی صوتیات میں فرق کی وجہ سے در آیا ہے۔[4]

اسی طرح نجیب محفوظ کے ضخیم ناول ثلاثیۃ کے آخری جز "السکریۃ" کا ترجمہ ظفر امام نے شوگر اسٹریٹ کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجمہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے 2011 میں شائع ہوا۔ مترجم کے سامنے عربی کے بجائے انگریزی متن تھا چنانچہ ناموں اور کرداروں میں غلطیاں در آئی ہیں۔ اس سلسلے میں ابرابر احمد اجراوی لکھتے ہیں:

''مترجم ظفر امام ہیں، جنہوں نے اس کے انگریزی متن کو سامنے رکھ کر ترجمہ کیا ہے۔ ناموں اور کرداروں کے ترجمے میں فاش غلطیاں در آئی ہیں، جو ایک مسلم اور عربی تہذیب سے واقف شخص کے لیے حیران کن بات ہے''۔5

ناموں اور کرداروں کی تبدیلی میں مترجم کی کم توجہی کا امکان ہے لیکن اسی ساتھ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مترجم نے براہ راست عربی سے ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے سامنے انگریزی متن رہا ہے اور عربی کے بہت سے الفاظ انگریزی املا میں بدل جاتے ہیں۔ مترجم نے انہیں کو بنیاد بنا کر ترجمہ کر دیا ہوگا اصل کی طرف رجوع نہیں کیا ہوگا۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ دونوں زبانوں کا صوتی نظام مختلف ہے۔

چنانچہ اس کی ایک مثال ''آب نیل پہ آوارگی'' نامی ناول میں ملتی ہے۔ یہ نجیب محفوظ کے مشہور ناول 'ثرثرۃ فوق النیل' پر مبنی ہے۔ اس کا ترجمہ پاکستان کے ادیب نیئر عباس زیدی نے کیا ہے۔ انہوں نے ترجمہ اصل عربی متن کے بجائے اس کے انگریزی ترجمے A Drift on the Nile سے کیا ہے جس کی وجہ سے کچھ صوتیاتی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابرار احمد اجراوی لکھتے ہیں:

''جیسا کہ انگریزی متون سے عربی متون کے ترجمے میں اسماء واماکن کے ترجمے میں اغلاط در آتی ہے، یہ ترجمہ بھی اس سقم سے پاک نہیں ہے۔''6

البتہ آوازوں کے نظام میں حروف تہجی کے علاوہ آوازوں کا وہ نظام بہت اہمیت کا حامل ہے جو قطعاتی فونیم کی بڑی شکل ہے یعنی فوق قطعاتی خصوصیات۔

''صوتیات میں قطعاتی فونیم کے علاوہ بھی زبان میں فوق قطعاتی خصوصیات بھی ہیں جو اہم ہیں کیوں کہ ان سے تلفظ اور معنی میں فرق پڑ جاتا ہے۔''7

فوق قطعاتی خصوصیات کو آسان الفاظ میں آوازوں کا اتار چڑھاؤ اور اتصال و انفصال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے کیفیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سے ایک ہی جملہ کئی معنوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں معمولی اتار چڑھاؤ یا بل سے لفظ کا تلفظ تو بدل جاتا ہے لیکن معنی نہیں بدلتے البتہ انگریزی میں معنی یا لفظ کی حیثیت بدل جاتی ہے مثلاً لفظ "PRESENT" اسم بمعنی ''تحفہ'' بھی ہو سکتا ہے اور فعل بمعنی ''پیش کرنا'' بھی۔ لفظ کے حروف تہجی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اسم اور فعل کا فرق صرف طرز ادا سے ظاہر کیا جاتا ہے جسے اہل زبان آسانی سے سمجھتے ہیں۔

آوازوں کے اتار چڑھاؤ کا اثر جملے کی سطح پر زیادہ عیاں ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جملہ ہے you are my wife۔ اس جملے کو آوازوں کے فرق کے ساتھ کئی معنی دیے جا سکتے ہیں۔ اس کا ترجمہ ہوگا ''تم میری بیوی ہو'' اگر اس جملہ کو کسی لفظ پر زور دیے بغیر سپاٹ لہجہ میں ادا کیا جائے تو محض ایک اطلاع ہوگی کسی خاص کیفیت کا اظہار نہیں ہوگا۔ اگر لفظ ''تم'' پر زور دے کر کہا جائے کہ 'تم'' میری بیوی ہو، تو مطلب ہوگا کہ تم ہی میری بیوی ہو کوئی اور نہیں، اگر ''میری'' پر زور دیا جائے تو مطلب ہوگا کہ تم ''میری'' ہی بیوی ہو کسی اور کی نہیں، اگر ''بیوی'' پر زور دیا جائے تو مطلب ہوگا کہ تم میری ''بیوی'' ہو یعنی میرے اور تمہارے درمیان زوجیت کا رشتہ ہے کوئی اور رشتہ نہیں، اگر ''ہو'' پر زور دیا جائے تو مطلب ہوگا کہ میرے اور تمہارے درمیان زوجیت کا رشتہ برقرار ہے۔ اسی طرح اسی ایک جملہ میں سوال ''تم میری بیوی ہو؟''، تعجب ''تم میری بیوی ہو!''، اور تمسخر ''تم میری بیوی ہو''!!! وغیرہ کا معنی بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

جليلة: من هذا الذي جئت به يا عقبة؟

عقبة: هذا قاتل أبينا يا جليلة. قاتل الحارث ببدر.

جليلة: خبيب بن عدي؟

عقبة: أجل..انك لتعرفين اسمه يا أخية.8

اب اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

جلیلہ: عقبہ بھائی یہ کون ہے جسے آپ ساتھ لائے ہیں؟

عقبہ: جلیلہ بہن! یہ ہمارے باپ کا قاتل ہے۔۔۔۔ ہمارے والد محترم کو میدان بدر میں اسی نے قتل کیا تھا۔

جلیلہ: خبیب بن عدی۔ کیا یہ خبیب ابن عدی ہے؟

عقبہ: ہاں۔۔۔۔ اچھا تو تم اس کا نام بھی جانتی ہو؟[9]

عقبہ ایک شخص یعنی خبیب بن عدی کو قید کر کے گھر لاتا ہے۔ اس کی بہن اس سے سوال کرتی ہے کہ یہ کون ہے؟ تو عقبہ بتاتا ہے کہ اسی شخص نے جنگ بدر میں ہمارے باپ کو قتل کیا تھا۔ جلیلہ فوراً اس کا نام لیتی ہے 'خبیب بن عدی' اس جملے کے آخر میں مصنف نے سوالیہ نشان لگایا ہے۔ مترجم نے اس کو علامت کو لفظوں میں بھی بیان کر دیا' کیا یہ خبیب بن عدی ہے؟' اس پر عقبہ کہتا ہے ''أجل۔۔انك لتعرفين اسمه يا أخية'' مترجم نے اس کا ترجمہ کیا ہے 'ہاں۔۔۔۔ اچھا تم اس کا نام بھی جانتی ہو؟ جب کہ اصل متن کی عبارت میں مصنف نے یہاں سوالیہ نشان نہیں لگایا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کا ترجمہ ہونا چاہیے ''ہاں۔۔۔۔ ارے بہن تم تو اس کا نام بھی جانتی ہو''۔ صورت حال یا کیفیت کے اظہار کے لیے یا لہجے کی نوعیت ظاہر کرنے کے لیے مترجم نے سوالیہ نشان کا استعمال کر کے مداخلت سے کام لیا ہے۔

یہی حال جملے میں اتصال اور انفصال کا بھی ہے۔ اس قسم کی صورت حال کا سامنا تحریری زبان میں کم پڑتا ہے لیکن بسا اوقات تشابہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً ''اٹھو مت بیٹھو''، ''زندگی موت کا سوال ہے'' ہے جیسے جملوں میں اشتباہ کا امکان ہے۔

ترجمہ میں اس قسم کی مشکلات کو دو طرح سے حل کیا جاتا ہے۔ پہلی صورت تو رموز واوقاف کا استعمال ہے۔ اس کی مدد سے منشاء متکلم اور کیفیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ مترجم یہ معلوم کر لیتا ہے کہ جملہ ختم ہو گیا یا تسلسل باقی ہے، سوال ہے یا تعجب۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ رموز واوقاف کا استعمال بہت قدیم نہیں ہے۔ قدیم کتابوں میں اس کا استعمال نہیں ملتا۔ بعد کے ادوار میں رموز واوقاف کے استعمال کا رواج آہستہ آہستہ پروان چڑھا۔ نیز تمام زبانوں میں ان کے استعمال کی شرح مختلف ہے۔ چنانچہ جن تحریروں میں ان کا استعمال

نہ ہوا ہوان میں جملے کو سمجھنے میں غلطی کی صورت میں ترجمہ کے دوران معنی میں تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے۔

دوسری صورت جملے کا سیاق ہے اور درحقیقت اخذ مفہوم میں سب سے بہترین وسیلہ سیاق ہی ہے۔ چنانچہ ماہرین ترجمہ (جیسا کہ ڈسکورس کی بحث میں گزر چکا ہے) اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جملے کو پورے سیاق کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ سیاق سے منشاء مصنف اور جملے کو ادا کرنے والے کی کیفیت واضح ہو جاتی ہے۔ ترجمہ میں اس قسم کی صورت حال میں مترجم کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں اول تو وہ بھی اسی طرح اس جملے کو استعمال کر لیتا ہے۔ لیکن بسا اوقات اسے متن میں اضافہ کر کے اس کیفیت کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ڈراموں میں اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک مثال کے ذریعے اس کو ملاحظہ کریں:

عامر: لكن يا أمه...

جليلة: أليس برجليه القيد؟

عامر: بلى يا أمه.

جليلة: فأي شئي تخشى منه؟

عامر: لست أخشى شيئاً منه و لكنه لا يستحق الضرب. انه رجل طيب.

جليلة: ويلك هذا قاتل جدك الحارث يا لكع.[10]

اس کا ترجمہ خاور بٹ نے اس طرح کیا ہے:

عامر: لیکن امی جان!۔۔۔۔۔۔۔ (جیسے کہتے کہتے رک سا گیا ہو)

جلیلہ: کیا اس کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہیں؟

عامر: بیڑیاں تو ہیں۔

جلیلہ: تو پھر اس سے کیوں ڈر رہے ہو؟

عامر: میں کسی سے نہیں ڈرتا، لیکن اسے مارنا نہیں چاہیے کیونکہ وہ تو بہت اچھا شخص ہے۔ (ماں کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے)

جلیلہ: (دور خلا میں گھورتی ہوئی انتقامی انداز میں) خدا تمہیں غارت کرے۔ وہ

تمہارے نانا کا قاتل ہے!11ے

مذکورہ بالا اقتباس کے پہلے اور آخر کے دو جملوں کے ترجمے پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ پہلے جملے میں مترجم نے قوسین میں ''جیسے کہتے کہتے رک سا گیا ہو'' آخری سے پہلے والے جملے میں ''ماں کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے'' اور آخری جملے میں ''دور خلا میں گھورتی ہوئی انتقامی انداز میں'' کا اضافہ کیا۔ اصل متن میں ان کے لیے کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ مترجم نے کیفیت اور صورت حال زیادہ بہتر انداز میں نظروں کے سامنے لانے کے لیے سیاق کو ملحوظ رکھ کر یہ اضافہ کر دیا۔ اس اضافہ سے مفہوم زیادہ بہتر انداز میں تو سامنے آ سکتا ہے لیکن یہ متن میں مداخلت ہے۔ نیز آخری جملے میں مترجم نے جملہ بڑھایا ہے وہ سیاق سے بھی دور لگ رہا ہے کیونکہ جلیلہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے یہ جملہ کہہ رہی ہے حالانکہ عربی متن میں ندا کا لفظ آیا ہے۔

صوتیاتی نظام کا اثر ہمیں استعاراتی جملوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً انگریزی کہاوت ہے "A friend in need is a friend in deed" اردو میں اس کا ترجمہ ''دوست کی پہچان ضرورت کے وقت ہوتی ہے''۔ اسی کا عربی ترجمہ ہے ''الصدیق وقت الضیق''۔ عربی ترجمہ اردو ترجمہ کے مقابلے میں زیادہ قریب اور بھلا اس لیے معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس میں صوتی ہم آہنگی کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔

نعروں اور اشتہارات وغیرہ میں بھی صوتی آہنگ کا خاص خیال رکھتا جاتا ہے کیوں کہ آواز لوگوں کی توجہ مبذول کرانے اور دلچسپی و رغبت پیدا کرنے میں معاون بنتی ہے۔ مثلاً ''بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ''، ''سب پڑھیں سب بڑھیں'' وغیرہ نعروں میں صوتی نظام کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اخبارات وغیرہ کی سرخیوں میں بھی اس چیز کی طرف توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو صوتی اعتبار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ مسجع و مقفی عبارت آرائی کا جو نظام اردو، عربی وغیرہ زبانوں میں رائج ہے اس میں صوتیات کی پابندی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس طرح کی پابندی کا مقصد عبارت میں نغمگی پیدا کرنا ہوتا ہے۔

نثر کے مقابلے میں صوتیاتی نظام شاعری میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً پابند شاعری کی بنت میں صوتیات کا خاص کردار ہوتا ہے۔

"Perhaps the most important and recurrent

phonological features are used in poetry." 12

(شاید سب سے زیادہ اہم اورمکرر صوتیاتی خصوصیات کا استعمال شاعری میں ہوتا ہے۔)

شاعری میں ردیف، قافیہ، بحر واوزان کی پابندی کا ایک اہم اثر صوتی آہنگ کے نظام کا قیام یا اس کی پابندی ہے۔اس سے شعر کے اندر نغمگی اور غنائیت پیدا ہوتی ہے جو کہ شعر کا اہم وصف ہے۔خصوصاً اردو زبان کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے گفتگو کریں تو اردو شاعری میں غنائیت کا مقام بہت بلند نظر آتا ہے۔لوگ وہی شاعری پسند کرتے ہیں جس میں یہ عنصر موجود ہو۔پروفیسر حسن غزالہ اسے ترجمہ کی اہم مشکلات میں شمار کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"such density and richness of sound features and effects poses an edtremely difficult problem of translation" 13

(صوتی خصوصیات اور اثرات کی زیادتی اور پیچیدگی ترجمہ کی راہ میں بہت بڑا مسئلہ ہے)

جب مترجم کو صوتی آہنگ کی پاسداری کرنی پڑتی ہے تو اس عمل سے ترجمہ میں مفہوم کے فوت ہونے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔پروفیسر غزالہ لکھتے ہیں:

"An esthetic type of language like poetry demands an special attention by translators to sound, or else the beauty as well as the maessage will be distorted." 14

(شاعری کی مانند زبان کی جمالی قسم آواز کی طرف مترجم کی خصوصی توجہ چاہتی ہے ورنہ حسن نیز پیغام بھی مسخ ہو جائے گا)

صوتی آہنگ کی عدم پابندی سے حسن تو متاثر ہوگا ہی، جہاں تک معنی کا تعلق ہے تو بسا اوقات شاعری

میں آہنگ ہی معنی آفرینی کا کام انجام دیتا ہے اسی صورت حال میں عدم پابندی اسے بھی متاثر کردے گی۔ ظاہر ہے کہ ہر زبان میں صوتی نظام یکساں نہیں ہوتا ہے۔لہذا اس کی کلی پابندی یا ہر زبان میں پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔مترجم کو لامحالہ اپنی زبان کے صوتی آہنگ تک محدود رہنا ہوگا۔نیز اس بات کا بھی امکان ہے کہ اصل زبان میں صوتی آہنگ اتنا زیادہ نہ ہو لیکن ہدفی زبان میں اس میں زیادہ آہنگ اور نغمگی برتی جائے۔مثلاً انگریزی کی کسی نظم کا ترجمہ اردو میں کیا جائے اور پابند شاعری میں کیا جائے تو اس میں صوتی نظام کا آہنگ زیادہ ہوگا۔جو درحقیقت ترجمہ میں مداخلت ہی ہے۔

قرآن کے تراجم بالخصوص منظوم تراجم کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو اس کی مثال بہ آسانی مل جائے گی۔قرآن کے الفاظ میں جو آہنگ و بلندی اور زور ہے وہ ترجمے میں پیدا ہی نہیں ہوسکتا ہے۔مثال کے طور پر سورہ بقرہ کی آیت نمبر 6 کا ترجمہ ملاحظہ فرمائے:

ان الذين كفروا سواء عليهم أأنذرتهم ام لم تنذرهم لا يؤمنون۔[15]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

جن لوگوں نے (ان باتوں کو تسلیم کرنے سے) انکار کردیا، ان کے لیے یکساں
ہے، خواہ تم انہیں خبردار کرو یا نہ کرو، بہرحال وہ ماننے والے نہیں ہیں۔

جو شخص عربی زبان سے واقف ہے اور عربی زبان کا مزاج داں ہے یا عربی کا ذوق رکھتا ہے یا قرآن کے اسلوب کی پرکھ ہے وہ علی الاعلان بلا کسی تردد کے یہ کہہ دے گا کہ اردو ترجمے میں وہ بات نہیں ہے۔یہ تو رہی نثر کی بات جس میں بہرحال گنجائش نظم کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے کہ مفہوم کی ترسیل و تفہیم کے لیے الفاظ و جملے میں اضافہ کیا جاسکے لیکن نظم میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی چنانچہ اسی آیت کا منظوم ترجمہ ملاحظہ کریں۔

یقیناً کافروں کے حق میں دونوں حال یکساں ہیں ڈرائیں یا نہ آپ کو ڈرائیں وہ "کسی عنواں"
نہ لائیں گے کبھی ایمان مولائے دوعالم پر[16]

منظوم ترجمے میں آہنگ نہیں بلکہ نغمگی ہے جس کا قرآن کی نثری نغمگی اور آہنگ سے کوئی میل نہیں ہے۔اس ترجمے میں قرآنی اسلوب کی ذرا بھی جھلک تک نظر نہیں آتی۔

الفاظ میں مداخلت

ترجمہ مسلسل متبادلات کا عمل ہے۔ یہ عمل سب سے پہلے اور بنیادی طور پر لفظ سے شروع ہوتا ہے۔ مترجم سب سے پہلے اصل متن کے الفاظ کا متبادل ہدفی زبان میں تلاش کرتا ہے۔ جہاں تک متبادلات کا تعلق ہے اس ضمن میں اپنی زبان کا ایک خاص ذخیرہ و دائرہ کار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لفظ کا متبادل ہر زبان میں نہیں ملتا ہے۔ زبانوں کے ذخائر الفاظ کی سطح مختلف ہوتی ہے۔ کسی زبان میں زیادہ الفاظ ہوتے ہیں اور کسی میں کم ۔خصوصاً ترقی یافتہ زبانیں اس سلسلہ میں زیادہ مالا مال ہوتی ہیں۔ اس کی سماجی، ثقافتی، معاشرتی اور معاشی بہت ساری وجوہات ہیں؛ کیوں کہ انہیں کے زیر اثر الفاظ تشکیل پاتے ہیں۔ جس زبان میں یہ چیزیں زیادہ ہوں گی وہاں ان الفاظ کی کثرت ہوگی۔ دائرہ کار سے یہی مراد ہے۔ اس کا اثر ہمیں مضامین کی سطح پر دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ مثلاً کسی زبان میں ایک مضمون کو بیان کرنے کے لیے تو بہت سارے الفاظ میسر ہیں لیکن دوسرے مضامین کے لیے ان کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں ادبی مضامین کو بحسن وخوبی بیان کیا جاسکتا ہے لیکن سائنسی مضامین کے بیان کرنے میں قدم قدم پر الفاظ کی جھولی خالی نظر آئے گی۔ یہ بات صرف اردو زبان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کو اس مسئلہ سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے فرق یہ ہے کہ کسی زبان کو کم کسی کو زیادہ۔

یہ بات مسلم ہے کہ ہر زبان میں یکساں متبادل کا موجود ہونا ناممکن ہے۔ خصوصاً علمی اور سماجی وثقافتی سطح پر اس مشکل کا سامنا زیادہ ہوتا ہے۔ علمی تحریروں میں مترجم کے سامنے اصطلاحات کا مسئلہ سب سے اہم ہوتا ہے۔ ہر علم کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ یہ اصطلاحات عموماً وہیں تشکیل پاتی ہیں جہاں یہ علم فروغ پاتا ہے اور اسی زبان میں تشکیل پاتی ہیں جہاں کے افراد اس علم کی ترویج کرتے ہیں۔ مثلاً موجودہ دور ہیں علمی کاوشیں عموماً مغربی ممالک اور انگریزی زبان میں سامنے آتی ہیں، اسی طرح سابق میں علمی میدان میں عربوں کا غلبہ تھا اور عربی زبان کو آفاقی علمی زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس غلبہ کا کیا اثر ہوتا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انگریزی زبان کی تمام تر علمی وسعت کے باوجود آج بھی ان علوم کی بہت سی عربی اصطلاحات موجود ہیں

جن سے عربوں نے دنیا کو متعارف کروایا تھا۔ مثلاً Admiral (امیر البحر)، Alcohol (الکحل)، Algebra (الجبرا) وکی پیڈیا پر اس قسم کے سیکڑوں الفاظ موجود ہیں۔ 17ے

جس طرح عربی الفاظ انگریزی میں موجود ہیں اسی طرح اس قسم کے الفاظ دنیا کی تمام زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ترقی پذیر یا غیر ترقی یافتہ زبانوں میں اس کی کثرت ہوتی ہے یا ان زبانوں میں کثرت ہوتی ہے جن میں دوسری زبان کے الفاظ مستعار لینے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے جس کی بہترین نظیر ہماری اردو زبان ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لفظ یا ترکیب اصل اور ہدفی دونوں زبانوں میں رائج ہوتی ہے جس کی وجہ سے دوران ترجمہ مترجم اس جانب خاص توجہ نہیں دیتا یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ غیر شعوری طور پر وہ الفاظ یا تراکیب استعمال کر جاتا ہے۔ جیسے' یارسول اللہ' یہ جملہ عربی کا ہے۔ یا حرف ندا اور رسول اللہ مضاف و مضاف الیہ سے مل کر منادیٰ؛ لیکن اردو میں بھی عام طور پر بولا جاتا ہے اس لیے مترجم نے ہو بہو اسی لفظ کو استعمال کر لیا۔

"قال یا رسول الله ماأنا الا من قومي"18ے

انوارات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں بھی اپنی ہی قوم میں سے ہوں''۔19ے

بعینہ اسی لفظ کو صاحب مبشرات نے بھی برقرار رکھا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ کریں:

''تو اس نے کہا یارسول اللہ میں بھی اپنی قوم میں سے ہوں اور ان کا ایک فرد ہوں''۔20ے

اس کے علاوہ اسی کتاب کے دو مزید ترجموں، لمعات الذہب اور بیان المختارات میں اس جملے کا ترجمہ کر کے ''اے اللہ کے رسول'' استعمال کیا گیا ہے۔

قریب کی دو زبانوں جن میں خاندانی یا ثقافتی قربت زیادہ ہو، آپس میں لسانی تاثیر و تاثر کا رشتہ ہو، بعینہ الفاظ استعمال کر لینے کی مثالیں بہت مل جائیں گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک ہی لفظ دونوں

زبانوں میں استعمال ہوتا ہے؛ کبھی یکساں معنی میں کبھی الگ معنوں میں۔اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

"الأنصار شعار والناس دثار" 21؎

لمعات الذہب میں اس عبارت کا ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے:

''انصار تو شعار ہیں (یعنی مجھ سے ان کا اتصال بہت ہی قوی اور مستحکم ہے) اور دیگر لوگ دثار ہیں (یعنی ان کا اتصال مجھ سے اتنا مستحکم نہیں ہے)''۔22؎

اسی طرح مختارات کے ایک ترجمے 'انوارات' میں بھی ہو بہو اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے:

''انصار، شعار (بدن سے لگا ہوا کپڑا) کی مانند ہیں اور دوسرے لوگ دثار (اوپر اوڑھنے والا کپڑا) کی مانند ہیں''۔23؎

دونوں ترجموں میں مترجم نے اصل متن کے الفاظ کو ہو بہو ترجمہ میں منتقل کر دیا اور بعد ازاں اس کی تشریح قوسین میں کر دی۔ان دونوں میں سے ایک لفظ 'شعار' اردو میں مروج و مستعمل ہے۔اس قسم کے استعمال کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

أصبحتُ مُطّرَحاً في معشرجهِلوا

حَقَّ الأديب فباعواالرأسَ بالذَّنَبِ

میں پھینک دیا گیا ہوں ایسے معاشرہ میں جو بے خبر ہے ادیب کے حق سے اور سر کو دُم کے عوض فروخت کرتے ہیں۔24؎

پہلے مصرعہ میں ایک لفظ معشر کا استعمال ہوا ہے۔مترجم نے اس کا ترجمہ 'معاشرہ' کیا ہے۔معشر کا لفظ اردو میں مستعمل نہیں ہے لیکن اس کے قریب الصوت لفظ معاشرہ ضرور رائج ہے۔معنوی اعتبار سے جزئی مناسبت کا بھی امکان نکالا جا سکتا ہے؛ لیکن محل استعمال اور روزمرہ کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔عربی میں معشر کہتے ہیں:

المعشر :ایک طرز کے لوگ، جماعت جس کے مشاغل واحوال ایک جیسے ہوں جیسے: معشر الطلاب و معشر التجار ۔قرآن پاک میں ہے:''یا

معشر الجن والانس الم یأتکم رسل منکم۔''25؎

لغت کے مندرجہ بالا حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ معشر معاشرے سے الگ ہے۔ معاشرہ سماج کا متبادل ہے جس میں الگ الگ مشاغل واحوال رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے۔عربی میں اس کے لیے مجتمع کی اصطلاح رائج ہے۔صوتی اور حرفی قربت نے مترجم کو ملتبس کر دیا اور مداخلت پیش آ گئی۔

اصطلاحی الفاظ بھی بکثرت مستعار لینے پڑتے ہیں؛ کیونکہ ان کا متبادل دوسری زبان میں نہیں ملتا۔البتہ یہ کوئی کلی اصول نہیں ہے اور نہ ہی ہر زبان کے لیے قابل عمل۔ چنانچہ ہر زبان میں اصطلاح سازی کا عمل ہوتا ہے۔ یہ دونوں طریقے ہر وقت قابل عمل نہیں ہیں۔ نہ تو کسی متن میں موجود تمام کی تمام اصطلاحات کو ہو بہو استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تمام اصطلاحات کی متبادل اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں؛ کیونکہ یہ عمل وقت طلب اور دقت طلب ہے نیز دشوار بھی۔اسی طرح ان طریقوں پر عمل درآمد کرنا تحریر کی نوعیت پر بھی منحصر ہے۔ ہر تحریر اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی کیوں کہ ضبط تحریر میں قارئین کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ایسی صورت میں ایک تیسرا راستہ 'تشریح' کا اختیار کرنا پڑتا ہے۔اس میں مترجم اصل زبان کی اصطلاح یا اس کا متبادل استعمال نہیں کرتا ہے بلکہ اس کی تشریح کر دیتا ہے۔ یہ تشریح مداخلت ہی تو ہے کہ اصل میں ایک لفظ تھا لیکن ترجمہ میں ایک لفظ کی جگہ کئی الفاظ استعمال کئے گئے۔

انگریزی زبان میں استعمال ہونے والی عربی اصطلاحات کے ضمن میں یہ بات کہی گئی کہ انہیں انگریزی زبان کے مطابق ڈھال لیا گیا۔الفاظ کو اپنی زبان کی خراد پر چڑھانے کا عمل بھی ایک قسم کی لفظی مداخلت ہے۔ یہ عمل بھی ہر زبان میں ہوتا ہے۔ایسا اس لیے ہوتا ہے کیوں کہ اصل زبان کے الفاظ کی ادائیگی ہدفی زبان میں ثقیل ہوتی ہے۔اس عمل کو عربی میں تعریب، فارسی میں تفریس اور اردو میں تارید کہا جاتا ہے۔ اس وقت عربی زبان میں یہ طریقہ بہت رائج ہے۔ وہاں انگریزی اصطلاحات کے متبادل بنانے کے ساتھ ساتھ تعریب کا عمل بھی خوب انجام دیا جاتا ہے۔مثال کے طور پر کمپیوٹر کو کمبیوتر، ٹیلیفون کو تلفیزیون، انٹرنیٹ کو انتر نیت، پٹرول کو بترول سے بدل دیا گیا۔

اردو میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں۔ جہاں دوسری زبان کے الفاظ کو اردو زبان کے مزاج کی خراد پر چڑھا کر اردو سے ہم آہنگ کر دیا گیا۔ عربی الفاظ کے ساتھ بھی یہ عمل کیا گیا چناں چہ ''عـضـلـہ'' کو ادلہ سے، ''فـأل'' کو فال سے بدل دیا گیا۔ Lantern کو لالٹین سے بدل دیا گیا۔ دوسری زبان کے الفاظ کی تعریب وتارید بھی الفاظ میں مداخلت کے زمرے میں ہی شامل ہے۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ عمل ترجمہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ تخلیقی تحریروں میں بھی یہ عمل انجام دیا جاتا ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ عمل ترجمہ میں زیادہ ہوتا ہے یا ترجمہ میں اس سے سابقہ زیادہ پڑتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس عمل کا نقطۂ آغاز عموماً ترجمہ ہی بنتا ہے۔

الفاظ کی سطح پر مداخلت کا ایک اہم میدان سماجی وثقافتی الفاظ ہوتے ہیں۔ ان کا ترجمہ تو اصطلاحات سے بھی مشکل ہوتا ہے؛ اصطلاحات میں تو یہ آسانی ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان میں متبادل اصطلاحات وضع کر لیتے ہیں لیکن ثقافت اور مخصوص سماج کے پروردہ الفاظ کا متبادل بھی وضع نہیں کیا جا سکتا۔ عموماً مترجم اس قسم کے الفاظ کو ہو بہو استعمال کر کے حسب ضرورت ان کی تشریح کر دیتے ہیں۔ دوسرا طریقہ ہوتا ہے کہ اپنی ثقافت سے ان کے متبادل تلاش کرتے اور استعمال کرتے ہیں۔

تہذیب وثقافت سے متعلق اکثر وبیشتر الفاظ میں یہی مشکل درپیش آتی ہے۔ اشیاء خورد ونوش، ملبوسات، رشتہ وتعلقات کا اظہار کرنے والے الفاظ اسی ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً ہمارے یہاں پوری، کچوری، چھولے بٹورے، پھلکے، جلیبی، مرغ مسلم، تنجن، اڈلی، ڈوسا وغیرہ موجود ہیں ان کے متبادل دوسری زبان میں ملنے مشکل ہیں کیوں کہ وہاں یہ کھانے ہی نہیں ہیں۔ اسی طرح لنچ وڈنر ہے ہم اس کے لیے ظہرانہ و عشائیہ تو استعمال کر سکتے ہیں لیکن دونوں کا سیاقی پس منظر مختلف ہوگا۔ وہ اس لیے کہ وہ لنچ میں کیا کھاتے ہیں، کب کھاتے ہیں؟ سب کچھ معنی رکھتا ہے۔ یہی حال رشتوں، ملبوسات اور اس قسم کے تمام الفاظ کا ہے۔

القاب وآداب اور عہدوں سے متعلق الفاظ میں مداخلت کا بہت امکان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ ہر زبان کے اپنے القاب وآداب ہوتے ہیں۔ ہر ملک میں عہدوں کی تقسیم کا نظام یکساں نہیں ہوتا۔ حکومتی نظام اور عہدے مختلف ہوتے ہیں۔ اردو میں القاب وآداب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں حقیر

فقیر سراپا تقصیر سے لے کر ظل الٰہی تک الفاظ کا ایک انبار ہے۔ ہم خط لکھتے ہیں تو اس میں ''عزت مآب عالی جناب''، ''محترم المقام قابل صد احترم'' لکھتے ہیں۔ یہی حالت نسبتوں کی بھی ہوتی ہے جیسے قاسمی، دیوبندی، علیگ، قادری، شطاری، نقشبندی، جیلانی، سمنانی، رضوی وغیرہ وغیرہ۔ بڑا عجیب معاملہ ہمارے یہاں لفظ "Sir" کا ہے ہم ہر کسی کو یا کم ازکم ہر استاد کو سر کہتے ہیں، حقیقت حال یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص لفظ جو بطور اعزاز عطا کیا جاتا ہے۔

القاب وآداب ہی کی طرح وہ الفاظ بھی ہیں جو بطور احترام وتقدس وتبرک استعمال کیے جاتے ہیں بالخصوص مذہبی شخصیات کے لیے۔ مثال کے طور پر انبیاء کے لیے 'علیہ السلام'، نبی کریم کے لیے 'ﷺ'، صحابہ کے لیے 'رضی اللہ عنہ'، صحابیات کے لیے 'رضی اللہ عنہا' اور بزرگان دین کے لیے 'رحمۃ اللہ علیہ' کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہماری زبان کا مزاج اور ہماری فطری تربیت اس طرح پروان چڑھی ہے کہ ہم ان مقدس ہستیوں کے ساتھ ان کے لیے تبرکاً وتیمناً استعمال ہونے والے الفاظ کے اضافے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ایسا بہت مرتبہ دیکھا گیا ہے کہ اصل عبارت میں یہ الفاظ بطور لاحقہ شامل نہیں ہیں لیکن اردو میں اسے شامل کر دیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اردو میں عربی کے افعال میں مستتر ضمیر کو بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے 'قال' عربی میں واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور اس میں 'ھو' کی ضمیر مخفی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ 'کہا' ہو سکتا ہے لیکن حسب ضرورت 'اس نے کہا' کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جو ضمائر عربی میں اسم یا حرف کے ساتھ مل کر آتے ہیں ان کے لیے اردو میں عربی جیسا کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ ضمیر کو الگ ہی ذکر کیا جاتا ہے، جیسے 'علیه' (اس پر) 'قومك' (تمہاری/آپ کی قوم) وغیرہ۔ چنانچہ اردو میں تبرکاً استعمال ہونے والے الفاظ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> عن ابي سعيد الخدري قال لما اعطى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أعطى من تلك العطايا الكبار في قريش و في قبائل العرب ولم يكن في الأنصار منها شئ وجد هذا الحي من الأنصار فى أنفسهم حتى كثرت فيهم القالة حتى قال قائلهم

لـقي والله رسول الله صلى الله عليه وسلم قومه، فدخل عليه سعد بن عبادة فقال يا رسول الله ان هذا الحي من الأنصار قد وجـدوا عـليك في أنفسهم لما صنعت في هذا الفئ الذي اصبت قسـمـت في قومك واعطيت عظامافي قبائل العرب ولم يكن في هـذا الـحـي مـن الأنـصـار مـنهـا شئ۔ قال فأين انت من ذلك يا سـعـد؟قـال يـا رسـول الـلـه مأأنا الا من قومي! قال فاجمع لي قـومك في هذه الحظيرة قال فجاء رجال من المهاجرين فتركهم فـدخـلـوا وجاء آخرون فردّهم فلما اجتمعوا أتى سعد فقال قد اجتـمـع لك هـذا الـحـي مـن الأنصار فأتاهم رسوالله صلى الله عليه وسلم فحمد الله و أثنى عليه بما هو أهله ثم قال:26؎

اس پوری عبارت میں نبی کریم ﷺ کا نام مبارک تین مرتبہ بطور اسم استعمال ہوا ہے اور درود یعنی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مذکور ہے، بقیہ جگہوں پر یا ضمیر مستتر ہے یا ندا ہے۔ دو صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ کا ذکر ہے، کہیں بطور اسم کہیں بطور ضمیر؛ لیکن کہیں بھی ترضیہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے دستیاب چاروں ترجموں کا مذکورہ عبارت کو مدنظر رکھتے ہوئے متعلقہ حوالے سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر ترجمہ اس معاملے میں دوسرے سے الگ اور اصل سے مختلف ہے۔

مبشرات فی حل مختارات نامی ترجمے میں جملہ دس مرتبہ درود تحریر ہوا ہے جس میں تین مترتبہ مکمل یعنی ﷺ کی صورت میں۔ اس میں یہ نقطہ پیش نظر ہوسکتا ہے کہ اصل عبارت میں جہاں مکمل نام مع درود ذکر تھا اس کو ﷺ سے ظاہر کیا گیا ہے اور بقیہ جگہوں پر (ؐ) کی علامت تحریر کی گئی ہے۔ تین جگہوں پر صحابہ کے اسم یا ضمیر کے ساتھ ترضیہ بشکل علامت ذکر کیا گیا ہے۔27؎ لمعات الذہب میں درود 8 مرتبہ اور ترضیہ 6 مرتبہ اور ہر جگہ مکمل۔28؎ بیان المختارات میں درود 6 مرتبہ اور ترضیہ 4 مرتبہ اور ہر مرتبہ مکمل۔29؎ انوارات میں درود جملہ 12 مرتبہ مذکور ہے جس میں 6 مرتبہ مکمل اور 6 مرتبہ علامت سے کام لیا گیا ہے۔ ترضیہ کا جائزہ لیا جائے تو کل 4 مرتبہ ترضیہ مذکور ہے جس میں صرف ایک مرتبہ مکمل ترضیہ لکھا گیا ہے۔30؎

چاروں ترجمے کے متعلقہ تجزیے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس سلسلے میں کسی خاص اصول کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ ہر کسی نے اپنے اعتبار سے اس کو استعمال کیا ہے۔ تعداد کی کمی بیشی اور اصل سے زیادتی اصل متن کے ساتھ مداخلت ہے۔

الفاظ میں مداخلت کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ اصل متن میں ایک لفظ کے متبادل ایک سے زائد الفاظ میں ظاہر کیے جائیں۔ اس تبدیلی سے عموماً متن کے معنی پر کوئی فرق نہیں پڑتا؛ بلکہ معنی کی تشریح اور عمدہ طریقہ سے ہو جاتی ہے؛ لیکن ساخت کے اعتبار سے مداخلت ہی مانی جائے گی کہ اصل میں ایک لفظ تھا اور ترجمے میں زائد از ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی مثال دیکھئے:

وكان فيمن معه من السباع ابنا آوى يقال لأحدهما (كليلة)

والآخرِ (دمنة) وكانا ذوي دهاء وعلم وادب۔31

خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

اس کے درباریوں میں دو گیڈر تھے، ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا ''دمنہ''

وہ آپس میں بھائی تھے اور بڑے چالاک، ہوشیار اور علم وادب والے تھے۔32

رفیع الدین حنیف نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے:

اس کے ساتھ جو درندے رہتے تھے، ان میں دو گیڈر بھی تھے، ان میں سے ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا نام ''دمنہ'' وہ دونوں نہایت مکار، چالاک، اور ذی علم تھے۔33

یہاں اصل متن کا لفظ دھاء زیر گفتگو ہے۔ دونوں ترجموں میں اس ایک لفظ کی جگہ دو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ پہلے ترجمے میں ''چالاک، ہوشیار'' اور دوسرے ترجمے میں ''مکار، چالاک''۔ معنوی اعتبار سے کون سے متبادل اصل متن سے قریب تر اس سے قطع نظر یہاں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ایک لفظ کی جگہ دو لفظ استعمال کر کے مداخلت سے کام لیا گیا ہے۔ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنی چاہیے کہ ایسا کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی؛ کیونکہ جو متبادل لائے گئے ہیں وہ قریب المعنی ہی ہیں؛ چنانچہ ایک ہی لفظ کافی ہو سکتا تھا۔

جہاں تک عہدوں تک تعلق ہے اس میں بھی دو زبانوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر وزیر خارجہ کے لیے ہمارے یہاں Foreign Minister استعمال ہوتا ہے، امریکہ میں Secretary of State، برطانیہ میں Foreign Secretry۔ وزیر خزانہ کے لیے ہمارے یہاں Finance Minister، امریکہ میں Chanceller of Exchequer، برطانیہ میں Secretary of Treasury استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح امریکہ و برطانیہ میں وزیر جنگ کے لیے بالترتیب SecretaryState of War اور Secretary of War کا لفظ استعمال ہوتا ہے جب کہ ہمارے یہاں یہ وزارت ہی نہیں ہے۔ اسلام میں خلافت کا تصور ہے۔ وہاں خلیفہ، امیر المومین ہوتا ہے۔ شہنشاہیت میں بادشاہ وسلطان ہوتا ہے جب کہ جمہوریت میں وزیر اعظم۔

بہر حال القاب و اداب اور نسبتوں کا متبادل ملنا بہت مشکل بلکہ کسی حد تک ناممکن ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مترجم کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں ایک تو اسی لفظ کو استعمال کر کے اس کی تشریح کرنا دوسرے اگر اس متن میں ان کی اہمیت بہت زیادہ نہ ہو تو اپنی زبان کی رعایت کرتے ہوئے حذف بھی کر دینا۔ یہ دونوں راستے لفظ میں مداخلت کی ایک شکل ہیں۔

جہاں تک عہدوں کا تعلق ہے اس میں متبادلات کا امکان ہوتا ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ایسی صورت میں مترجم اس کی تشریح کرتے ہوئے کبھی اس فرق کو واضح کر دیتا ہے اور اگر متبادل موجود نہ ہو تو اسی لفظ کو استعمال کر کے اس کی تشریح کر دیتا ہے، دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اصل لفظ کو استعمال کرنے کے بعد تشریح نہیں کرتا بلکہ اپنی زبان میں اس سے قریب ترین معنوں کے لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ اس سے منشاء یہ ہوتا ہے کہ قاری اپنی زبان کے لفظ کی مدد سے کسی حد تک اصل کا ادراک کر لے۔

معنی میں مداخلت

مداخلت کا سب سے زیادہ امکان یا ظہور معنی کی سطح پر ہوتا ہے۔ معنی کی سطح پر ہونے والی مداخلت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول: جس میں لفظ اکائی ہو، دوم: جس میں لفظوں کی پوری ساخت اکائی ہو جو جملے سے لے کر مکمل متن تک وسیع ہو سکتی ہے۔

لفظ کی سطح پر معنی میں مداخلت

لفظ کو اکائی مان کر معنی میں مداخلت کی بات کریں تو ثقافتی وسماجی الفاظ کے اندر معنوی مداخلت کا بہت کچھ امکان ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس قسم کے الفاظ کے متبادل اگر دوسری زبان میں موجود ہوں تب بھی وہ مکمل طور پر اس معنی پر کلی دلالت نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر لفظ ''طلاق'' ہے انگریزی زبان میں اس کا متبادل لفظ Divorce موجود ہے۔ ترجمہ میں طلاق کو Divorce سے تبدیل کر دیا جائے تو متبادل ضرور آ گیا لیکن دونوں کی ثقافتی تشریح مختلف ہوگی۔ اسی طرح ''خیرات، علماء، حضرت، سیرت، شریعہ وغیرہ بے شمار الفاظ مل جائیں گے جن کے متبادل تو ہوں گے لیکن اس لفظ کی معنویت ادا نہیں کر سکتے۔

اصل متن میں موجود ایک لفظ کا ترجمہ کرتے ہوئے دو مترجمین ایسے الفاظ کا بھی استعمال کر دیتے ہیں جو بعید المعنی ہوتے ہیں۔ دونوں لفظ مترادف نہیں ہوتے یا بسا اوقات ان میں ایسا معنوی بعد ہوتا ہے کہ کسی طرح انطباق کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی۔ مختارات کی ایک عبارت ہی کا ترجمہ دیکھیں:

قال فجمع لی قومك فی هذه الحظیرة۔34

مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب میں اسامہ عبد الرحمان نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

''آپؐ نے فرمایا میرے لیے اپنی قوم کو اس باڑہ میں جمع کرو''۔35

اس کے علاوہ اس کے دو اور ترجمے لمعات الذهب فی شرح مختار الادب اور انوارات میں بھی "الحظیرۃ" کا ترجمہ باڑہ سے ہی کیا گیا ہے لیکن بیان المختارات میں حافظ بلال اشرف نے اس کا ترجمہ حویلی سے کیا ہے۔ ان کا ترجمہ ہے:

''تو اپنی قوم کو میرے لیے اس حویلی میں جمع کر''۔36

لغوی اعتبار سے جائزہ لیا جائے 'باڑہ' اور 'حویلی' دونوں میں کافی فرق ہے۔ فیروز اللغات میں باڑہ کے معنی احاطہ اور گھر کے دیے ہوئے جب کہ اردو لغت بورڈ کراچی کی لغت میں شاندار مکان، بڑا اور پکا مکان (بیشتر جس کے گرد چہار دیواری بھی ہوتی ہے) محل۔ اس کے معنی کو واضح کرنے کے لیے اصل کتاب میں حظیرہ پر لگائے گئے حاشیہ سے استعفادہ بہت معاون ہوگا چنانچہ حاشیے کی عبارت ہے:

"الموضع الذی یحاط علیه لتأوي الیه الماشیه فیقیها البرد و الریح"۔37

(وہ جگہ جو جانوروں کے ٹھکانے کے لیے احاطہ بند کر دی جائے جو اسے ٹھنڈی اور ہوا دار رکھتی ہے۔)

حاشیہ میں مذکور معنی کے اعتبار سے 'باڑہ' کا لفظ بالکل درست ہے۔ اگر احاطہ کا لحاظ کرتے ہوئے حویلی استعمال کیا گیا ہو کہ اس میں بھی احاطہ بندی ہوتی ہے تو بھی درست نہیں ہے کیوں کہ اردو میں اس کا محل استعمال بالکل جداگانہ ہے۔ اس طرح دونوں لفظوں میں کوئی معنوی وحدت و یکسانیت نہیں پائی جارہی ہے بلکہ یہ اصل لفظ سے مداخلت ہی ہے۔

اس کی ایک اور مثال ملاحظہ کرنے کے لیے ایک جملے کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔ اس میں ایک لفظ قالة ہے اسی کے ترجمہ پر توجہ مرکوز کرنی ہے:

"یا معشر الأنصار ما قالة بلغتنی عنکم"۔38

بیان المختارات میں اس کا ترجمہ افواہ سے کیا گیا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''اے انصار کی جماعت، کیا افواہ ہے جو مجھے تمہارے بارہ میں پہنچی ہے''۔39

مبشرات میں قالة کا متبادل ''بات'' لایا گیا ہے:

''اے انصار کی جماعت وہ کیا بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے''۔40

لمعات الذہب میں عتیق الرحمٰن سیف نے ''مشہور بات'' ترجمہ کیا ہے۔

''اے انصار! وہ کونسی مشہور بات ہے جو مجھے تمہاری طرف سے پہنچی ہے''۔ 41

اس کے ایک اور ترجمہ انوارت کو ملاحظہ فرمائیں:

''اے انصار کی جماعت! وہ کیا چہ می گوئیاں ہیں جو تمہاری طرف سے مجھ تک پہنچی ہیں''۔ 42

ان تمام ترجموں کا تجزیہ کیا جائے تو بنیادی طور پر تین الفاظ 'بات، افواہ اور چہ می گوئیاں' استعمال ہوئے ہیں۔ دو ترجموں میں بطور متبادل 'بات' لایا گیا ہے لیکن اس میں سے ایک میں صرف بات کے بجائے اسے صفت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے 'مشہور بات' ترجمہ کیا گیا ہے۔

اسی ساتھ ساتھ قـــــالۃ کے معنی پر غور کیا جانا چاہیے تاکہ بات اور واضح ہو سکے۔ صاحب لمعات الذہب نے اس کی تصریح کرتے ہوئے لکھا ہے: ''لوگوں کے درمیان پھیلی ہوئی اچھی یا بری بات''۔ اسی کے ساتھ انہوں نے کئی دیگر معانی مثلاً قیلولہ، حکم کرنا، اشارہ کرنا وغیرہ بھی ذکر کیا ہے اور بعد میں لکھا ہے کہ: ''یہ ایک کثیر المعنی لفظ ہے''۔ لفظ میں کئی معنی کا امکان ہے لیکن انطباق مشکل لگ رہا ہے۔ اس لیے کہ چہ می گوئیاں اور افواہ دونوں بات ہی ہوتی ہیں لیکن دونوں کی نوعیت اور فطرت میں بہت فرق ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ مترجمین نے ممکنہ مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے متبادل استعمال کیا ہو۔ بات جو بھی ہو یہ ایک طرح اصل متن میں موجود لفظ میں مداخلت کے ضمن میں داخل ہوگا۔

بات کو مزید واضح انداز میں سمجھنے کے لیے ایک اور مثال دیکھتے ہیں۔ کلیلہ دمنہ کا ایک جملہ پیش ہے:

اضرب لي مثلاً لمتحابين يقطع بينهما الكذوب المحتال حتىٰ
يحملهما على العداوة والبغضاء۔ 43

میرے سامنے ایسے دو دوستوں کا قصہ بیان کرو جن کے درمیان ایک چالباز مکار
پھوٹ ڈال دیتا ہے اور ان کے دلوں میں عداوت اور بغض وعناد کا بیج بو دیتا
ہے۔ 44

مذکورہ جملے کے ترجمے کا بہتر انداز میں تجزیہ کرنے کے لیے ایک اور ترجمہ کو ذکر کرنا زیادہ موزوں ہے کہ اس سے بات کو واضح کرنے میں زیادہ مدد ملے گی۔

مجھے ان دو آپس میں محبت کرنے والوں کی مثال بیان کرو جن کے درمیان دروغ گو،

مکار شخص پھوٹ ڈال دیتا ہے، انہیں آپس کی دشمنی اور کینہ وحسد پرا کساتا ہے۔45

کئی الفاظ قابل گفتگو ہیں۔ سب سے پہلا لفظ المتحابین ہے۔ پہلے ترجمے میں اس کا متبادل 'دوست' ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں 'محبت کرنے والے'۔ تحابا یتحابا کی اصل حُبّ ہے۔ اس کے معنی ہیں 'آپس میں محبت کرنا'۔ چنانچہ 'دوست' کا لفظ استعمال لازمی معنی کے طور پر تو کیا جا سکتا لیکن لغوی اور حقیقی معنی وہی ہے جو دوسرے ترجمے میں استعمال کیا گیا ہے۔ دوسرا قابل غور لفظ الکذوب ہے۔ یہ کذب سے مشتق ہے اور فعول کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، بہ معنی انتہائی جھوٹا۔ دوسرے ترجمے میں اصل کا لحاظ کرتے ہوئے 'دروغ گو' متبادل لایا گیا ہے لیکن پہلے ترجمے میں 'چالباز' ترجمہ کیا گیا ہے۔ پہلے ترجمے میں دونوں الفاظ کے اندر مداخلت سے کام لیا گیا ہے۔

لفظ کی سطح پر معنی میں مداخلت کی ایک اور مثال دیکھیں:

كالذي قيل ان رجلاً سلك مفازة فيها خوف من السباع، و كان الرجل خبيراً بوعث الأرض و خوفها. فلما سار غير بعيد اعترض له ذئب من أحد الذئاب و أضراها. فلمارأى الرجل أن الذئب قاصداً نحوه خاف منه و نظر يميناً و شمالاً، ليجد موضعاً يتحرّز فيه من الذئب.فلم يَرَالا قرية خلف واد، فذهب مسرعاً نحوالقرية. فلما أتى الوادي لم ير عليه قنطرة، ورأى الذئب قد أدركه، فألقى نفسه في الماء وهو لا يحسن السباحة.46

جیسے یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص اس جنگل میں چل پڑا جس میں اسے درندوں کا خوف تھا، وہ شخص اس راستے کی ہولناکی اور خطرے سے واقف تھا، ابھی وہ تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ اس کا ایک خطرناک شیر سے سامنا ہوا، جب اس شخص نے دیکھا کہ شیر اسی کی جانب آ رہا ہے تو اسے ڈر ہوا، اس نے دائیں بائیں نظر

کی، تا کہ اسے کوئی ایسی جگہ مل جائے جس میں (پناہ لے کر) شیر سے بچ جائے، وہاں اسے ایک وادی کے پیچھے گاؤں دکھائی پڑا، وہ اس گاؤں کی جانب تیزی سے چل پڑا، جب وہ اس وادی کے پاس آیا تو اسے اس وادی پر پل دکھائی نہ پڑا، بھیڑیا اس سے قریب تھا، اس نے اپنے آپ کو پانی میں ڈال دیا وہ اچھی طرح تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔47

مذکورہ بالا عبارت میں قابل تجزیہ لفظ الـــذئـــب ہے جس کے معنی ہیں بھیڑیا۔ مترجم نے ایک ہی پیراگراف میں اس لفظ کے دو متبادل استعمال کیے ہیں۔ ابتداً انہوں نے اس کے لیے 'شیر' لکھا پھر چند ہی جملے بعد انہوں نے اصل متبادل 'بھیڑیا' استعمال کیا ہے۔ ایک ہی لفظ کے دو متبادل استعمال کرنا اور ایک ایسا متبادل لانا جس کا اصل معنی سے حقیقی و مجازی کوئی تعلق ہی نہ ہو لفظ کی سطح پر صریح مداخلت ہے۔

وکـان قـريباً منه أجمة فيها أسد عظيم، وه ملك تلك الناحية و معــه سبــاع كثيــرة و ذئــاب و بنـات آوى وثعـالـت وفهود ونمور۔48

اس کے قریب میں ایک کچھار تھی جس میں ایک بڑا شیر تھا، وہ اس علاقہ کا بادشاہ تھا، اس کے دربار میں بہت سے درندے، بھیڑیے، گیڈر، لومڑیاں، تیندوے، اور چیتے تھے۔49

مذکورہ بالا ترجمے میں اصل عبارت میں موجود لفظ و معه کا ترجمہ 'اس کے دربار میں' کیا ہے۔ یہ ترجمہ موقع و محل کے لحاظ سے درست معلوم ہو رہا ہے؛ کیونکہ یہاں شیر کی بادشاہت کا ذکر ہو رہا ہے اس کی مناسبت سے دربار کا لفظ لایا گیا؛ لیکن اصل میں موجود لفظ کو ملحوظ نہیں رکھا گیا جو کہ مداخلت کے اندر داخل ہے۔ اس فرق کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیے اسی جملے کا ایک دوسرا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

وہیں قریب میں ایک جھاڑی تھی، جس میں ایک بہت بڑا شیر رہتا تھا، وہ وہاں کا بادشاہ تھا، اس کے ساتھ بہت سارے درندے: بھیڑیئے، گیڈر، لومڑیاں، تیندوے، اور چیتے وغیرہ تھے۔50

مابعدالذکر ترجمے میں اصل کی رعایت کرتے ہوئے و معــہ کا ترجمہ 'اس کے ساتھ' کیا گیا ہے جو کہ اصل سے بالکل مطابق ہے۔

وكـان فيـمـن مـعه من السباع ابنا آوى يقال لأحدهما (كليلة) والآخرِ (دمنة) وكانا ذوي دهاء وعلم وادب۔51

خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

اس کے درباریوں میں دو گیڈر تھے، ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا ''دمنہ'' وہ آپس میں بھائی تھے اور بڑے چالاک، ہوشیار اور علم وادب والے تھے۔52

رفیع الدین حنیف نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے:

اس کے ساتھ جو درندے رہتے تھے، ان میں دو گیڈر بھی تھے، ان میں سے ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا نام ''دمنہ'' وہ دونوں نہایت مکار، چالاک، اور ذی علم تھے۔53

یہاں اصل متن کا لفظ السبـــاع زیر گفتگو ہے۔ پہلے ترجمے میں اس کا متبادل ''درباری'' لایا گیا ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں ''درندہ''۔ درباری کا لفظ یہاں سیاق کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔ عبارت میں موجود لفظ کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ معنوی اعتبار سے یہ کھلی ہوئی مداخلت ہے۔

قطط و فیران علی احمد باکثیر کا ایک شاہکار ڈرامہ ہے جس کا ترجمہ ڈاکٹر عبید الرحمٰن طیب نے کیا ہے۔ معنی میں مداخلت کی ایک مثال اس ترجمے سے دیکھئے:

الوقت: الضحى:

يـرفـع الستـار عن رمزى جالسا في الصالة وهو يتصفح بعض الـصـحف فـى قـلـق۔ يـدخـل عــادل مـن البــاب المفتوح وهو بالبيجامة وبيده فوطة يمسح بها وجهه من أثر الماء۔54

چاشت کا وقت ہے، پردہ اٹھادیا جاتا ہے۔ رمزی استقبالیے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اضطراب کی حالت میں سامنے پڑے ہوئے اخبارات الٹ پلٹ رہا ہے۔

عادل تولیہ سے منہ پونچھتے ہوئے مرکزی دروازے سے داخل ہوتا ہے۔55؎

مذکورہ بالا ترجمے میں یوں کئی الفاظ قابل گرفت ہیں مثال کے طور پر مترجم نے بالبیجامة اور من أثر الماء کا ترجمہ نہیں کیا۔ بہرحال معنی مداخلت کے پس منظر میں مترجم نے الباب المفتوح کا ترجمہ ''مرکزی دروازہ'' کیا ہے جب کہ اس کا ترجمہ ہوگا'' کھلے ہوئے دروازے سے''۔غور کرنے کی بات ہے کہ کیا کوئی مرکزی دروازے سے تولیے سے منہ سے پانی پوچھتے ہوئے، پاجامہ پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

دو یا دو سے زائد زبانوں میں استعمال ہونے والے الفاظ میں بھی مداخلت کا امکان ہوتا ہے۔ عام طور پر قریب کی زبانوں میں ایسا ہوجاتا ہے۔ یہ الفاظ کبھی تو معمولی معنوی فرق کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں جو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے لیکن بسا اوقات الگ الگ زبانوں میں ان کے معنی بالکل مختلف ہوجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو اس میں ہدفی زبان کے معاشرتی و ثقافتی احوال و کیفیات کا تغیر یا تحریف ہوجاتی ہے۔تحریف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس لفظ کا عام معنی خاص بن جاتا ہے جیسے Rape کا انگریزی میں معنی عام ہے لیکن اردو میں اسے ''عصمت ریزی'' کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔عربی لفظ ''شراب'' جو کہ مشروب کے معنی میں عام ہے اسے اردو میں ''خمر'' کے معنی کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔کبھی لفظ کی معنوی وسعت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور لفظ کا خاص مدلول عام ہوجاتا ہے جیسے ہم ہر کسی کو Sir کے ''خطاب'' سے نواز دیتے ہیں۔کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لفظ جس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا اس کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔جیسے ''تکلیف''،جس کا اصل معنی ہے مکلّف ہونا، ہمارے یہاں ''تنگی اور مشکل'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔''رقت'' کے معنی نرمی کے ہیں لیکن وہ ''رونے اور نوحہ کرنے'' کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔کبھی لفظ کے حقیقی مدلول اور اس مدلول جس میں لفظ منتقل ہوا ہے مشابہت ہونے کی وجہ سے معنوی تبدیلی واقع ہوجاتی جیسے ''عورت'' عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں چھپانے کے لیکن اردو میں خاتون کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قریبی زبانوں میں جب ترجمہ کا انجام دیا جاتا ہے تو اس قسم کی صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے۔ چوں کہ مترجم کے ذہن میں وہ معنی جاگزیں ہوتے ہیں جو اس کی اپنی زبان میں مستعمل ہوتے ہیں؛ لہذا جب

وہ لفظ دوسری زبان میں آتا ہے تو اس کا ذہن فوراً اسی معنی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور معنوی فرق بسا اوقات اس سے اوجھل رہ جاتا ہے، وہ اس لفظ کا ترجمہ اسی معنوں میں کر دیتا ہے جو اس کی اپنی زبان میں رائج ہیں۔ جیسے کہ لفظ شراب عربی میں ہر قسم کے مشروبات کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن اردو میں خمر کے لیے مستعمل ہوتا ہے ایسی صورت میں اگر کسی عربی متن میں ایک شخص ہوٹل جا کر کہتا ہے کہ ''انی ارید الشراب البارد ''مترجم اس جملہ کی باریکی کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے اس کا ترجمہ کر دے گا کہ ''مجھے ٹھنڈی شراب چاہیے''؛ جب کہ اصل معنی ہے ''ٹھنڈا مشروب چاہیے''۔اس کی خوبصورت مثال لفظ ''شعر'' ہے۔عربی میں شعر بمعنی شاعری بھی استعمال ہوتا ہے جب کہ اردو میں ایسا نہیں ہوتا۔چناں چہ ایک جملہ ہے ''أثـر اللـغة العـربية فـي الشـعـر الأردي ''اگر مترجم زیرکی کا ثبوت نہ دے تو اس کا ترجمہ کر دے گا ''اردو شعر میں عربی زبان کا اثر'' حالاں کہ یہاں شعر کے بجائے شاعری مراد ہے اس لیے صحیح ترجمہ ہوگا ''اردو شاعری پر عربی زبان کا اثر''۔یہی صورت حال تمام قریب کی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔دو قریبی زبانوں میں ترجمہ کرنے والے مترجم کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہ روا روی میں ترجمہ کر جاتا ہے جس کی وجہ سے معنی میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔یا مفہوم میں قدرے اشتباہ کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر عربی کا ایک لفظ ہے 'شعار' جو کہ اردو میں بھی مستعمل ہے۔اہل اردو اسے طور طریقہ اور چلن کے معنی میں استعمال کرتے ہیں؛ جب کہ عربی میں اس کا معنی ہے 'بدن سے لگا ہوا کپڑا' اور 'ممتاز کرنے والی علامت'۔امتیازی نشان کا معنی اردو میں بھی مستعمل ہے؛ لیکن پہلا معنی یعنی بدن سے لگا ہوا کپڑا صرف لغت تک ہی محدود ہے لوگوں میں غیر معروف ہے۔اب اگر ترجمے میں بعینہ یہی لفظ استعمال کیا جائے تو اخذ مفہوم ذرا مشکل ہو سکتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

"الأنصار شعار والناس دثار"۔56

لمعات الذہب میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''انصار تو شعار ہیں (یعنی مجھ سے ان کا اتصال بہت ہی قوی اور مستحکم ہے) اور
دیگر لوگ دثار ہیں (یعنی ان کا اتصال مجھ سے اتنا مستحکم نہیں ہے)''۔57

مترجم نے اصل متن میں موجود لفظ کو ہو بہو ترجمے میں استعمال کرتے ہوئے پھر قوسین میں اس کی تشریح کر دی ہے۔ اگر عام اردوں داں کی نظر سے ترجمے کا مطالعہ کیا جائے تو شعار کے معنی اور مذکورہ تشریح کے اندر ابہام پیدا ہو گا کیوں کہ دونوں میں کوئی مطابقت نظر نہی آ رہی ہے۔ مفہوم اسی وقت واضح ہو گا جب قاری کو شعار کا اصل عربی معنی ''بدن سے لگا ہوا کپڑا'' معلوم ہو جائے۔ یہ دشواری ایک ہی لفظ کے دو الگ الگ زبانوں میں الگ الگ معنی میں مستعمل ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ مترجم نے اردو میں شعار کے معنی کی طرف توجہ کیے بغیر لفظ استعمال کر لیا اور اپنے فہم کے اعتبار سے اس کی تشریح کر دی۔ اس بات کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی کہ لفظ کا معنی ذکر کر کے تشریح کی جائے تا کہ قاری اس تک آسانی سے پہنچ جائے۔ اگر تشریح سے لفظ شعار کا معنی متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو شعار کا معنی 'مستحکم تعلق' وغیرہ نکلتا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔ لفظ کی نزاکت سے عدم توجہی معنی میں مداخلت کا سبب بنتی ہے۔ اس میں مترجم کا کوئی دانستہ قصور نہیں ہوتا لیکن ترجمہ شدہ متن ہدفی قاری کے لیے لائق ابہام ہو جاتا ہے۔

ایک ہی لفظ کے دو الگ الگ زبانوں میں مختلف المعنی ہونے کی صورت مترجم سے جو سہو سرزد ہو جاتا ہے اس کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں۔

جليله: هيهات ماوعدكم الاغروراً۔58

پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

جلیلہ: چھوڑو۔۔۔نرا جھوٹ۔۔۔یہ وعدہ نہیں بلکہ تمہارا غرور ہے۔59

مترجم نے عربی لفظ غروراً کا ترجمہ کرنے کے بجائے بعینہ اسی لفظ کو استعمال کر لیا ہے۔ یہ لفظ دونوں زبان میں مستعمل ضرور ہے لیکن دونوں میں معنوی اعتبار سے بون بعید ہے۔ اردو زبان میں اس کا معنی ہے:

''گھمنڈ، ناز، اکڑ، فخر''۔60

لفظ غرور عربی الاصل ہے اور باب نَصَرَ یَنصُرُ سے مصدر ہے۔ عربی میں اس کے معنی ہیں:

''دھوکا دینا اور بیہودہ امید دلانا''۔61

قرآن کریم میں یہ لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے اور عربی کے مذکورہ معنوں میں ہی استعمال ہوا

ہے۔قرآن کی آیت ہے:

"وماالحياة الدنيا الا متاع الغرور"۔62

فتح محمد جالندھری نے سورہ بقرہ میں اس کا ترجمہ کیا ہے:

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے''۔

سورہ حدید میں اس طرح ترجمہ کیا ہے:

''اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب ہے''۔

سورہ فاطر کی ایک آیت ملاحظہ فرمائیں جس میں مصدر غرور کے ساتھ اس سے بنے والے دوسرے صیغے بھی آئے ہیں:

"یـاأیهـا الـنـاس انّ وعد الله حقٌ فلا تغرّنّكم الحياة الدنيا و لا يغرّنّكم بالله الغرور"۔63

اس آیت کا ترجمہ ہے:

''لوگو خدا کا وعدہ سچا ہے۔تو تم کو دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ (شیطان) فریب دینے والا تمہیں فریب دے''۔

آیات قرآنی کے تراجم کی روشنی میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ اس لفظ کا وہ معنی ومفہوم ہے ہی نہیں جو اردو میں پایا جاتا ہے اور دونوں زبانوں میں مروج معنوں میں کافی فرق ہے۔قوی امکان یہی ہے کہ مترجم کو مانوس لفظ نظر آیا اور انہوں نے اسی لفظ کو ترجمہ میں رکھ دیا جس سے معنی میں شدید اشتباہ کی راہ درآئی اور معنی میں مداخلت عمل میں آگئی۔

لفظی سطح پر معنوی تبدیلی کا ایک مقام وہ بھی ہے جس کا تعلق قواعد سے ہے۔مختلف زبانوں میں افعال وضمائر کی معنوی سطح مختلف ہوتی ہے۔مثلاً انگریزی ضمیر You واحد وجمع، مذکر ومونث حاضر کے لیے استعمال ہوتی ہے، عربی میں اس کا متبادل "أنـتَ"، "أنـتِ"، أنتمـا، (تم دو مرد/دو عورتیں) "أنـتُـمْ" (تم مرد)، "أنتـــنَّ" (تم خواتین)۔فارسی میں ''تو'' (واحد مذکر ومونث)، ''شما'' (جمع مذکر ومونث) ہے۔اردو میں

صورت حال ذرا پیچیدہ ہے، بایں طور پر اس کے تین متبادل ہیں ''تو، تم، آپ'' اس میں ''تو'' تو مختص ہے واحد مذکر و مونث کے لیے لیکن ''تم اور آپ'' دونوں واحد کے لیے بھی ہیں اور جمع کے لیے بھی، مذکر کے لیے بھی ہیں اور مونث کے لیے بھی۔ عربی میں ایک شوشہ تثنیہ کا بھی ہے جس کا بدل بقیہ تینوں زبانوں میں نہیں ہے۔ اس فرق کو ایک مثال کے ساتھ زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔ انگریزی کا جملہ ہے Are you student اس کا عربی متبادل ہوسکتا ہے "هل انتَ / انتِ، انتما / انتما، انتم / انتن، طالب / طالبة، طالبان / طالبتان، طالبون / طالبات"۔ اردو متبادل ہوگا'' کیا تو / تم / آپ طالب علم ہے / ہو / ہیں''۔ اس طرح کی مشکل کو سیاق وسباق سے حل کیا جا تا ہے۔ عربی میں تو یہ معاملہ کسی قدر حل ہو جائے گا کہ وہاں جنس اور واحد جمع کا تعین ہے۔ پریشانی اردو کے ساتھ لاحق ہوگی کہ یہاں نہ جنس کی تعیین ہے نہ واحد و جمع کی۔ ایک ہی فرد تو بھی ہے تم بھی اور آپ بھی۔ ہم اپنے معروف افراد کے لیے تو یہ تمیز کر لیتے ہیں لیکن غیر معروف افراد مثلاً انگریزی ناموں کے ساتھ اس کا لحاظ ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے جب کہ محترم تو وہ بھی اتنے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے سیاق کے ساتھ بھی مداخلت کا امکان ہوتا ہے۔

اس فرق کو سمجھنے کے لیے مختارات کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

قال فجمع لی قومك فی هذه الحظیرة۔64

اس کے کل چار ترجمے مجھے دستیاب ہوئے۔ مبشرات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''اپنی قوم کو میرے لیے اس باڑہ میں جمع کرو۔''65

بالکل یہی ترجمہ لمعات الذہب میں بھی کیا گیا ہے صرف 'میرے لیے' کے بجائے 'میرے پاس' ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جو دو تراجم ہیں ان کا مطالعہ اہم ہے۔ بیان المختارات میں اس کا ترجمہ ہے:

''تو اپنی قوم کو میرے لیے اس حویلی میں جمع کر''۔66

جب کہ صاحب انوارت نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

''تم میرے لیے اس باڑے میں اپنی قوم کو جمع کرو''۔67

پہلے دونوں ترجموں میں لفظ 'فَجَمَعَ' میں واحد مذکر کی ضمیر مستتر کو ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے صرف آخری

لفظ 'کرو' سے امر کا معنی پیدا ہو رہا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ترجمے میں مداخلت ہے کہ اصل میں موجود ضمیر کو حذف کر دیا گیا۔ بعد کے دونوں ترجموں کو دیکھا جائے تو خالد محمود نے 'تم جمع کرو' ترجمہ کیا ہے جب کہ حافظ بلال اشرف نے 'تو جمع کر' ترجمہ کیا ہے۔ ایک ہی شخص کے لیے دو الگ الگ ترجموں میں تو اور تم کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ 'تُو' واحد کی ضمیر ہے اس میں اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن تم میں جمع کا بھی شائبہ ہوسکتا ہے۔ صرف اس جملے کو دیکھا جائے تو شائبہ ہونے کا امکان ہے؛ کیونکہ سیاق اس امکان کو مسترد کر رہا ہے۔ 'تو جمع کر' لفظ کے عین مطابق ترجمہ ہے لیکن شخصیت کا احترام اس سے مانع ہوجاتا ہے اس لیے 'تم جمع کرو' استعمال کیا گیا ہوگا۔

نوٹ: اس سلسلہ کی مزید بحث قواعد کی سطح پر مداخلت کے ذیل میں کی جائے گی۔

جملے کی سطح پر معنی میں مداخلت

معنی میں مداخلت کی دوسری سطح وہ ہے جس میں لفظ اکائی نہیں ہوتا بلکہ الفاظ کا مجموعہ جو دوسرے کئی لسانی عناصر کے ساتھ مل کر مرکب مفید کی شکل اختیار کرتا ہے جسے عرف عام میں جملہ اور فقرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مداخلت کا سلسلہ جملہ سے شروع ہوتا ہے اور پورے پیراگراف، فصل، باب سے لے کر پورے متن اور پوری کتاب تک چلا جاتا ہے۔ گویا اس مداخلت کا تجزیہ جملہ سے لے کر مکمل تحریر تک ہوسکتا ہے۔

اس گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: قابل منتقلی متن، نا قابل منتقلی متن۔ گفتگو کا آغاز دوسری قسم یعنی نا قابل منتقلی متن سے ہوگا۔

نا قابل منتقلی متن

متون مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض متون سادہ آسان ہوتے ہیں اور بعض گنجلک اور پیچیدہ ہوتے ہیں۔ پیچیدگی سے مراد یہ ہے کہ ان متون میں سماجی، ثقافتی اور معاشرتی عناصر کی کثرت ہوتی ہے جو کہ ہر زبان اور علاقے میں مختلف اور متفرق ہوتے ہیں۔ اس قسم سے صفات سے متصف متون کا کلی ترجمہ تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ مترجم کے پاس ایسی کوئی صورت نہیں ہوتی کہ وہ ایسی عبارتوں کو ہدفی زبان میں ہو بہو منتقل کردے۔ اس مشکل کا سامنا داستانوں، ڈراموں، ناولوں، شاعری اور قانونی تراجم میں زیادہ ہوتا ہے۔

فرض کریں کہ پریم چند کا کوئی افسانہ ہے جس میں دیہات میں رہنے والے کسی فرد کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ایسی کہانی میں دیہات کی پوری معاشرتی زندگی کی جھلک قدم قدم پر نظر آئے گی۔اس میں گائے ،بیل ، بھینس، چھونپڑی، پھوس کے مکانات، کھیتوں میں کام کرتی عورتیں، چولہے میں لکڑی کے ایندھن پر کھانا پک رہا ہوگا، چوپال، چوپال پر حقہ، چارپائی، دھول مٹی، کچے راستے، روشنی کے لیے دئے، گاؤں کا زمیندار، مکھیا، بیل گاڑی، کمہار، لوہار، سونار، بھٹیارا، ٹھٹھیرا، لکڑہارا، سائیں، فقیر، جوگی، سادھو، پنڈت ہوں گے۔ میلے ٹھیلے، مخصوص رسم و رواج، مختلف مراتب ہوں گے۔ان کے درمیان بات چیت کا مخصوص لہجہ ہوگا۔اس کے علاوہ بہت کچھ عناصر ہوں گے جو کہانی کے ساتھ منظر و پس منظر میں نظر آئیں گے۔ظاہر ہے کہ گاؤں کی یہ کیفیت کسی حد تک برصغیر میں تو مل سکتی ہے لیکن کیا بقیہ دنیا کے دیہات بھی اسی نوعیت کے ملے گے؟ اب ان سب کا ترجمہ ظاہر ہے کہ آسان نہیں ہوگا۔

یہی کیفیت ہمیں ثقافتی تحریروں میں دیکھنے کو ملے گی۔مثال کے طور پر اسلامی سماجی وثقافتی پس منظر کے ساتھ اردو زبان میں لکھی جانے والی ادبی تحریروں میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ، صدقہ، خیرات، توحید، عید، بقر عید، شب برات، محرم، تعزیہ، چہلم، سوئم، تیرہویں، جلسہ، جلوس، مسجد، عیدگاہ، جائے نماز، تسبیح، رومال، صافہ، عقال، کرتا پاجامہ، ٹوپی، جبہ، نقاب، شلوار، قمیص، مخصوص کھانے، کھانے کا مخصوص اسلامی طریقہ، نشست و برخاست، ادب آداب، رشتے، اعزاء واقرباء، ان کے ساتھ تعلقات کی مخصوص نوعیت، اخوت، ایثار، عالم، مفتی، مدرسہ، طلبا، محفل، میلاد، مجالس، مشاعرہ، ادبی نشستیں، ولیمہ، عقیقہ، ختنہ، بلوغہ، پنیا (دوکان و مکان کے آغاز پر کی جانے والی دعوت)، چھلہ، چھٹی، منگنی، نکاح، منھ دکھائی، جوتا چھپائی، بارات، سہرہ، تجہیز، تکفین، تدفین، دعاخوانی، قرآن خوانی، مالیدہ، نیاز، فاتحہ، زیارت قبر وغیرہ وغیرہ مختلف عناصر کے موجود ہونے کا امکان ہے۔ یہ تمام صفات وعناصر اردو کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی نہیں ملیں گے چہ جائے کہ دوسرے خطوں اور زبانوں میں۔

قانونی ترجمہ میں بھی اس مشکل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے کیوں کہ دنیا کے اندر مختلف طرز ہائے حکومت روبہ عمل ہیں۔ ہر طرز حکومت میں قانون سازی کے اصول وضوابط مختلف ہوتے ہیں۔ نیز ہر ملک اور ہر قوم میں

قوانین مختلف ہوسکتے ہیں جو وہاں کی ضرورت کے مطابق وضع کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی قوانین میں حد، قصاص، تعزیر، نکاح، طلاق، عدت، نفقہ، حق میراث، متبنّٰی، سزائے ارتداد، زکوۃ، عشر، خراج، جزیہ، نظام حکومت، مجلس شوری، خلافت اور اس کے متعلق قوانین ہوں گے۔ اسی طرح جمہوری نظام میں یہ تمام چیزیں مختلف ہوں گی۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ قانون اسی وقت بنتا ہے جب ضرورت ہوتی ہے جب قانون کی ضرورت ہی نہیں ہوگی تو قانون ہی نہیں ہوگا جیسے ہمارے یہاں جہیز ایکٹ ہے، اب جہاں جہیز کا تصور ہی نہ ہو تو وہاں یہ قانون ہی نہیں ہوگا۔

مذکورہ گفتگو کے اندر جو کچھ باتیں پیش کی گئیں اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہت سی تحریریں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا ترجمہ دوسری زبان میں بہت مشکل بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ مکمل ترجمہ ناممکن ہوتا ہے۔ اس مشکل سے نمٹنے کے لیے مترجم جو بھی راستہ اختیار کرے گا وہ مداخلت سے ہوکر ہی گزرے گا۔ مترجم کو بہر حال ترمیم، تغیر وتبدل، حذف واضافہ، تشریح وتوضیح کرنی ہی پڑے گی۔

اس نوعیت کی ایک کوشش ڈاکٹر فیضان بیگ نے بھی کی ہے۔ انہوں نے نجیب محفوظ کے ناول 'القاہرہ الجدیدہ' کا ترجمہ آئین نو کے عنوان سے کیا ہے۔ ترجمے کے دوران انہوں نے ترجمے میں ہندوستانی رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس کا اقرار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک مشکل یہ تھی کہ نجیب کے ناولوں میں آفاقیت کے باوجود مقامی مصری بلکہ قاہرہ کے ماحول کی جوائنٹ اور گہری چھاپ ہے اس کی وجہ سے برصغیر کے سماجی ماحول سے اس کا تبادلہ ممکن نہیں تھا، لیکن پھر بھی کہیں کہیں کہاوتوں اور گیت کے ٹکڑوں میں میں نے ہندوستانیت کو پرونے کی کوشش کی ہے''۔68

تمام فن پاروں خصوصاً ادبی متن میں ثقافتی اور مقامی رنگ اتنا گہرا ہوتا ہے کہ اس پر دوسرا رنگ چڑھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔ نیز دوسرا رنگ رنگنے کے لیے پہلے رنگ کو ہٹانا ومٹانا بھی پڑ جاتا ہے جو اصل متن میں مداخلت کا عمل ہے۔

قابل منتقلی متن

یہ الفاظ سے بڑی سطح پر مداخلت کی دوسری قسم ہے۔اوپر جو توضیح کی گئی ہے اس میں متن ثقافتی اور سماجی گہرائیوں میں ڈوبا ہونے کے باعث کلی ترجمہ کے قابل ہی نہیں تھا اس لیے مترجم کو اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے مداخلت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔قابل منتقلی متن کا مطلب یہ ہے کہ یہ متن مشکل یا پیچیدہ نہیں ہے، نہ اس متن میں انتہائی دقیق نقاط بیان کئے گئے ہیں؛ بلکہ یہ متن آسان ہے، اس کا مفہوم دوسری زبان میں بہ آسانی بیان کیا جا سکتا ہے اس کے باوجود ترجمہ میں مداخلت ہوتی ہے۔مختارات کے ایک جملے کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"فأين أنت من ذلك يا سعد"۔69

بیان المختارات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''آپ ﷺ نے فرمایا: اے سعد! تو اس معاملے سے کہاں ہے؟''۔70

مبشرات فی حل مختارات میں ابو اسامہ عبدالرحمٰن نے اس کا ترجمہ اس انداز سے کیا ہے:

''تو آپ ؐ نے فرمایا اس بارے میں تیرا حال اور خیال کہاں ہے''۔71

یہ دونوں ترجمے معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پہلے ترجمے کا جملہ ذرا سا مبہم ہے سیاق کی مدد سے سمجھا جا رہا ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں بات کو واضح کر کے بیان کیا گیا ہے۔ دو اور ترجمے ملاحظہ فرمائیں جس سے معلوم ہوگا کہ متن سے کس قدر ہٹ کر ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔انوارات میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے:

''آپ ؐ نے فرمایا! اے سعد! تم اس کو لینے کے لیے کہاں تھے''۔72

اس ترجمے میں عبارت سے سے بالکل قطع نظر مترجم نے تشریحی مفہوم بیان کر دیا ہے۔ بیان مفہوم کے لیے سابقہ جملے کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں یہ کہا جا رہا ہے کہ مال فے فلاں کو ملا اور فلاں کو نہیں ملا۔ایک اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جس میں ایک اور ہی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔لمعات الذہب میں اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

''آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اے سعد! کیا تم بھی ان میں سے ہو''۔73

اس ترجمے اوراصل عبارت کوسامنے رکھ کرموازنہ کریں تو دونوں میں کوئی بھی ربط ہی نظرنہیں آرہاہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مترجم نے اس سوال کے جواب میں جو جملہ کہا گیا ہے ''میں اپنی قوم میں سے ہوں'' کی رعایت کرتے ہوئے اس سوال کوخود ہی معنی عطا کر دیے ہیں اوراصل عبارت ملحوظ رکھنے کی چنداں کوشش نہیں کی۔

ان چاروں ترجموں کے تجزیے میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ تمام ترجمے کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔تقریبا ہر ترجمے میں اصل عبارت کے بجائے اس کے ممکنہ تشریحی مفہوم کونقل کیا گیا ہے۔ پہلا اور دوسرا ترجمہ قدرے قریب تر ہے بالخصوص دوسرا ترجمہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اصل عبارت کے قریب تر ہے لیکن اس میں بھی خیال کے ساتھ لفظ ''حال'' جوڑ دیا گیا ہے جو کہ اضافہ ہے۔دوسری طرف دیکھا جائے تو ترجمے میں لفظ کی اس قدر پابندی کی کوشش کی گئی ہے کہ اردوزبان کے مزاج کونظرانداز کرتے ہوئے اصل لفظ'' فأين '' کی اتباع میں تیرا حال اور خیال کیا ہے کے بجائے'' کہاں ہے'' ترجمہ کیا گیا ہے۔سبھی ترجموں میں اصل سے تھوڑا بہت اختلاف موجود ہے لیکن آخر کے دوترجمے جملے کی سطح پر معنی میں مداخلت کی واضح مثال ہیں۔

بعض ترجموں کے تقابلی مطالعے سے یہ صورت حال بھی سامنے آتی ہے کہ ایک جملے کا ترجمہ دو مترجمیں بالکل متضاد انداز میں کر دیتے ہیں جو مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں۔اس کی ایک مثال دیکھیں:

> كمحبس الماء الذي لاتزال المياه تنصب فيه، فان لم يكن له مخرج و مفيض و متنفس يخرج الماء منه بقدر ما ينبغي خرب وسال، ونزّ من نواح كثيرة، وربما انثق البثق العظيم، فذهب الماء ضياعاً۔[74]

مذکورہ بالا جملہ کلیلہ و دمنہ سے نقل کیا گیا ہے۔کلیلہ و دمنہ کے دوترجمے دستیاب ہیں۔ دونوں ترجمے یکے بعد دیگرے نقل کیے جاتے ہیں۔خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

> جیسے پانی کو اگر کسی چیز میں جمع کر دیا جائے اور پانی برابر اس میں گرتا رہے،مگر اس کے اندر پانی نکلنے کا کوئی مناسب راستہ نہ ہوتو ظاہر ہے پانی اس میں سڑ جائے گا،

> اور ادھر ادھر سے یونہی بہے گا یا ہو سکتا ہے کہ جس چیز میں جمع کیا گیا ہے وہ پھٹ جائے اور سارا کا سارا پانی ضائع ہو جائے۔75ؔ

رفیع الدین حنیف نے کلیلہ و دمنہ ہی کے نام سے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ جملہ کا یوں ترجمہ کیا ہے:

> اس پانی کے ذخیرہ کی طرح جس سے پانی مسلسل رس رہا ہو، اگر اس کے لیے نالی اور راستہ نہ ہو اور کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اس سے مناسب مقدار میں پانی نکالے تو وہ پانی برباد ہو جائے گا، اور بہہ جائے گا اور بہت سی جگہوں سے رسنا شروع ہو جائیگا، ہو سکتا اس میں بڑا سوراغ ہو جائے اور سارا پانی ضائع ہو جائے۔76ؔ

کلیلہ و دمنہ کی مذکورہ بالا عبارت کے دونوں ترجموں میں معنوی مداخلت سے کام لیا گیا ہے۔ پہلے جملے کے آخری جز لا تزال المیاہ تنصب فیہ کا ترجمہ خورشید ندوی نے ''پانی برابر اس میں گرتا رہے'' کیا ہے جب کہ رفیع الدین حنیف نے ''جس سے پانی مسلسل رس رہا ہو''۔ دونوں ترجمے معنوی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ پہلے ترجمے کا مفہوم یہ ہے کہ ذخیرہ میں پانی آ رہا ہے جب کہ دوسرے ترجمے سے معلوم ہو رہا ہے کہ ذخیرے سے پانی نکل رہا ہے۔ اصل متن سے موازنہ کریں تو خورشید ندوی کا ترجمہ متن سے قریب ہے۔

مذکورہ عبارت کا دوسرا جملہ بھی معنوی مداخلت کی ایک مثال ہے۔ فان لم یکن لہ مخرج و مفیض و متنفس یخرج الماء منہ بقدر ما ینبغي خرب وسال، اس جملے کا ترجمہ رفیع الدین حنیف نے ''اگر اس کے لیے نالی اور راستہ نہ ہو اور کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اس سے مناسب مقدار میں پانی نکالے تو وہ پانی برباد ہو جائے گا، اور بہہ جائے گا'' کیا ہے جو کہ متن سے ہم آہنگ ہے۔ اصل عبارت کے اکثر الفاظ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ترجمہ کیا گیا ہے؛ جب کہ اس کے مقابلے میں خورشید ندوی نے اس کا ترجمہ ''مگر اس کے اندر پانی نکلنے کا کوئی مناسب راستہ نہ ہو تو ظاہر ہے پانی اس میں سڑ جائے گا'' کیا ہے۔ اس ترجمے میں مفہوم کو ادا کر دیا گیا ہے؛ لیکن اصل عبارت کے الفاظ کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

معنی کے اندر مداخلت میں مترجم کا مقصد، اس کا وقوفی ماحول اور ڈسکورس بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر ایک ہی متن کا ترجمہ مختلف نقطۂ نظر کے حامل افراد کریں تو ان کے ترجموں میں معنوی فرق آنا لازم ہے؛ کیوں کہ ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کا اپنا مقصد بھی کام کرتا ہے۔ اگر ایک مترجم متن کے اندر بیان کردہ مضمون سے موافقت رکھتا ہے یا اس کا حامی ہے تو اس کے ترجمہ میں حمایت کا عکس نظر آئے گا اس نظریہ کے ثبوت کے جو دلائل ہوں گے ان کو بہت زور دے کر بیان کیا جائے گا۔ اور اگر مترجم اس نظریہ کا مخالف ہے تو اس کے ترجمہ میں اس کی بھی جھلک نظر آئے گی۔ اس طرح کے ترجموں میں معنوی فرق بہت واضح نظر آئے گا لیکن اس طرح کا اسلوب، طرز بیان، الفاظ کا انتخاب، الفاظ کی ترتیب، جملوں کی بندش اس طرح کی جائے گی کہ کلی مفہوم تبدیل ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک جملہ ہے "I condemn this incident" یہ جملہ جس فرد کی زبان سے ادا ہو رہا ہے مترجم اس کا حامی ہے تو وہ ترجمہ کرے گا ''میں اس واقعہ کی شدید مذمت کرتا ہوں''، اگر حامی نہ ہو بلکہ مخالف ہو تو ترجمہ کرے گا ''مجھے اس واقعہ سے تکلیف ہوئی ہے''۔

صحافتی تراجم میں اس طرح کی مداخلت بہت ہوتی ہے۔ ہر اخبار، رسالہ اور میگزین کا اپنا مخصوص نقطۂ نظر اور پالیسی ہوتی ہے۔ ہر کسی کا کسی مخصوص طبقہ، جماعت، فرقہ، مذہب اور پارٹی کے ساتھ لگاؤ و تعلق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اخبار کانگریس نواز ہے اور دوسرا بی جے پی نواز تو دونوں اخبار میں ایک ہی خبر الگ الگ انداز سے شائع ہوگی۔

مستشرقین اور غیر مسلموں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف بہت کچھ زہر افشانی کی ہے۔ ان کی تحریروں میں ایسی باتیں اور الفاظ ہوتے ہیں کہ کوئی بھی مسلمان ان کا ہو بہو ترجمہ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ اس کی ایمانی حمیت و غیرت اسے ایسا کرنے ہی نہیں دے گی۔ اگر مترجم کا مقصد محض امر واقعہ سے واقف کرانا ہو تب بھی بہت کچھ تبدیلی کرتے ہوئے متن کو قابل قرات اور قابل قبول بنا کر پیش کرے گا۔

حذف

مداخلت کی ایک قسم حذف ہے۔ اصل متن میں موجود کسی لفظ یا جملے کو مترجم دانستہ یا نادانستہ طور پر حذف کر دیتا ہے۔ یہ حذف کبھی کبھی اخذ مفہوم کی راہ میں دشواری بھی پیدا کرتا ہے اور مفہوم کی ترسیل میں

رکاوٹ محسوس ہوتی ہے اور کبھی اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا نہ مفہوم کے سمجھنے میں نہ الفاظ کی بندش و سلاست میں۔ مداخلت کی یہ صورت کئی وجوہات سے پیش آسکتی ہے۔ مترجم کسی لفظ یا جملے کو غیر اہم ہونے کی وجہ نظر انداز کر دیتا ہے، کبھی اختصار اور سادگئ اظہار بیان کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کبھی مترجم دانستہ طور پر کسی لفظ کو ذکر نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ اس کے مفہوم کو وہ کسی مخصوص نظریے، ڈسکورس یا عقیدے کا حامل ہونے کی وجہ سے منتقل نہیں کرنا چاہتا اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مترجم مفہوم تک رسائی حاصل نہیں کر پاتا۔ لفظ یا جملے میں حذف متن میں مداخلت کے ذیل میں داخل ہے۔

ثـم ان بـنـي الشيخ اتّعظوا بقول أبيهم، وأخذوا به، و علموا أن فيه الخير، و عوّلوا عليه۔77

مذکورہ بالا عبارت میں کل چار جملے ہیں۔ آیئے اس کے دو ترجمے ملاحظہ کریں اور پھر ان کا جائزہ لیں:

بوڑھے کے لڑکوں نے باپ کی گفتگو سے نصیحت حاصل کی، اسے اچھی طرح پلے باندھ لیا، اور یہ جان لیا کہ اسی میں بھلائی ہے اور اس پر اعتماد کر لیا۔78

دوسرا ترجمہ ملاحظہ کریں:

چنانچہ بوڑھے کے بیٹوں نے اپنے باپ کی نصیحت کو قبول کیا اور ان کو احساس ہو گیا کہ یقیناً ان کے لیے اسی میں بھلائی ہے۔79

جس طرح اصل متن میں چار جملے ہیں اسی طرح پہلے ترجمے میں اس کی مکمل رعایت کرتے ہوئے چار جملوں میں ترجمہ کیا گیا ہے؛ جب کہ دوسرے ترجمے میں صورت حال مختلف ہے۔ اس میں دو جملوں کے مفہوم کو ایک جملے میں بیان کر دیا گیا اور دو جملوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اصل متن	پہلا ترجمہ	دوسرا ترجمہ
ثم ان بني الشيخ اتّعظوا بقول أبيهم	بوڑھے کے لڑکوں نے باپ کی گفتگو سے نصیحت حاصل کی	چنانچہ بوڑھے کے بیٹوں نے اپنے باپ کی نصیحت کو قبول کیا
و أخذوا به	اسے اچھی طرح پلے باندھ لیا	
و علموا أن فيه الخير	اور یہ جان لیا کہ اسی میں بھلائی ہے	اور ان کو احساس ہو گیا کہ یقیناً ان کے لیے اسی میں بھلائی ہے
و عوّلوا عليه	اور اس پر اعتماد کر لیا	

جدول میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح مترجم نے دوسرے اور چوتھے جملے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا ترجمہ نہیں کیا۔

قواعد میں مداخلت

جب ہم آپس میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کی سب سے چھوٹی اکائی جملہ ہوتی ہے۔اسی سے ایک شخص دوسرے کی بات سمجھتا ہے۔ جملہ لفظوں سے بنتا ہے اور لفظ کا صحیح مفہوم اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ جملے میں آتا ہے۔ ورنہ یوں ایک لفظ کئی معنوں میں آسکتا ہے۔اس لیے قواعد نویسوں نے آسانی کے خیال سے جملے کے ٹکڑے کر لیے ہیں۔ پہلے ان ٹکڑوں یعنی لفظوں سے بحث کرتے ہیں اور اسکے بعد جملوں سے۔اس لیے اب اس کے دو حصے ہو گئے ہیں۔

پہلے حصے میں الفاظ سے بحث ہوتی ہے یعنی ان کی تقسیم اور ایک دوسرے کے ساتھ آنے سے ان میں جو تغیر و تبدل ہوتا ہے یا ان میں اضافے سے جو نئی صورت پیدا ہوتی ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے، اسے صرف کہتے ہیں۔

دوسرے حصے میں جملے میں لفظوں کے ایک دوسرے سے اور جملوں کے باہمی تعلق سے بحث ہوتی ہے، اسے ''نحو'' کہتے ہیں۔

مونا بیکر نے قواعد کو مارفولوجی اور نحو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مارفولوجی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> Morphology covers the structure of words, the way in which the forrm of a word change to indicate specific contrasts in th trammatical system. 80
>
> (مارفولوجی کے تحت الفاظ کی ساخت، یعنی قواعدی نظام میں مخصوص تضادات کو ظاہر کرنے کے لیے صورت الفاظ کی تبدیلیوں کا طریقہ)

آگے نحو کی تعریف کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> Syntax covers the grammatical structure of groups, caluses, and sentences, the linear

sequences of classes of words such as noun, verb, adverb, and adjective, and functional elements such as subject, predicater, and object...[81]

(نحو میں فقروں اور جملوں ،لفظوں کے جملوں کا خطی تسلسل مثلاً اسم ،فعل ،ضمیر، صفت اور تفاعلی عناصر جیسے مبتدا (فاعل)،خبر ،مفعول ۔۔)

قواعد کے بے شمار اجزا ہیں؛ لیکن یہاں ان اجزاء سے بحث کی جائے گی جن سے تراجم میں سابقہ پڑتا ہے۔

عدد اور مداخلت

عدد کی تعریف مولوی عبدالحق نے ان الفاظ میں کی ہے:

''اسم یا تو ایک ہوگا یا ایک سے زیادہ۔اسی کو تعداد کہتے ہیں۔''[82]

تمام زبانوں میں تعداد کا تصور تو پایا جاتا ہے لیکن تمام زبانوں میں اس کا وجود و کیفیت یکساں نہیں ہے اور نہ ہی تمام زبانوں میں تعداد کی صورت حال ایک سی ہے۔جاپانی ،چینی اور پرتگیز وغیرہ چند زبانیں ایسی ہیں جن میں تعداد کو لغوی طور پر ظاہر کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے؛ بلکہ زیادہ تر تعداد ظاہر ہی نہیں کی جاتی۔ان زبانوں میں اسم کی شکل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ یہ واحد ہے یا جمع۔مثال کے طور پر My book اور My books دونوں کا ترجمہ چینی زبان میں *wo-de-shu* ہوگا۔[83]

قواعدی طور پر انگریزی زبان میں صرف دو عدد ہیں واحد اور جمع۔عربی زبان میں واحد، تثنیہ اور دو سے زائد کے لیے جمع۔دنیا کی چند زبانوں مثلاً فجی زبان میں تین سے زائد کے لیے جمع کا ستعمال ہوتا ہے۔ تثنیہ کا تصور کم زبانوں میں پایا جاتا ہے۔زیادہ تر یورپی زبانوں میں دو کے عدد کے اظہار کے لیے کوئی قواعدی طریقہ نہیں ہے ایک سے زائد کے لیے جمع استعمال کرتے ہیں اور اگر دو بیان کرنا ہی ہوتا ہے تو اس کے لیے نمبر کا استعمال کرتے ہیں۔

اردو زبان میں بھی ایک کے لیے واحد اور ایک سے زائد کے لیے جمع کا استعمال ہوتا ہے۔ تثنیہ کا تصور یہاں بھی نہیں ہے۔ البتہ اردو میں تثنیہ کے کچھ الفاظ ضرور ہیں جیسے فریقین، صاحبین، جانبین وغیرہ لیکن یہ الفاظ عربی سے ماخوذ ہیں اردو قواعد میں ایسی کوئی شق نہیں ہے۔ عربی سے مستعار تثنیہ کے الفاظ کے علاوہ جب کسی تثنیہ کے لفظ کا ترجمہ کرنا ہوتا ہے تو اس کو لفظ کے بجائے عدد میں ظاہر کرنا پڑتا ہے۔

وكان فيمن معه من السباع ابنا آوى يقال لأحدهما (كليلة)

والآخرِ (دمنة) وكانا ذوي دهاء وعلم وادب۔84

خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

اس کے درباریوں میں دو گیڈر تھے، ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا ''دمنہ''

وہ آپس میں بھائی تھے اور بڑے چالاک، ہوشیار اور علم وادب والے تھے۔85

رفیع الدین حنیف نے اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے:

اس کے ساتھ جو درندے رہتے تھے، ان میں دو گیڈر بھی تھے، ان میں سے ایک کا نام ''کلیلہ'' تھا اور دوسرے کا نام ''دمنہ'' وہ دونوں نہایت مکار، چالاک، اور ذی علم تھے۔86

اصل متن میں تثنیہ کا لفظ ابنا آوى ہے جو لفظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو زبان میں اس کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے تثنیہ کو عدد میں ظاہر کرتے ہوئے ''دو گیڈر'' ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ اس اعتبار سے مداخلت ہے کہ اصل متن کی زبان میں عدد کو بصورت لفظ ظاہر کرنے کی گنجائش ہے اور ترجمے میں عدم گنجائش کی وجہ سے عدد میں ظاہر کرنا پڑا۔

بسا اوقات ایسی صورت حال بھی پیش آتی ہے کہ مترجم سے عدد کو بیان کرنے میں سہو ہو جاتا ہے یا مترجم اس طرف غور نہیں کرتا اور اس سے واحد کی جگہ جمع یا جمع کی جگہ واحد ترجمہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں۔ ڈرامہ الأسير الكريم "خبيب بن عدي" کا دوسرا سین ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

(في المربد..مكان ضيق مظلم له باب محكم)

(خبيب جالس على الأرض و في رجليه القيد الثقيل و جليلة و ابنها عامر يضربانه بالعصىٰ)87؎

پروفیسر خاور بٹ نے اس ڈرامے کا ترجمہ ''قیدی'' کے نام سے کیا ہے۔ وہ اس عبارت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

(اصطبل۔۔۔۔۔۔۔۔ایک نیم تاریک کمرہ جس کا دروازہ بہت مضبوط ہے حضرت خبیبؓ بن عدی زمین پر تشریف فرما ہیں۔ ان کے پاؤں میں بیڑیاں ہیں۔ ماں بیٹا ڈنڈوں سے انہیں مار رہے ہیں)۔88؎

مذکورہ بالا عربی جملے میں قابل غور لفظ العصیٰ ہے۔ مترجم نے کا ترجمہ ''ڈنڈوں'' سے کیا ہے۔ اصل متن میں مستعمل لفظ واحد ہے جب کہ مترجم نے اس کا ترجمہ جمع سے کیا ہے۔ گویا مترجم نے واحد کو جمع سے تبدیل کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی مفہوم و معنی کے اعتبار سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی لیکن عدد کے اعتبار سے مداخلت میں شامل ہے۔

اردو زبان کے عددی نظام میں تثنیہ شامل نہیں ہے، چنانچہ جب تثنیہ کا لفظ آتا ہے تو ترجمہ کرنے میں دشواری کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ اگر اصل زبان میں تثنیہ کا صیغہ دو کا عدد ظاہر کرنے کے لیے ہی لایا گیا ہے تو ترجمے میں اس کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے لیکن پھر اس دو کے عدد کے لیے الگ لفظ لانا پڑتا ہے۔ اگر عدد مراد نہ ہو تو مترجم کبھی کبھی نظر انداز بھی کر دیتا ہے۔

أبوذر: ويحك يا فتى ، ان النبي ﷺ قال: (ليس مسكين بهذا الطواف الذي يطوف على الناس فترده اللقمة واللقمتان والتمرة و التمرتان، انما المسكين التعفف، اقرئوا ان شئتم: ﴿لا يسألون الناس الحافاً﴾)و سمعته ﷺ يقول: (و ما يزال الرجل يسأل الناس حتى يأتي يوم القيامة و ليس في وجهه مزعة لحم).89؎

اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

ابوذرؓ: سن اے نوجوان، نبی ﷺ فرماتے ہیں۔ مسکین وہ نہیں ہے جولوگوں کے گھروں کا چکر لگا کر روٹی کے چند نوالے اور گنتی کی چند کھجوریں مانگتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم ارشاد کرتا ہے ﴿لا یسألون الناس الحافاً﴾ (مگر وہ لوگ ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں)۔اور میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلانے والا جب قیامت کے دن حاضر ہوگا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔90

مصنف نے جولفظ استعمال کیا ہے اس میں ایک واحد ایک اور ایک تثنیہ اللقمة واللقمتان والتمرة و التمرتان اور مترجم نے جب اس کا ترجمہ کیا تو عدد کا لحاظ نہ کرتے ہوئے ''چند نوالے اور گنتی کی چند کھجوریں'' ترجمہ کر دیا۔اصل عبارت کا لحاظ کریں تو ایک اس کا ترجمہ ''ایک دو لقمے اور ایک دو کھجور'' ہونا چاہیے۔مترجم کے جانب سے عدد کو نظر انداز کرنے سے معنی و مفہوم میں کوئی خاص فرق تو واقع نہیں ہوا ہے لیکن بہرصورت یہ عدد کے اندر مداخلت تو ہے ہی۔

نظام تعداد میں اختلاف کا اثر ترجمہ پر ہونا ضروری ہے۔ جہاں تعداد کا نظام نہیں ہوگا مثلاً چینی و جاپانی سے کسی ایسی زبان میں ترجمہ کیا جائے جس میں تعداد کا نظام موجود ہو تو مترجم کو مشکل درپیش آئے گی؛ کیوں کہ اس کے سامنے تعداد کے ذکر کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوگا۔اسی طرح اس وقت بھی مترجم کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا کہ زبان میں عدد کا نظام تو ہے لیکن وہ عدد نہیں ہے جو اصل زبان میں بیان کیا گیا ہے۔مثال کے طور پر عربی میں تثنیہ کا عدد موجود ہے لیکن اردو، انگریزی اور اکثر و بیشتر یورپی زبانوں میں تثنیہ کا تصور نہیں ہے۔ایسی حالت میں مترجم کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں یا تو اس کو جمع بیان کرے (جو کہ بہت کم ہوتا ہے) دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو نمبرات میں ظاہر کرے۔اگر مترجم نمبرات کا استعمال کرتا ہے اس کا مطلب ہے کہ اس نے قواعد کے بجائے لغوی انداز اختیار کیا۔اس کو ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔مثال کے پر انگریزی کا لفظ you ہے جو انگریزی میں واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اردو میں اس کا متبادل ہوگا تم، آپ، عربی میں اس کے تین

متبادل ہوں گے واحد، تثنیہ اور جمع ،فجی میں اس کے چار متبادل ہوں گے واحد، تثنیہ، تین کا عدد، جمع ۔اس کے برعکس انگریزی میں تم اور تم لوگ واحد اور جمع کے لیے الگ الگ کوئی عدد نہیں ہے۔چینی و جاپانی زبان میں He اور They کے لیے الگ الگ اعداد نہیں ہوں گے۔

اس مسئلہ کو مترجم سیاق و سباق سے حل کرتا ہے۔اس حقیقی عدد تک رسائی حاصل کرتا ہے جو مراد مصنف ہوتا ہے۔کبھی اسے کامیابی ملتی ہے اور کبھی نہیں ۔عدم کامیابی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ خود مصنف کا منشا عدد کا عدم اظہار ہوتا ہے دوسرے کبھی مصنف اظہار اور عدم اظہار کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا وہ اپنی زبان کے مطابق بیان کر دیتا ہے۔مسئلہ تو مترجم کو پیش آتا ہے۔اگر ہدفی زبان میں وہ نظام موجود نہیں ہوتا جو اصل زبان میں ہے تو مترجم کو مداخلت سے کام لینا پڑتا ہے۔یعنی اگر اصل زبان میں عدد کا نظام ہوتا ہے اور ہدفی زبان میں نہیں ہوتا تو اصل زبان کا بیان کردہ عدد مخفی رہ جاتا ہے اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے تو مخفی عدد بیان ہو جاتا ہے۔

اردو میں فعل اور ضمیر میں مطابقت ہوتی تو ہے لیکن یہ کوئی حتمی اصول نہیں ہے۔یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ اسم یا ضمیر واحد ہو تو فعل بھی واحد ہو گو کہ معناً واحد ہی ہوتا ہے لیکن لفظاً فعل جمع کا استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح کبھی جمع کے لیے واحد کی ضمیر و فعل استعمال ہوتا ہے۔اسے ہم صیغۂ تعظیمی بھی کہہ سکتے ہیں۔جیسے فلم مغل اعظم میں ایک مکالمہ ہے ''بخدا ہمیں یہ بغاوت منظور ہے، مابدولت بنفس نفیس جنگ میں شریک ہوں گے''۔یہ مکالمہ اکبر اعظم کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔اکبر اعظم کی عظمت و جلال اپنی جگہ لیکن ہیں تو وہ فرد واحد ہی۔اسی طرح مولانا آزاد جامع مسجد دلی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ''تمھیں یاد ہے میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ دی''۔ایک جملہ اور دیکھئے ''میں نے تمھیں سمجھایا لیکن تم نے میری ایک نہ سنی'' دونوں جملوں میں ایک ہی ضمیر استعمال ہوئی ہے ایک میں خطاب مجمع عام سے ہے دوسرے میں مخاطب فرد واحد ہے۔ہم تو اس فرق کو سمجھتے ہیں لیکن جب اس کا ترجمہ ہوگا تو دونوں جملوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔اکبر اعظم کے لیے بھی یہ روا نہ ہوگا کہ We کی ضمیر استعمال کی جائے۔

زبانوں کا مزاج بھی اس سلسلے میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔بعض زبانوں میں عدد کا نظام اس قدر

پختہ ہوتا ہے کہ وہاں اشتباہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی نیز اس نظام کی پختگی کی وجہ سے مصنف کو دوسرا کوئی موزوں طریقہ بھی میسر نہیں ہوتا، وہ انہیں حدود میں مقید ہوتا ہے۔

صنف اور مداخلت

صنف ایک قواعدی خصوصیت ہے جس کے مطابق کچھ زبانوں میں اسم وضمیر کی درجہ بندی بطور مذکر و مونث کی جاتی ہے۔ جس طرح ساری زبانوں میں عدد کا تصور اور استعمال یکساں نہیں ہے، اسی طرح صنف کا تصور اور استعمال بھی تمام زبانوں میں یکساں نہیں ہے۔ بعض زبانوں میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے، بعض میں کم ہے اور بعض میں بالکل بھی نہیں ہے۔ مولوی عبدالحق اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''زبان کی دنیا اس سے الگ ہے۔ کسی میں جنس کی تین قسمیں ہیں یعنی مذکر، مونث اور تیسری نہ مذکر نہ مونث۔ کسی میں دو یعنی مذکر و مونث، اور بعض ایسی خوش قسمت ہیں کہ ان میں سرے سے یہ جھگڑا ہی نہیں۔'' 91

جن خوش قسمت زبانوں کا مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے اس کے متعلق مونا بیکر لکھتی ہیں:

> Other languages such as Chinese and Indonesian do not have gender distinctions in their person systems at all. 92

(دوسری زبانوں مثلاً چینی وانڈونیشیائی زبان کے اندر صنف کا امتیاز ہے ہی نہیں)

رہا معاملہ ان زبانوں کا جن میں صنف کی تقسیم پائی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں تین زبانیں خاص طور پر مرکز گفتگو ہیں۔ انگریزی، عربی اور اردو۔

انگریزی زبان میں صنف کا تصور تو ہے لیکن اس قدر جامع نہیں ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا کوئی حتمی اصول نہیں ہے۔ نہ اسماء و افعال میں اس کا امتیاز لازم ہے۔ مونا بیکر لکھتی ہیں:

> English does not have a grammatical category of gender as such; Enghlish nouns

are not regularly inflected to distinguish
between feminine and masculine. [93]

(انگریزی زبان میں صنف کی قواعدی درجہ بندی نہیں ہے مثلاً؛ تمام انگریزی اسماء میں سے ہمیشہ مذکر و مونث کا اظہار نہیں ہوتا)

انگریزی میں معنوی سطح پر صنف کا کچھ امتیاز پایا جاتا ہے مثلاً دونوں کے لیے الگ الگ لفظ ہوتے ہیں جیسے Boy, Girl, Man, Woman وغیرہ۔ اسم کے آخر میں ess کا لاحقہ لگا کر بھی اسم بنایا جاتا ہے جیسے actor, actress, manager, manageress وغیرہ لیکن یہ کوئی کلی اصول نہیں ہے اور نہ ہی ہر جگہ اس کا استعمال ہوسکتا ہے مثلاً doctor کے ساتھ doctoress نہیں بولتے۔ انگریزی میں واحد غائب کے صیغوں میں صنف کا اظہار ہوتا ہے لیکن جمع کے جمع غائب اور بقیہ تمام ضمائر میں صنف کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ انگریزی میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں صنف کی تیسری قسم بھی آتی ہے جیسا کہ مولوی عبدالحق نے ذکر کیا ہے جس میں تذکیر و تانیث کی صفت نہیں ہوتی ہے جیسے It۔

جن زبانوں میں صنفی خصوصیت سب سے زیادہ پائی جاتی ہے ان میں عربی زبان سب سے آگے ہے۔ محمد حسن یوسف لکھتے ہیں:

" من المعلوم ان التذكير masculine و التانيث feminine يشكلان خاصية اساسية فى اللغة العربية. فجيع الاسماء و الافعال فى اللغة العربية يمكن تمييزها من حيث التذكير و التانيث." [94]

(یہ بات معلوم ہے کہ عربی زبان میں تذکیر و تانیث کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ عربی زبان کے اندر تمام اسماء و افعال کے درمیان بطور تذکیر و تانیث تمیز کی جاسکتی ہے)

عربی میں کوئی ایک اسم یا فعل ایسا نہیں ہوسکتا جس میں صنف کی وضاحت نہ ہو۔ کوئی بھی اسم ہو وہ یا مذکر ہوگا یا مونث اور جب اسم میں یہ صفت ہوگی تو فعل میں ہونی لازم ہے کیوں کہ عربی میں اسم اور فعل کے درمیان مطابقت ہونی لازم ہے۔

اردو زبان بھی صنفی امتیاز کے سلسلے میں تقریباً عربی کے ہم پلہ ہے۔اس میں کوئی فعل یا اسم اس صفت سے خالی نہیں ہوتا۔البتہ اردو میں یہ نظام عربی کے مقابلے میں اس قدر مضبوط نہیں ہے۔عربی میں مونث کے قواعد حتمی ہیں اس میں استثنیٰ بہت کم ہیں۔ایسے اسماء کم ہوتے ہیں جو قواعد سے وضع نہیں ہوئے بلکہ ان کے لیے علاحدہ لفظ ہے جیسے رجـــل (مرد) کا مونث امـــرأـــۃ (عورت) ہے۔جب کہ اردو میں استثنیٰ بہت ہے۔عربی اور فارسی کے مستعار الفاظ میں تو وہی اصول نافذ ہوتا ہے جو اصل زبان میں ہے یعنی جو الفاظ وہاں مذکر ہیں وہ یہاں بھی مذکر استعمال ہوتے ہیں اور جو مونث ہیں وہ مونث استعمال ہوتے ہیں۔البتہ اردو اور ہندی کے مستعار الفاظ میں استثنائی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے مثلاً اردو میں وہ اسماء عموماً مونث ہوتے ہیں جن کے آخر میں ''ی'' ہوتی ہے جیسے گھوڑی،لڑکی لیکن ہاتھی مذکر ہے۔بہت سے اسماء ایسے ہیں جن کے آخر میں ''ی'' ہوتی ہے لیکن وہ مونث نہیں ہوتے؛ کیوں کہ وہ ''ی'' یائے نسبتی ہوتی ہے جیسے مالی،موچی،پنجابی،بنگالی وغیرہ۔

عربی کے اکثر ضمائر کے اندر صنف کی تقسیم بالکل حتمی اور واضح ہوتی ہے۔واحد اور جمع متکلم کی ضمیر میں صنف واضح نہیں ہوتی۔اردو اور انگریزی میں ضمائر کے اندر صنف کا امتیاز ایسا نہیں ہے۔انگریزی میں واحد غائب She/ He کے علاوہ اور ضمائر میں اس کا امتیاز نہیں ہوتا جب کہ اردو ضمائر میں صنفی امتیاز ہے ہی نہیں۔

''اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' 95

البتہ افعال کی سطح پر اردو بالکل عربی کے ہم پلہ ہے۔جس طرح عربی میں تمام افعال تذکیر و تانیث کی صفت سے آراستہ ہوتے ہیں اسی طرح اردو افعال کی بھی یہ لازمی صفت ہے۔دراصل اردو میں صنف کی حقیقی تعیین افعال سے ہی ہوتی ہے۔خصوصاً ضمائر کے مطابق صنف کی تقسیم فعل سے ہی ممکن ہوتی ہے۔مثلاً اردو میں واحد/جمع غائب مونث و مذکر کے لیے ایک ہی ضمیر شخصی ''وہ'' ہے۔فعل کے ذکر سے تعین ہو جائے کہ ضمیر مذکر کے لیے ہے یا مونث کے لیے۔

زبانوں کے درمیان صنفی تقسیم کے اس فرق کا اثر ترجمہ پر پڑنا لازم ہے۔جن زبانوں میں صنف کا نظام سرے سے ہے ہی نہیں جیسے چینی وانڈونیشائی زبان کے کسی متن کا ترجمہ عربی زبان میں کرنا ہو تو مترجم کو کس قدر دشواری سے گزرنا پڑے گا۔ہر جملہ میں اسے تبدیلی کرنی ہی پڑے گی کیوں کہ اس کے بغیر جملے کی

تشکیل ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی صورت حال صنفی نظام کے اعتبار سے مضبوط اور کم مضبوط زبانوں میں پیش آئے گی۔ انگریزی سے عربی اور اردو میں ترجمہ کے دوران مترجم کو انہیں مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ مثال کے طور پر اردو انگریزی ضمائر He/She/It/They چاروں کے لیے اردو میں ایک ہی متبادل ہے ''وہ''۔ یہی صورت حال دیگر ضمائر کی بھی ہے۔ They کو ہی دیکھ لیں انگریزی کا جملہ ہے They came اردو میں اس کا دو متبادل ہوں گے ''وہ آئے''/ ''وہ آئیں''۔ عربی میں مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ وہاں تو ضمائر میں صنف کا اظہار لازم ہے۔ انگریزی ضمیر you کے لیے عربی میں پانچ (تثنیہ میں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں ہے) متبادل ضمائر ہیں: ھو / ھما، ھم / ھی، ھما / ھُنَّ۔ افعال میں اور بھی مشکل ہوگی کہ اس کے چھ متبادل: جاء/ جاءا/ جائوو، جائت/ جائتا/ جئن ہوں گے۔

مترجم کے سامنے مداخلت کے سوائے کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ کیوں کہ اسے دو میں ایک کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ یا تو یہ ہوگا کہ اصل زبان میں تذکیر و تانیث کی توضیح نہیں تھی لیکن ہدفی زبان میں ہوگی، یا اس کے برعکس اصل زبان میں توضیح تھی لیکن ہدفی زبان میں نہیں ہوگی۔

عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ کتب میں اس قسم کی مداخلت کا امکان تقریباً نا کے برابر ہے؛ کیوں کہ اس اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اردو ضمائر میں تذکیر و تانیث کا اشتباہ فعل اور اسم کے ذکر کے ساتھ ہی رفع ہو جاتا ہے اس لیے فرق پیدا ہونے کی گنجائش باقی نہیں رہتی؛ چنانچہ زیر نظر مطالعہ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔

جملہ کی ترکیبی ساخت اور مداخلت

جملے کی تشکیل مختلف عناصر کے ملنے سے وجود میں آتی ہے۔ ان کا ملاپ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان سے پیغام کی تنظیم متاثر ہوتی ہے:

> The syntactic structure of a language imposes restrictions on the way messages may be organized in that language.[96]

(زبان کی نحوی ساخت اس طریقے پر پابندی نافذ کرتی ہے جس سے اس زبان میں پیغام کو منظّم کیا جاسکتا ہے)

یہاں کئی باتیں قابل لحاظ ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں جملے کے عناصر کے درمیان ترکیب پر غور کرنا ہے۔ یہ ترکیب زبانوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی میں جملہ فاعل + فعل + مفعول سے ترکیب پاتا ہے جیسے Rashid sings a song، عربی میں جملے کی ترکیب فعل + فاعل + مفعول سے بنتی ہے جیسے قرأ راشد کتابا (راشد نے کتاب پڑھی)، اردو میں جملے کی ترکیب فاعل + مفعول + فعل ہے جیسے حامد ترجمہ کرتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انگریزی اور اردو کے جملے میں فعل کا ہونا لازم ہے۔ جب تک فعل نہیں ہوگا جملہ مفیدہ تشکیل نہیں پاسکتا جب کہ عربی میں بغیر فعل کے بھی جملہ مفید بن جاتا ہے۔ جیسے ''زید عالم ''زید عالم ہے، Ziad is scholar۔ اردو میں ''ہے'' (فعل معاون) اور انگریزی میں ''is'' (auxiliary verb) فعل ہیں۔

تیسری چیز ہے جملے میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کی ترتیب۔ اسی ترتیب سے جملے کی معنوی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک ہی جملہ کو مختلف ترکیبوں میں استعمال کرنے سے معنوی کیفیت تبدیل ہوجاتی ہے۔ مثلاً تمھیں بازار جانا چاہیے تھا، بازار تمھیں جانا چاہیے تھا، تمھیں جانا چاہیے تھا بازار وغیرہ۔ ترجمہ میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لفظوں کی ترتیب کے زیر اثر ہی ڈسکورس اور اسلوب طے ہوتا ہے۔ بندش الفاظ شاعری میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے پیغام کی ترسیل کے ساتھ کیفیت کی ترسیل کا بھی کام لیا جاتا ہے۔

قال دبشليم الملك لبيدبا الفيلسوف، وهو رأس البراهمة۔97

مذکورہ بالا عبارت کلیلہ و دمنہ سے ماخوذ ہے اس کے دو ترجمے دستیاب ہوئے۔ یکے بعد دیگر دونوں ترجموں کو ملاحظہ فرمائیں۔ رفیع الدین حنیف نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

دبشلیم بادشاہ نے بیدبا فیلسوف سے جو برہمن قوم کا سردار تھا کہا۔98

دوسرا ترجمہ خورشید انور ندوی کا ہے انہوں نے ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے:

بادشاہ دبشلیم نے برہمنوں کے سردار فلسفی بیدبا سے کہا۔[99]

اصل متن کے جملے کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں ترجموں کا تقابلی مطالعہ کریں تو ترتیب اور بالخصوص جملے کی ترکیب کے لحاظ سے کئی طرح کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ جملے کی ترکیب پر غور کریں تو دبشلیم کی صفت الملك ہے اور بیدبا کی صفت الفیلسوف ہے۔اس کے بعد مبتدا خبر کے ساتھ ایک پورا جملہ ہے جو حرف عطف کے ساتھ سابق سے مربوط ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو اصل متن میں دو جملے ہیں جب کہ ترجمے میں ایک ہی جملہ رکھا گیا ہے۔ پہلے ترجمے میں الگ سے جملہ بنانے کے بجائے دوسرے جملے کا اسم موصول اور صلہ کی حیثیت سے ترجمہ کیا گیا جب کہ دوسرے ترجمے میں اصل متن کے دوسرے جملے ''وهو رأس البراهمة'' کو ایک لفظ میں بطور مضاف مضاف الیہ استعمال کرلیا گیا ہے۔

ہر زبان کا اپنا قاعدہ اور مزاج ہے جو ضروری نہیں ہے کہ دوسری زبان سے ہم آہنگ ہو۔قواعدی ساخت کے تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے مترجم کو جملے کی ترتیب بدلنی ہی پڑتی ہے۔

قال بیدبا:اذا ابتلي المتحابان بأن یدخل بینهما الكذوب المحتال لم یلبثا أن یتقاطعا و یتدابرا۔[100]

بیدبا نے کہا: جب دو دوست آزمائش میں پڑ جاتے ہیں اوران کے درمیان ایک چالباز مکار پھوٹ ڈال دیتا ہے تو وہ بہت جلد ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں اور دوستانہ تعلقات توڑ لیتے ہیں۔[101]

ترتیب کی تبدیلی کے لحاظ سے لفظ یہاں دو الفاظ زیر بحث ہیں: یتقاطعا و یتدابرا ۔مترجم نے اپنے ترجمے میں دوسرے لفظ کا ترجمہ پہلے اور پہلے لفظ کا ترجمہ بعد میں کیا ہے۔ترتیب کی پابندی کرتے ہوئے ترجمہ ہونا چاہیے تھا'' دوستانہ تعلقات توڑ لیتے ہیں اور ایک دوسرے سے پیٹھ پھیر لیتے ہیں''۔

فلما دخله وجد جماعة من اللصوص قد قطعوا الطریق علی رجل من التجار، وهم یقتسمون ماله، و یریدون قتله۔[102]

کلیلہ ودمنہ کے دو ترجمے یہاں ذکر کیے جاتے ہیں پھر اس کا تجزیہ کیا جائے گا۔

جب وہ اس کے اندر گیا، تو وہاں ایک چوروں کی ٹولی تھی، جس نے ایک تاجر پر ڈاکہ ڈالا تھا، اور وہ لوگ اس کے مال کو تقسیم کر رہے تھے اور اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔103

ایک دوسرا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

جب وہ اس کے اندر گھسا تو کیا دیکھتا ہے کہ ڈاکوؤں کی ایک ٹولی نے ایک تاجر پر ڈاکہ ڈال دیا ہے اور وہ اس کو قتل کر کے اس کے مال کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔104

پہلے ترجمے میں اصل متن کے جملے کے ہر جز کا ترجمہ اسی ترتیب سے کرنے کی کوشش کی ہے جیسا وہ موجود ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں جملے کے اجزا کو خلط ملط کر کے برعکس ترتیب کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے۔ اصل جملہ تھا ''وھم یقتسمون مالہ، و یریدون قتلہ ''یعنی چور مال تقسیم کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ قتل کا بھی ہے۔ اس مفہوم کو پہلے ترجمے میں بعینہٖ منتقل کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے ترجمے میں جو اسلوب اور ترتیب اختیار کی گئی ہے اس سے ایسا لگتا ہے کہ پہلے قتل اور پھر اس کے بعد مال تقسیم کرنے کا ارادہ ہے۔ اس طرح جملے کا ترتیبی مفہوم بالکل جدا ہو گیا ہے۔

عام جملے کی سطح پر دیکھیں تو اس سے صرف ترتیب ہی بدلتی ہے معنوی اعتبار سے فرق نہیں آتا لیکن طویل و پیچیدہ جملے، نیز جملوں کے مجموعہ یعنی پورے پیراگراف اور مکمل متن کی صورت میں جائزہ لیں تو ترتیب سے معنوی کیفیت میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مترجم کے لیے اس بات کا امکان ہو کہ وہ اس ترتیب کو ملحوظ رکھ سکے تو بہتر ہے ورنہ تو ظاہر ہے کہ اسے ہدفی زبان میں اصل سے مداخلت کرنی ہی پڑے گی۔ ترتیب میں ہونے والی مداخلت سب سے زیادہ عام اور لازم ہے۔ مترجم کے سامنے اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں ہو سکتا۔ اسے مداخلت سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیوں کہ بہر حال یہ اصل متن کے مقابلے میں ایک گونہ تبدیلی ہے۔ یہ مداخلت زبان کی شناخت بنتی ہے اور نئے پیرائے اظہار کے لیے زمین بھی ہموار ہوتی ہے۔

دو اہم چیزیں اور بھی ہیں۔ ایک تو زبان میں زمانہ کا نظام یعنی Tense۔ انگریزی اور اردو میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کی علاحدہ تقسیم ہے۔ جیسے وہ آیا/آتا ہے یا آ رہا ہے/آئے گا۔ He came/ He comes/ He will come.۔ اس کے برعکس عربی میں تینوں زمانے تو ہیں لیکن حال اور مستقبل

کے لیے علاحدہ صیغے نہیں ہیں۔ ''یجیء'' آتا ہے/آئے گا'' دونوں زمانوں کے لیے ایک ہی صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ یہی صورت حال فارسی کی بھی ہے، ''گوید'' کہتا ہے/کہے گا۔

مترجم عربی سے ترجمہ کرتے وقت سیاق کو ملحوظ رکھتا ہے تبھی اس کی وضاحت ہوگی کہ مستقبل مراد ہے یا حال۔ دوسرے یہ کہ اردو اور انگریزی کے مستقبل کے صیغوں کو وہ ایک مضارع کے صیغے سے ہی ظاہر کرتا ہے۔ البتہ بسا اوقات کچھ حروف مثلاً ''س، سوف'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جس سے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے جیسے سیجیء، سوف یجیءُ وہ عنقریب آئے گا۔ آج کل مستقبل کو بیان کرنے کے لیے اس کا رواج عام ہو رہا ہے۔

ماضی، مضارع اور حال کے اعتبار سے زمانوں کی جو تقسیم ہے ترجمے کے دوران اس میں مداخلت ہوتی ہے۔ مترجم ایک زمانے کے بجائے دوسرے زمانے میں ترجمہ کر دیتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مترجم زمانے کے بجائے مصدر کے صیغے سے ترجمہ کر دیتا ہے۔

أبوذر: تعدل بين الأثنين صدقة، و تعين الرجل في دابته فتحمله عليها أو ترفع له عليها متاعه صدقة، والكلمة الطيبة صدقة، و تميط الأذى عن الطريق صدقة، و تأمر بالمعروف صدقة، و تمسك عن الشر صدقة؛ هكذا سمعت من رسول الله ﷺ۔ 105

ابوذرؓ: دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا صدقہ ہے۔ کسی آدمی کو گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دینا یا اس کا سامان اٹھا کر گھوڑے پر رکھوا دینا صدقہ ہے۔ اچھی بات کہنا صدقہ ہے، راستے کو تکلیف دہ چیزوں سے پاک کرنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا یہ سب صدقہ ہے۔ ثعلبہ! میں نے نبی ﷺ کو یہی فرماتے سنا ہے۔ 106

اصل متن کے جملے میں ابوذرؓ کی زبانی ثعلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے تمام صیغے واحد مذکر حاضر مضارع معروف کے استعمال کیے گئے ہیں؛ جب کہ مترجم نے ترجمہ کرتے ہوئے جملے کے تمام اجزا کا ترجمہ مصدر سے کر دیا ہے۔ یہ تبدیلی قواعد میں واضح مداخلت ہے۔

صیغے کی تبدیلی کے اس عمل کو ذیل کی مثال میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

أصبحتُ مُطّرِحاً في معشرجهِلوا

حَقَّ الأديب فباعواالرأسَ بالذَّنَبِ

میں پھینک دیا گیا ہوں ایسے معاشرہ میں جو بے خبر ہے ادیب کے حق سے اور سر کو

دم کے عوض فروخت کرتے ہیں۔107؎

اصل متن یعنی شعر اور اس کے ترجمے کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مترجم نے قواعد کے اعتبار سے جملے میں ترکیب کو ملحوظ نہیں رکھا۔ پہلے مصرعے میں مترجم نے معشر کا ترجمہ معاشرہ کیا ہے جو کہ واحد ہے لیکن دوسرے مصرعے میں 'کرتے ہیں' فعل جمع مذکور ہے۔ جس لفظ سے یہاں خاص بحث ہے وہ ہے فباعوا یہ ماضی جمع غائب کا صیغہ ہے۔ مترجم نے اس کا ترجمہ 'فروخت کرتے ہیں' کیا ہے۔ ترجمے کو دیکھیں تو یہاں مضارع جمع غائب کا صیغہ یبیعون ہونا چاہیے۔ لہٰذا یہاں مترجم نے فعل ماضی کا ترجمہ فعل مضارع سے کیا ہے جو کہ زمانے میں مداخلت ہے۔

دوسری بات معروف ومجہول جملوں کا استعمال ہے۔ اس کا انحصار بھی زبان کے مزاج اور عادت پر ہے۔ بعض زبانوں میں معروف جملے استعمال ہوتے ہیں جب کہ بعض میں مجہول۔ اردو میں مجہول جملوں کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کا رواج عام ہے، اسی طرح عربی میں بھی مجہول جملے استعمال ہوتے ہیں گو کہ ان کی شرح انگریزی کے مقابلے میں کم ہے۔ جملوں کے اس استعمال کا تعلق بلاغت سے بھی ہے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے وقت عام طور پر مجہول جملوں کو معروف سے بدل دیا جاتا ہے؛ کیوں کہ معروف جملوں کی کثرت اردو کے مزاج پر انتہائی گراں گزرتی ہے۔

مجہول کو معروف سے بدل دینا یا معروف کو مجہول سے تبدیل کرنا اصل متن کے ساتھ مداخلت ہی کرنا ہے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں:

"قال أما والله لو شئتم لقلتم فلصدقتم و لصدقتكم"108؎

اس عبارت میں 'فلصدقتكم' کی ترکیب میں صیغہ واحد متکلم مع ضمیر جمع حاضر معروف ہے۔

مختارات کے دستیاب چار میں سے تین ترجموں میں معروف صیغہ لایا گیا ہے۔ ان میں ایک ترجمہ بطور تائید پیش ہے:

''تو آپ نے فرمایا اللہ کی قسم اگر تم چاہو تو تم کہہ سکتے ہو اور تم سچے ہو گے اور میں تمہاری تصدیق کروں گا''۔109

اس کے علاوہ دو اور ترجموں میں بھی معروف صیغے کے ساتھ ہی ترجمہ کیا گیا ہے لیکن ایک ترجمے میں ترجمہ کرتے ہوئے معروف کو مجہول سے بدل دیا گیا ہے۔

''آپ ﷺ نے فرمایا: خبردار اللہ کی قسم! اگر تم چاہو تو تم ضرور کہو، چنانچہ تم سچ کہو گے اور یقیناً تم تصدیق کیے جاؤ گے''۔110

معروف کو مجہول سے بدلنے کا یہ عمل مداخلت کے ذیل میں شمار ہوگا۔ مذکورہ بالا جملہ عجیب اس لیے بھی لگ رہا ہے کہ اردو کا مزاج مجہول جملوں کو کم قبول کرتا ہے بلکہ زیادہ تر مجہول جملوں کو معروف سے تبدیل کر دیا جاتا ہے لیکن یہاں اس کے برعکس معروف جملے کو مجہول سے ترجمہ کر دیا گیا۔

جملوں کی ترکیبی ساخت کے اعتبار سے غور کیا جائے تو مترجم کو اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جملہ فعلیہ ہے یعنی فعل کا استعمال ہوا ہے تو ترجمے میں فعل استعمال ہو اور اگر جملہ میں فعل نہ لایا گیا ہو تو بغیر فعل کے جملہ تشکیل دیا جائے۔ اس کی عدم پابندی بنیادی طور پر متن میں مداخلت ہی ہے، کہ متن میں فعل نہیں تھا اور جملے میں فعل لایا گیا یا اس کے برعکس اصل متن کے جملے میں فعل تھا اور ترجمے میں فعل کا استعمال نہیں ہوا۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

عامر: لاأدري۔ (ینظر الی جهة الباب) ها هو ذا خالی عقبة ۔ فاسأليه۔111

اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

عامر: معلوم نہیں (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) ٹھہریئے ماموں جان آرہے ہیں انہیں سے پوچھئے۔112

مصنف نے جوالفاظ استعمال کیے ہیں'ھا ھو ذا خالی عقبة'۔اس میں کوئی فعل نہیں ہے؛لیکن مترجم نے اس جملے میں فعل کا استعمال کرتے ہوئے'ماموں جان آرہے ہیں' ترجمہ کیا۔جو ترجمہ کیا گیا ہے اس اعتبار سے متن میں فعل مضارع کا کوئی صیغہ ہونا چاہیے جب کہ ایسا نہیں ہے۔اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مترجم نے جملے کے ترجمے میں مداخلت سے کام لیا ہے۔اصل متن کے جملے میں فعل نہیں تھا لیکن ترجمے میں فعل لایا گیا ہے۔اس کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے'لیجئے یہ رہے ماموں جان'۔

جملوں کی ترکیبی ساخت میں ایک اہم جزنحویات کی ایک شاخ نکرہ اور معرفہ ہے۔اس مقام پر بھی مداخلت کے کافی امکانات ہوتے ہیں۔اکثر وبیشتر مترجمین اس کی کلی رعایت و پاسداری نہیں کر پاتے ہیں، یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس جانب خاطرخواہ توجہ نہیں ہوتی ہے،اس لیے معرفہ کا ترجمہ نکرہ سے اور نکرہ کا ترجمہ معرفہ سے ہوجاتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

"الصبي عامر يقبل مُسرعاً الی أمه الجالسة فی الحجرة".113؎

اس جملے کا ترجمہ قلب بشیر خاور بٹ نے یوں کیا ہے:

''ایک بچہ تیزی سے دوڑتا ہوا اپنی ماں (جلیلہ) کے پاس آتا ہے جو کہ ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے''۔114؎

اس جملے میں دولفظ قابل غور ہیں:ایک الصبي اوردوسرے الحجرة۔دونوں لفظ اصل عبارت میں معرفہ استعمال ہوئے ہیں۔پہلا لفظ معرفہ تو ہے اسی کے ساتھ مصنف نے اس کا نام بھی درج کردیا جس سے بیان بھی ہوگیا۔مترجم نے دونوں کا ترجمہ نکرہ سے کردیا۔اس سے یہاں یا دوسری جگہوں پر عموماً معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن جہاں حصر اور تاکید جیسی صورت حال ہو وہاں مشکل ہوگی، یا یہ کہ مصنف کا منشا معرفہ یا نکرہ ظاہر کرنا ہو اور مترجم اس کی رعایت نہ کرتے ہوئے برعکس کردے تو مشکل ہوگی۔ معنوی اعتبار سے کوئی فرق پڑے یا نہ پڑے بہرحال اسے قواعد میں مداخلت سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔

قواعد میں مداخلت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مترجم اپنی زبان کے اسلوب یا تحریر کی سلاست کو قائم کرنے کے لیے ایک جملے کا ترجمہ اصل متن میں موجود صیغے کے بجائے دوسرے صیغے سے کردے۔اس کو

مثال کے ذریعے بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے:

أبوذر: مافعلت امرأتك يا ثعلبة؟ هل وضعت؟

ثعلبة: لا يـا صـاحب رسول الله، مازلنا ننتظر وضعها. و قد تصدقت ببعض ما أخذته منك.115ے

اب اس جملے کا ترجمہ ملاحظہ کریں:

ابوذرؓ: کیا ہوا ثعلبہ؟ کیا تمہاری بیوی کے ہاں ولادت ہوگئی؟

ثعلبہ: نہیں اے صحابی رسول اللہ ﷺ۔ ہم ابھی انتظار ہی میں ہیں۔ اور جو کچھ آپ نے عطا فرمایا تھا اس میں سے بھی کچھ میں نے اللہ کی راہ میں خیرات کردیا ہے۔116ے

اصل متن اور ترجمہ کا قواعد میں مداخلت کے نقطہ نظر سے تقابلی جائزہ لیں تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلے جملے پر غور کریں تو مترجم نے اصل زبان کے قواعد کو ملحوظ رکھے بغیر بالکل بامحاورہ ترجمہ کیا ہے۔ اگر جملے کے پیش نظر ترجمہ کیا جاتا تو اس جملہ کا ترجمہ ہوتا ''اے ثعلبہ تمہاری بیوی نے کیا کیا؟ کیا اس نے جن دیا؟''۔ دوسرے جملے میں مترجم نے ایک خاص لفظ ''وضـعـهـا'' کو چھوڑ دیا۔ اگر اس کو ملحوظ رکھتے تو ترجمہ ہوتا ''ولادت کے انتظار میں ہیں''۔ ترجمے میں جو جملہ قواعد کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل غور ہے وہ ہے ''جو کچھ آپ نے عطا فرمایا تھا''۔ اصل متن میں جملہ ہے ''مـا أخـذتـه منك''، یعنی ''جو میں نے آپ سے لیا تھا'' اگر اس عبارت کو عربی میں منتقل کریں تو یوں کہا جائے گا ''مـا أعـطيتني''؛ حالانکہ اصل عبارت اس سے مختلف ہے۔ اصل عبارت میں ثعلبہ کی زبانی لینے کا ذکر ہو رہا ہے۔ معنوی اعتبار سے یوں تو کوئی خاص فرق نظر نہیں آرہا ہے لیکن طرز بیان اور قواعد کے لحاظ سے بہت فرق ہے جو کہ قواعد میں مداخلت ہے۔

قواعد میں مداخلت کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

فلما بات الرجل بذلك المكان تبرّم به واستوحش.117ے

اس کے دو ترجمے دستیاب ہیں دونوں ترجموں میں قواعد کی ترکیب الگ الگ استعمال کی گئی ہے۔ ترجمے ملاحظہ ہوں:

اس آدمی نے جب وہاں شب گذاری کی تو وہ اس جگہ سے اکتا گیا اور اسے وہاں وحشت ہونے لگی۔118؎

خورشید انور ندوی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

جب رات ہوئی تو وہ آدمی اکتا گیا اور اس کو اس جگہ سے وحشت محسوس ہونے لگی۔119؎

اصل عبارت میں بات الرجل کی ترکیب استعمال ہوئی ہے جس میں بَاتَ فعل ہے اور الرجل فاعل۔ پہلے ترجمے میں اسی ترکیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے لیکن دوسرے ترجمے میں اس مذکورہ ترکیب کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے الگ ترکیب وضع کر کے رات کو فاعل بنا کر ''جب رات ہوئی'' ترجمہ کیا گیا جو کہ اصل متن کے قواعد میں مداخلت ہے۔

ترکیب کی تبدیلی کی ایک اور مثال دیکھیں:

فلما سمِنَ و أمِنَ جعل يخور و يرفع صوته بالخُوار. وكان قريباً منه أجمة فيها أسد عظيم.120؎

جب وہ خوب موٹا ہو گیا اور ہر طرح کا امن و امان اس کو حاصل ہو گیا تو وہ بلند آواز سے ڈکارنے لگا، اس کے قریب میں ایک کچھار تھی جس میں ایک بڑا شیر تھا۔121؎

ایک اور ترجمہ ملاحظہ کریں جو رفیع الدین حنیف نے کیا ہے:

جب وہ (کھا پی کر) موٹا ہو گا ی تو ڈھاڑنے اور اپنی آواز بلند کرنے لگا، وہیں قریب میں ایک جھاڑی تھی، جس میں ایک بہت بڑا شیر رہتا تھا۔122؎

جب اصل متن کو سامنے رکھ کر دونوں ترجموں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے فيها أسد عظيم کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کوئی فعل نہیں ہے۔ ہاں یہ امکان ہے کہ فعل محذوف مان کر ترکیب پوری کر لیں۔ اس تقریر کی رعایت کرتے ہوئے پہلے ترجمے میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ دوسرے ترجمے میں الگ سے فعل 'رہتا تھا' لایا گیا جو کہ اصل متن کے جملے سے انحراف کی وجہ سے مداخلت میں شامل ہے۔

اصل جملے میں 'رہتا تھا' کے لیے کوئی لفظ مذکور نہیں ہے اور نہ ہی اس کی گنجائش نظر آتی ہے۔

جملے کی ترکیبی ساخت میں ایک اہم چیز افعال کا لازم و متعدی ہونا ہے۔ بعض افعال لازم ہوتے ہیں وہ فاعل پر پورے ہو جاتے ہیں اور بعض متعدی ہوتے ہیں جو مفعول کو چاہتے ہیں۔ ترجمے میں بعض اوقات مترجم سے یہ سہو ہو جاتا ہے یا وہ اس بات کا التزام نہیں رکھ پاتا کہ لازم کا لازم سے اور متعدی کا متعدی سے ترجمہ کرے۔ اس التزام میں زبان کا اسلوب بیان رکاوٹ بنتا ہے لیکن جہاں کوئی دشواری نہ ہو وہاں رعایت برتی جاسکتی ہے۔

هَلَكَ المُداوِي والمُداوى والذي جلب الدّواءَ وباعَه و مَن اشترى

علاج کرنے والا طبیب علاج پانے والا مریض اور دوائی بنانے والا اور بیع وشراء کرنے والا سبکو موت نے ہلاک کر دیا۔123

مذکورہ بالا شعر میں قابل غور لفظ هَلَكَ ہے۔ یہ واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے اور فعل لازم ہے بمعنی 'ہلاک ہونا، تباہ ہونا'۔ چنانچہ اس کے بعد کے الفاظ بحیثیت فعل کے ہیں اور اس کا ترجمہ ہونا چاہیے ''علاج کرنے والا طبیب علاج پانے والا مریض اور دوائی بنانے والا اور بیع وشراء کرنے والا سب ہلاک ہو گئے''؛ لیکن مترجم نے فعل لازم کو فعل متعدی کے مقام پر رکھ کر 'موت' کو فاعل مان کر ترجمہ کیا ہے جو کہ قواعد میں مداخلت ہے۔

ترجمے میں لازم و متعدی کے عدم لحاظ کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

فقام القرد وتكلف ماليس من شغله، فركب الخشبة وجعل ظهره قِبَل الوتد، ووجهه قبل الخشبة، فتدلّى ذنبه في الشّقّ، ونزع الوتد، فلزم الشّقّ عليه، فخر مغشياً عليه من الألم۔124

بندر اٹھا اور اس کام میں لگ گیا جو اس کے مطلب کا نہیں تھا، وہ لکڑی پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس نے اپنی پیٹھ کو میخ کی طرف اور اپنے چہرے کو لکڑی کی طرف کر لیا، اس کی دم لکڑی کے پھٹن میں سے ہو کر نیچے لٹک گئی، اس نے میخ کو باہر نکال لیا، میخ کے باہر نکالتے ہی لکڑی کی پھٹن آپس میں مل گئی، اور بندر مارے تکلیف کے بیہوش ہو کر گر گیا۔125

مذکورہ متن کا ایک اور ترجمہ ملاحظہ کریں:

بندر اپنی جگہ سے اٹھا، اور جو کام اس کے لائق نہیں تھا اس کو بتکلف انجام دینے لگا، وہ بھی لکڑی پر چڑھ گیا، اس کیل کی جانب اس نے اپنی پیٹھ کر لی اور اس کا چہرہ لکڑی کی طرف تھا، اس کی لکڑی کی شگاف میں اٹک گئی اور کیل وہاں سے نکل گئی، بندر درد و تکلیف سے بیہوش کر گر پڑا۔[126]

مذکورہ بالا عبارت کا جملہ و نـزع الـوتد یہاں پر قابل غور ہے۔ جب اس جملے کو سامنے رکھ کر دونوں ترجموں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہیں تو قواعد کے رو سے دونوں ترجمے مختلف نظر آتے ہیں۔ پہلے ترجمے میں و نزع کا ترجمہ بطور فعل متعدی کیا گیا ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں بطور فعل لازم۔ لغت سے رجوع کرنے کے بعد پہلے ترجمے کی تائید ہوتی ہے۔

نَزَعَ ینزِع نزْعاً (الشئ من مکانه): کسی چیز کو اس کی جگہ سے کھینچ کر نکالنا، اکھاڑنا۔[127]

لغت کے حوالے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نَـــزَعَ فعل لازم ہے نہ کہ متعدی اور دوسرے ترجمے میں اس کو لازم ہی استعمال کیا گیا ہے لہذا یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں مداخلت ہوئی ہے۔

اسلوب میں مداخلت

اسلوب یا طرز نگارش کی کوئی حتمی تعریف نہیں کی گئی ہے۔مختلف لوگوں نے الگ الگ تعریفیں کی ہیں اور سب نے اسلوب کا اطلاق الگ الگ پیش کیا ہے۔کسی نے اسلوب کو مصنف کی شخصیت کا مظہر بتایا ہے تو کسی کی نظر میں اسلوب سے مراد وہ منفرد انداز بیان ہے جس کے آئینے میں ہم مصنف کی شخصیت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔

ادب میں اسلوب سے مراد فن کار کے طرز تحریر کی انفرادیت یا الفاظ و جملوں کو فنی اعتبار سے برتنے کے سلیقے سے ہے۔اسلوب میں فن کارانہ اظہار،منفرد طریق اظہار اور تخلیقی ضابطہ وتوضیح جیسے عنصر موجود ہوتے ہیں۔تاہم اس کے ساتھ قوت اظہار اور پیرایہ بیان کی ندرت اور انفرادیت بھی جب تک شامل نہ ہو اسلوب کی تعریف مکمل نہیں ہوسکتی۔ادائے خیالات اور اظہار جذبات کا ڈھنگ بھی اسلوب کی تعریف میں آتا ہے۔ خیالات،احساسات ونظریات موضوعی چیزیں ہیں اس لیے ہر شخص کے سوچنے اور محسوس کرنے کا الگ انداز ہوتا ہے اور یہی مخصوص انداز آدمی کے لب ولہجہ میں انفرادیت پیدا کرتا ہے،اسی انفرادی طرز نگارش کی بنا پر ایک شخص دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔

اسلوب کی تشکیل میں مختلف عناصر شامل ہوتے ہیں:

1۔مصنف،2۔ماحول،3۔موضوع،4۔مقصد،5۔مخاطب

گویا اسلوب کے تعین میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ بات کون کہہ رہا ہے کس زمانے میں کہہ رہا ہے، کیا کہہ رہا ہے، کیوں کہہ رہا ہے، کس سے کہہ رہا ہے۔''بات کون کہہ رہا ہے'' سے مراد یہ ہے کہ انشاء پرداز کی علمی استعداد کیا ہے۔ادبی ذوق کیسا ہے۔ادب کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر کیسا ہے۔موضوع کا واضح تصور رکھتا ہے یا نہیں۔روایت کا اسیر ہے یا تجربہ پسند ہے۔مصنف جس کردار کی زبانی مکالمہ ادا کر رہا ہے اس کی کیا حیثیت ومقام ومرتبہ ہے۔''ماحول'' سے مراد اس عہد کی سیاسی،سماجی اور اقتصادی صورت حال ہے۔ نیز انشاء پرداز کی ذاتی زندگی کن حالات سے دوچار ہے۔مصنف اپنی انفرادیت کے باوجود اس سے صرف نظر نہیں کرسکتا۔''موضوع'' کا بھی اسلوب کی تشکیل میں بڑا ہاتھ ہے،موضوع کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے مثلاً

علمی، تاریخی، افسانوی، صحافتی، تدریسی وغیرہ۔ ہر موضوع جداگانہ اسلوب کا متقاضی ہوتا ہے جیسے کسی اخبار میں خالص علمی زبان نہیں اختیار کی جاسکتی، اسی طرح کسی سائنسی کتاب میں خالص ادبی زبان نہیں اختیار کی جا سکتی۔ اسلوب کی تشکیل میں ''مقصد'' کی بڑی اہمیت ہے جس کی خاطر انشاء پرداز اظہار خیال پر مجبور ہوا ہے۔ یہ مقاصد مختلف قسم کے ہو سکتے ہیں مثلاً قاری کو مرعوب کرنا، معقول کرنا، مطلع کرنا، متاثر کرنا، محظوظ کرنا وغیرہ۔ اسلوب کے عناصر ترکیبی میں آخری عنصر ''مخاطب'' ہے۔ مصنف کو مخاطب کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے یعنی جو مخاطب ہیں وہ کس طبقے کے ہیں، ان کی علمی استعداد کیا ہے، ذخیرۂ الفاظ کتنا ہے، ادبی ذوق کیسا ہے، رجحانات کیا ہیں، کون سا اسلوب ان کے ذہن ودماغ پر زیادہ اثر انداز ہوگا۔

اسلوب انتہائی متنوع چیز ہے۔ ہر فرد کا اپنا الگ اسلوب ہوتا ہے۔ اسلوب کی مدد سے ہی ہم ہر ادیب ومصنف کی شناخت کرنے پر قادر ہوتے ہیں مثلاً یہ آزاد کی نثر ہے، یہ حالی کی، یہ سرسید کی، یہ شبلی کی اور یہ مولانا مودودی کی۔ اس لیے اس کو محدود کرنا بہت مشکل ہے۔ طارق سعید انواع اسلوب پر مفصل بحث کرنے کے بعد اخیر میں لکھتے ہیں:

> ''مذکورہ بحث کے پیش نظر مغرب تا مشرق اسالیب کی کل اکیس متنازعہ فیہ قسمیں متعین ہوتی ہیں۔'' 128

اسلوب کی ترجمہ میں بڑی اہمیت ہوتی ہے کیوں کہ اسلوب کا اثر معنی پر بھی پڑتا ہے۔ اسلوب کے بدلنے سے معنی کے بدل جانے کا امکان ہوتا ہے:

> That is, in today's studies, style is viewed as a part of meaning and affects it in different ways and to different degrees. so, a change of style means a change of meaning of some kind. 129
>
> (موجودہ مطالعات میں اسلوب کو معنی کے ایک جز کے طور پر دیکھا جارہا ہے اور یہ مختلف طریقوں سے مختلف سطح پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لہذا اسلوب میں تبدیلی کا مطلب ہے کسی حد تک معنی میں تبدیلی)

ترجمہ میں اسلوب کی منتقلی ترجمہ کے انتہائی دشوار گزار مراحل میں سے ایک ہے۔ اسی مشکل کے باعث بعض لوگوں نے تو ترجمہ کو ہی نا قابل عمل قرار دے دیا۔ پروفیسر رشید امجد سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''کیا اسلوب کی خوبصورتی اور دبازت کو دوسری زبان میں منتقل کیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں؟'' 130ؔ

مترجم کو اسلوب کی رعایت کرنی ہی پڑتی ہے اور اس رعایت کے لیے تغیر و تبدیلی کے عمل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے فارسی ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں ترجمہ کے متعلق جو اصول بیان کئے ہیں ان میں ایک اسلوب کے متعلق بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دونوں زبانوں میں موجود مختلف انداز و اسلوب کی وجہ سے ترجمہ کرتے وقت اگر مجبوراً ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف لانا پڑے تو کوئی حرج نہیں۔'' 131ؔ

اسلوب کی تشکیل کا آغاز متبادلات کے انتخاب سے شروع ہوتا ہے۔ ایک ہی جملے کو ہم مختلف طریقوں سے ادا کر سکتے ہیں مثلاً انگریزی کا جملہ ہے He died، اس کے کئی متبادلات ہو سکتے ہیں: مر گئے، سدھار گئے، رحلت فرما گئے، کوچ کر گئے، وفات پا گئے، اس دنیا میں نہیں رہے، ابدی نیند سو گئے، اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی وغیرہ وغیرہ۔ مصنف اسلوب کے تشکیلی عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان میں کسی ایک کو منتخب کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ جملوں کی ترتیب بھی اسلوب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

ہر زبان کا اپنا مزاج ہوتا ہے کسی زبان میں جذباتیت ہوتی ہے، کسی میں ملائمت، کسی میں روکھا پن وا کھڑ پن، کسی میں منطقیت ہوتی ہے۔ زبان کے اس مزاج کا اثر اس زبان میں لکھی جانے والی تحریروں اور ان کے اسلوب بھی پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر جس زبان میں ملائمت زیادہ ہوگی اس کے اندر پائے جانے اسالیب میں یہ کیفیت زیادہ ہوگی (ہر زبان میں مختلف صفات ہوتی ہیں لیکن بات غالب رجحان کی ہو رہی ہے) اب اگر اس زبان کی تحریروں کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں کیا جائے جس میں اکھڑ پن پایا جاتا ہے تو مترجم کے سامنے دشواری تو پیش آئے گی۔ اسے اپنی زبان کی رعایت ہر حال میں کرنی ہی پڑے گی۔ مرزا حامد بیگ لکھتے ہیں:

''بعض زبانوں میں تجریدی افکار اور تجریدی طریقۂ کار کو اپنے اندر سمونے کی

صلاحیت ہوتی ہے اور وہ دقیق اور نازک سے نازک بحث کے لیے معنی خیز اور
موزوں الفاظ، تراکیب اور اسالیب پیدا کرسکتی ہیں، جب کہ بعض تجرید کی
صلاحیت سے محروم ہوتی ہیں۔ ایسی زبانوں میں موزوں اور متناسب اظہاری
سانچے اور اسالیب پیدا کرنا خاصا دشوار ہوجاتا ہے۔"[132]

اسی طرح ترجمہ میں اسلوب کے عناصر تشکیلی تقریباً تبدیل ہوجاتے ہیں۔ مصنف کی جگہ مترجم آجاتا ہے۔ جس طرح ہر مصنف کا خاص مزاج، کیفیت، تجربہ، علمی استعداد، نظریہ، فہم و ادارک کی سطح، معاشرت، ثقافت مختلف ہوتی ہے اسی طرح مترجم میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے جو اکثر و بیشتر مصنف سے مختلف ہوتی ہے۔ اس اختلاف کا اثر ہمیں بالکل واضح انداز میں ترجموں میں نظرآتا ہے۔ ایک ہی متن کا ترجمہ جب مختلف افراد کرتے ہیں تو ہر ایک کا ترجمہ مختلف ہوتا ہے۔

مصنف تخلیق متن کے وقت اپنے قارئین کی رعایت سے اسلوب نگارش اختیار کرتا ہے اور جب مترجم اپنے قارئین کا لحاظ کرے گا (جو کہ کسی نہ کسی حد تک کرنا ہی ہے) تو اسے اسلوب کو اپنے قارئین کی استعداد، صلاحیت و تقاضے کے مطابق تبدیل کرنا پڑے گا۔ مترجم کو اس ماحول کی بھی رعایت کرنی پڑے گی جس کے لیے وہ ترجمہ کررہا ہے۔ اس کی پاسداری کے لیے وہ ہدفی زبان کے اسلوب سے قریب تر رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ اس کی یہ کوشش کئی مرتبہ مداخلت کا سبب بھی بنتی ہے۔

فمن ضيّع شيئاً من هذه الأحوال لم يُدرك ما أراد من حاجته، لأنه
ان لم يكتسب لم يكن له من مال يعيش به، وان هو كان ذا مال
واكتساب ثم لم يُحسن القيام عليه أوشك المال أن يَفنى و يبقىٰ
معدماً. و ان هو وضعه و لم يستثمره لم تمنعه فلة الانفاق من سرعة
الذَّهاب، كالكحل الذي لا يؤخذ منه الا غبار المِيل، ثم هو مع ذالك
سريعٌ فناؤه. و ان أنفقه في غير وجهه، ووضعه في غير موضعه، و
أخطأ به مواضع استحقاقه صار بمنزلة الفقير الذي لامال له ثم لا
يمنع ذلك ماله من التلف بالحوادث والعلل التي تجري عليه.[133]

جوشخص ان چیزوں میں سے کسی ایک کوبھی ضائع کردے گا تو وہ اپنے مقصد اور مراد کی تکمیل نہیں کرسکتا، کیوں کہ اگر وہ کمائے گا نہیں تو اس کے پاس مال نہیں رہے گا جس سے وہ اپنی گزر بسر کرسکے، اور اگر اس کے پاس مال ودولت ہو لیکن وہ اس کی حفاظت ونگہداشت نہ کرے تو بہت جلد اس کا مال ختم ہو جائے گا اور وہ فقیر وقلاش ہو کر محتاجگی کی زندگی گزارے گا، اور اگر مال کو یونہی حفاظت کے ساتھ رکھے رہے اور سرمایہ کاری کر کے اس میں بڑھوتری کی کوشش نہ کرے تو چاہے وہ اس کو تھوڑا تھوڑا خرچ کرے پھر بھی وہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا، جیسے سرمہ ہے کہ اگر سلائی کے ذریعے سرمہ دانی سے تھوڑا تھوڑا سرمہ لیا جائے تو بھی وہ کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گا، اور اگر وہ مال کو غلط جگہ خرچ کرے گا اور صحیح جگہ خرچ نہ کرے گا تو اس کی پوزیشن آخر کار فقیر کی سی ہو جائے گی، کیونکہ جو حوادث اور بیماریاں اس پر طاری ہوں گی ان میں بھی اس کا مال خرچ ہوگا، نتیجہ یہ ہوگا کہ جب وہ غلط جگہ بھی خرچ کرے گا اور حوادث وامراض میں اس کا مال خرچ ہوگا ہی تو اس کا مال بہت جلد ختم ہو جائے گا۔134؎

مترجم نے اپنے ماحول اور متخیلہ ہدفی قارئین اور اردو زبان کے اسلوب کی مکمل رعایت کرتے ہوئے ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اب ایک اور ترجمہ ملاحظہ کرتے ہیں:

جوشخص ان چیزوں کی رعایت نہیں کرتا وہ اپنی ضرورت کو نہیں پاسکتا؛ چونکہ اگر کمائے گا نہیں اور اس کے پاس زندگی گذارنے کے لیے مال نہیں ہوگا، اگر وہ مالدار اور صاحب ثروت ہو بھی؛ لیکن اس کی صحیح حفاظت ونگرانی نہ کرتا ہو تو وہ بجلد ختم ہو جائے گا اور وہ فقیر اور محتاج ہو جائے گا، اگر وہ مال کو یوں ہی رکھے، بڑھائے نہیں، تو کم خرچ بھی مال کو جلد ختم ہونے سے نہیں روکے گا، اس سرمہ کی طرح جس سے سلائی کو لگے ہوئے کی مقدار میں لیا جاتا ہے، اس کے باوجود بھی وہ جلد ختم ہو جاتا ہے، اور اگر وہ اسے غیر مصرف اور غلط جگہوں میں خرچ کرتا ہے، اس کے خرچ کرنے کی جگہوں سے چوک جاتا ہے تو وہ اس فقیر کی مانند ہو جاتا ہے جس

> کے پاس کوئی مال نہیں ہوتا، پھر یہ اسے جو کچھ اس کے پاس ہے اس کو اس پر
> گذرنے والے حادثات اور پریشانیوں سے برباد ہونے سے نہیں روکتا۔135؎

مذکورہ بالا دونوں ترجموں کے بیک نظر سرسری مطالعہ سے بھی دونوں کے اسلوب میں بہ آسانی فرق محسوس کیا جاسکتا ہے۔ پہلے ترجمے میں ہدفی زبان کے اسلوب کو ملحوظ رکھا گیا ہے جب کہ دوسرے ترجمے میں اصل متن کے اسلوب اور ہدفی زبان وقارئین کے لیے مطلوب اسلوب دونوں کی آمیزش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مداخلت کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو پہلے ترجمے میں مداخلت زیادہ ہوئی ہے اور دوسرے میں اس کے مقابلے میں کم۔

اسلوب کی تشکیل میں موضوع کو بڑا دخل ہے۔ مختلف موضوعات کے لیے الگ الگ اسالیب بیان اختیار کئے جاتے ہیں۔ موضوع تو اصل اور ہدفی دونوں زبانوں میں یکساں ہی رہے گا لیکن تمام موضوعات تمام زبانوں میں ایک ہی طرح بیان نہیں کئے جاتے۔ بیان موضوع میں اختلاف کی ایک اہم وجہ ڈسکورس بھی بنتا ہے۔ موضوع گرچہ ایک ہو لیکن اگر ہدفی زبان میں اس کے تئیں جدا ڈسکورس ہو تو بہر حال مترجم کو اس ڈسکورس کی رعایت کرتے ہوئے اسلوب نگارش میں تبدیلی وتغیر کرنا ہی پڑے گا۔

تقریباً ہر متن کی تیاری کے پس پشت کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ منشائے مصنف کے اعتبار سے اسلوب اختیار کیا جاتا ہے؛ لیکن ضروری نہیں کہ ترجمہ کے وقت بھی وہی مقصد ہو۔ مثال کے طور پر مصنف نے اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کے لیے پرجلال اسلوب اختیار کیا۔ مترجم کا مقصد قارئین کو مرعوب کرنے بجائے اس تحریر میں سموئے ہوئے علمی خزانے سے اپنے قارئین کو مطلع کرنا ہو تو وہ پرجلال اسلوب تو نہیں اختیار کرسکتا۔

طرز نگارش کے انتخاب میں سب سے زیادہ اہمیت قارئین یا مخاطب کی ہوتی ہے۔ قارئین کی علمی استعداد، سطح فہم وادراک، ذہنی کیفیت، رجحانات وغیرہ کے حساب سے ہی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر عرب قارئین کے سامنے کوئی تحریر یا تقریر پیش کرنی ہو تو خطیبانہ اسلوب بھی اختیار کیا جاسکتا ہے لیکن انگریزی قارئین اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ مترجم کو بھی اسی مشکل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مترجم کے قارئین تو بہر

صورت اصل قارئین سے مختلف ہوں گے۔مصنف نے اپنے قارئین کی رعایت کرتے ہوئے خطیبانہ اسلوب بیان اختیار کیا تھا تو مترجم کو اس اسلوب نگارش میں ذرا نرمی لانی پڑے گی۔

ان تمام عناصر کی آمیز سے جو ترتیب وانتخاب الفاظ کا جوڈھب وجود میں آتا ہے اسی کو اسلوب سے تعبیر کیا جاتا ہے یا کیا جاسکتا۔کوئی بھی مصنف ہو یا مترجم وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان باتوں کا لحاظ ضرور کرتا ہے۔اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس کے ذہن کی ساخت کچھ اس انداز سے ہوتی ہے اور اس کا لاشعور اس طرح پروان چڑھا ہوتا ہے کہ جب بھی وہ لکھتا یا بولتا ہے تو اس سے ان چیزوں کی رعایت جھلکتی ہے۔مترجم کا اپنا ذہن اور قارئین کا مزاج دونوں کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔اس کو ہم ایک مثال کے ذریعے دیکھتے ہیں۔مختارات من ادب العرب کی ایک عبارت ہے:

"أتيتنا مكذباً فصدقناك، و مخذولاً فنصرناك، وطريداً فآويناك، و عائلاً فواسيناك"۔[136]

مبشرات فی حل مختارات میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے:

''اے محمد ﷺ تو ہمارے پاس اس حال میں آیا کہ لوگوں نے تیری تکذیب کی اور ہم نے تیری تصدیق کی اور تو بے سہارا و بے یار و مددگار تھا ہم نے تیری امداد کی اور دھتکارا ہوا تھا ہم نے تجھے ٹھکانہ دیا اور تو فقیر تھا ہم نے تیری غم خواری کی۔[137]

یہ ترجمہ مکمل طور پر اصل متن سے ہم آہنگ ہے۔اس میں واحد حاضر کے لیے تو اور پھر اس کی ضمیر تیری کا استعمال کیا گیا ہے لیکن ظاہر سی بات ہے کہ یہ ترجمہ اصل سے مطابق ہونے کے باوجود جب ہم اس کی قرأت کرتے ہیں تو کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس کا ذکر کا یہ اسلوب ہمارے یہاں مروج نہیں ہے۔عربی زبان کے مزاج اور اسلوب میں کسی قسم کی گرانی محسوس نہیں ہوتی لیکن اردو زبان میں گرانی ہوتی ہے۔چنانچہ اس کا ایک اور ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''آپ ہمارے پاس اس حال میں آئے کہ آپکی تکذیب کی گئی تھی ہم نے آپ کی تصدیق کی، آپ کی قوم نے آپ کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ

کی مدد ونصرت کی، آپ دھتکار دیے گئے تھے ہم نے آپ کو پناہ دی، آپ
ہمارے پاس مفلس ہوکر آئے تھے ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی''۔138؎

مابعدالذکر ترجمہ اردو زبان کے اسلوب سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔اس میں تو اور تیری کے بجائے آپ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ جمع اور تعظیم دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔مترجم نے اپنی زبان کے اسلوب کی رعایت کرتے ہوئے اصل متن کے اسلوب میں مداخلت سے کام لیا ہے۔

اسلوب کی تشکیل اوراس کے تجزیہ میں مخاطِب یعنی بات کرنے والے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔اس کا مقام ومرتبہ، اس کی حیثیت، اس کی لیاقت، اس کے کا کردار، اس کی تعلیمی وذہنی سطح، بات کرنے کا موقع ومحل، اس کا مذہب سب اہمیت رکھتے ہیں۔مصنف اوراسی کی اتباع میں مترجم کو یہ لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ کون سا کردار کون سا لفظ ادا کرسکتا ہے اورکون سا لفظ مناسب موقع وکردار نہیں ہے۔ایک ان پڑھ، گنوار سے کسی پروفیسر کی زبان نہیں بلوائی جاسکتی ہے۔اسی طرح مذہب کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔کچھ الفاظ اور جملے ایسے ہوتے ہیں جو کسی مخصوص مذہب کی علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سلام کرتا ہے تو تقریباً صد فیصد یہ تصور کیا جاتا ہے کہ یہ شخص مسلمان ہے۔بعض الفاظ تو ایسے ہوتے ہیں جو عقیدے کی بنیاد ہوتے ہیں۔ ایسے الفاظ میں اشتباہ پیدا ہونے سے اسلوب متاثر ہوتا ہے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔

عربی کا ایک ڈرامہ ہے 'الأسير الكريم" خبيب بن عدي'۔کہانی یوں ہے کہ ایک کافر فیملی خبیب بن عدی جو کہ مسلمان اور صحابی رسول ہیں ان کو گرفتار کرلیتی ہے۔دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں اور پھراس کے ترجمے پر غور کریں:

عامر: أدخله المربد فحبسه فيه. يقولون انه من أصحاب محمد.

جليلة: من أصحاب محمد..ماالذي جاء به الى خالك؟139؎

ان دونوں جملوں کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے۔

عامر: اصطبل میں اسے قید کردیا ہے۔وہ کہتے ہیں یہ محمد ﷺ کے صحابیوں میں سے ہے۔

جلیلہ: (انتہائی حیرت اور تعجب کے انداز میں کہتی ہے) اصحاب محمد ﷺ میں سے؟ اور وہ تمہارے ماموں کے ہاتھ کیسے لگا؟ 140ء

یہ بات ذہن نشین رہے کہ مذکورہ دونوں کردار عامر اور جلیلہ حالت کفر میں یہ جملے ادا کر رہے ہیں۔ عامر قیدی کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ محمد ﷺ کے صحابیوں میں سے ہیں۔ جلیلہ اس پر حیرت کے انداز میں سوال کرتی ہے کہ اصحاب محمد ﷺ میں سے؟ مصنف نے اپنی عبارت میں درود نہیں لکھا اور کردار اسی کا متقاضی بھی تھا لیکن مترجم نے اس کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے یا عقیدتاً درود لکھا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ ایک کافر حضور ﷺ پر درود کیسے بھیج سکتا ہے وہ بھی ایسی صورت میں جب گفتگو کا محور حضور ﷺ اور مسلمانوں سے دشمنی ہو۔ أصحاب محمد کا ترجمہ محمد ﷺ کے صحابی سے کیا گیا ہے جب کہ صحابی خالص اسلامی اصطلاح ہے۔ مترجم کا یہ سہو یا اغماض اسلوب کے اندر کھلی ہوئی مداخلت ہے۔

ہر زبان کا اپنا مخصوص اسلوب بھی ہوتا ہے۔ ایک ہی بات الگ الگ زبانوں میں مختلف انداز سے کہی جاتی ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے بھی ترجمے میں مداخلت ہوتی ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مترجم کے پاس اور کوئی راستہ ہوتا ہی نہیں۔ یا اگر امکان ہوتا بھی ہے تو مترجم ہدفی زبان کے اسلوب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ بطور مثال ایک ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

جليلة: (في غيظ) ويلك، تُضرَبُ وتقول الحمد لله. أ هكذا أمركم صاحبكم محمد؟

خبيب: أجل يا أخت بني الحارث. ان نبينا ﷺ أوصانا بالصبر على ما نلقى في ديننا من مكروه.

خبيب: يا أخت بني الحارث لو قد سمعت من محمد كما سمعنا ماقلت هذا. أتحبين أن أسمعك شيئاً مما جاء به من عند الله؟ 141ء

آئے اب کا ترجمہ دیکھتے ہیں:

جلیلہ: (غصے کی حالت میں) تمہیں موت آئے، مار کھاتے ہو اور الحمد للہ کہتے جاتے ہو،

کیا تمہارے رسول ﷺ نے تمہیں یہی سکھایا ہے؟

خبیبؓ: (انتہائی اطمینا کے ساتھ) ہاں بہن! ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہمیں دین کی راہ میں پہنچنے والی مصیبت کے وقت صبر کرنے کی نصیحت فرمائی ہے۔

خبیبؓ: اے بہن! کاش تم نے بھی نبی ﷺ سے سنا ہوتا جو ہم نے سنا ہے۔(جیسے رسول اللہ ﷺ سے کلام سننے کی حلاوت اس وقت محسوس کرر ہے ہوں) کیا وہ آپ سننا پسند کریں گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے؟142

مصنف نے حضرت خبیبؓ کی زبانی دونوں جملوں میں جو الفاظ ادا کرائے ہیں وہ ہے'' أخت بني الحارث ''لیکن مترجم نے دونوں جملوں میں اس کا ترجمہ کیا ہے''بہن''۔صرف ترجمے کو پیش نظر رکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ خبیبؓ جلیلہ کو اپنی بہن کہہ رہے ہیں جب کہ اصل متن کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ انہوں بنی الحارث کی بہن کہا ہے۔مترجم کو ترجمے میں مداخلت سے کام لینا پڑا کیوں کہ اردو اور عربی کا اسلوب جدا ہے۔اردو میں اس طرح مخاطب نہیں کیا جاتا۔اس کی ایک اور مثال ملاحظہ کریں:

أبوذر: ويحك يا فتى ، ان النبي ﷺ قال: (ليس مسكين بهذا الطواف الذي يطوف على الناس فترده اللقمة واللقمتان والتمرة و التمرتان، انما المسكين التعفف، اقرئوا ان شئتم: ﴿لا يسألون الناس الحافاً﴾)و سمعته ﷺ يقول: (و ما يزال الرجل يسأل الناس حتى يأتي يوم القيامة و ليس في وجهه مزعة لحم)۔

ثعلبة: ويحك يا أباذر تريد أن تتنصل بهذا من عطائي۔143

اس کا ترجمہ کچھ یوں کیا گیا ہے:

ابوذرؓ: سن اے نوجوان، نبی ﷺ فرماتے ہیں۔مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے گھروں کا چکر لگا کر روٹی کے چند نوالے اور گنتی کی چند کھجوریں مانگتا ہے، بلکہ مسکین وہ جس کے بارے میں قرآن حکیم ارشاد کرتا ہے﴿لا يسألون الناس الحافاً﴾

(مگر وہ لوگ ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں)۔اور میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلانے والا جب قیامت کے دن حاضر ہوگا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔

ثعلبہ: عجیب۔ابوذرؓ؟ کیا آپ مجھے خیرات نہیں دینا چاہتے جو یہ باتیں سنانی شروع کردیں؟144

مذکورہ بالا دونوں جملوں کے ابتدائی الفاظ موضوع گفتگو ہیں۔ پہلے جملے کے شروع میں ہے وَيُحَكَ يَـا فَتَىٰ اور جب ثعلبہ کا مکالمہ شروع ہوتا ہے تو اس کے بھی ابتدا میں ویحك کا ہی لفظ ہے۔مترجم نے پہلے جملے میں ترجمہ کیا ہے''سن اے نوجوان''اور دوسرے میں''عجیب''۔عربی زبان میں یہ لفظ عام ہے،کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔اس کا معنی ہے:

ویـــــح :رحم دردمندی کا کلمہ،تعریف وتعجب اور ویل کے معنی میں بھی آتا ہے۔
ویحٌ لـه و ویحاً له و ویحه :اس بیچارے کا کتنا برا حال ہے یا وہ کتنا بد بخت ہے،وہ بہت خوب ہے،اس کا ناس ہو،اس کا بیڑہ غرق ہو۔145

لغت میں مذکور معنی کی روشنی میں دیکھیں تو دوسرے جملے میں جو'عجیب' کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ قدرے ٹھیک ہے لیکن پہلے جملے میں 'سن اے نوجوان' موزوں نہیں ہے۔ بنیادی طور پر اسے معنوی فرق کے بجائے اسلوب کے نظریے سے دیکھنا چاہیے۔ دراصل یہ ایسا لفظ جو عربی زبان میں دوران گفتگو بہ کثرت بولا جاتا ہے۔اردو زبان کے اسلوب کے مطابق اس کو اپنے مزاج سے تبدیل کرتے ہوئے مترجم کو مداخلت کرنی ہوگی۔اس کا ترجمہ خدا تم پر رحم کرے، خدا غارت کرے،تمہارا ناس ہو،تمہارا بیڑا غرق ہو جیسے جملوں میں حسب موقع کیا جاسکتا ہے۔ایسے الفاظ کے ترجمے میں اسلوب کی تفریق کی وجہ سے مداخلت کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں ہوتا ہے؛ بلکہ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مداخلت ہی ترجمے کو قابل قبول بناتی ہے۔ظاہر ہے اس قسم کی مداخلت سے معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق واقع ہونے کا امکان نہیں ہوتا ہے۔

جب کوئی بات بولی یا لکھی جاتی ہے یا جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو اس کا ایک بنیادی مقصد یہ

ہوتا ہے کہ وہ قابل رسا ہو۔ قاری یا سامع اس بات کو سمجھ سکے۔ کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ بہ آسانی سمجھ سکے لیکن بسا اوقات موضوع وغیرہ عوامل کی وجہ گفتگو کسی قدرے پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ ہاں لیکن ایسا نہیں ہوتا کہ بالکل ہی نا قابل فہم بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس عمل سے مقصد بھی متاثر ہوگا اور مخاطب بھی نظر انداز ہو جائے گا۔ اس کی ایک مثال دیکھتے چلیں:

أبوذر: اعمل أى شئ و لو أن تختطب فانى سمعت رسول الله ﷺ يقول: (لأن يأخذ أحدكم حبله ثم يأتي الجبل فيأتي بحزمة من حطب على ظهره فيبيعها فيكف الله بها وجهه خير له من أن يسأل الناس أعطوه أو منعوه)۔146

پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ نے اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

ابوذرؓ: جو کام بھی ملے وہ کرو۔ چاہے لکڑیاں کاٹ کر بیچنی پڑیں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے: لأن يأخذ أحدكم حبله ثم يأتي الجبل فيأتي بحزمة من حطب على ظهره فيبيعها فيكف الله بها وجهه خير له من أن يسأل الناس أعطوه أو منعوه۔147

مذکور بالا جملے کے اجزا میں ایک میں ابوذرؓ خود اپنی بات عرض کر رہے ہیں اور دوسرے میں وہ اپنی بات کی تائید کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا قول نقل کر رہے ہیں۔ مترجم نے دوسرے جز کا ترجمہ کرنے کے بجائے وہ قول ہی نقل کر دیا ہے۔ یہ عربی عبارت اردو قاری کے لیے نا قابل فہم ہے اور جب بات ہی نہ سمجھ آئے تو ترسیل و ابلاغ کا عمل ہی نہیں ہوگا جو کہ کسی بھی تقریر و تحریر کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ اردو زبان میں یہ اسلوب قدیم مذہبی تحریروں میں تو نظر آتا ہے؛ لیکن اب اس رواج متروک ہو چکا ہے۔ عربی یا دوسری زبان کی عبارت کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی نقل کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ الا یہ کہ کوئی ایسا جملہ ہو جو عام طور پر سمجھا جاتا ہو یا بہت معروف ہو۔ مذہبی تحریروں علاوہ ادبی تحریروں بالخصوص ڈرامے میں یہ چیز بالکل بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی؛ کیونکہ یہاں تو سامعین و ناظرین سے براہ راست مخاطب ہونا ہوتا ہے۔ ڈرامہ کی اصل ہی یہ ہے کہ اس کو اسٹیج

کیا جا سکے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ طرزِ تحریر اردو زبان کے اسلوب سے ہم آہنگ نہیں۔ مترجم نے اردو قاری و سامع کو مدِ نظر نہیں رکھا۔

مترجم کا یہ عمل قدرے حیرت میں مبتلا کرتا ہے؛ کیونکہ اس سے چند مکالمے پہلے میں ہی ایسی صورت حال تھی۔ وہاں کردار کی زبانی ایک حدیث اور قرآن کی ایک آیت مذکور ہے۔ مترجم نے وہاں یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ حدیث کا ترجمہ کر دیا اور قرآن کی آیت نقل کرنے کے بعد قوسین میں اس کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لیے مندرجہ بالا اقتباس سے ماقبل کا اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

اس طرزِ اظہار کی ایک اور مثال شعری ترجمے سے ملاحظہ کریں:

أتهـــزأُ بـــاالـــدعـــاء و تـــزدريـــه

ومـــا تـــدري بـمـــا صـنـــع الـدعـــاءُ

سِهـــامُ الـلـيـلِ لا تُـخـطِـي ولٰـكـن

لهـــا أمـــدٌ ولـــلأمـــد انـــقـضـــاءُ

تو دعا کا مذاق اڑاتا ہے اور اسکو حقیر سمجھتا ہے تجھے کیا معلوم کہ دعا کیا اثر رکھتی ہے؟

(دعا) بے خطا سہام لیل ہیں ہاں مگر اسکی میعاد ہے اور ہر میعاد پوری ہو کر رہتی ہے۔148؎

جب ان اشعار کے ترجمے پر غور کرتے ہیں تو دوسرے شعر کے پہلے مصرعے کا ترجمہ کچھ غیر مانوس اور ناقابلِ مفہوم لگتا ہے۔ مترجم نے اصل عبارت میں مذکور ترکیب کو اردو کا لباس پہنا کر ترجمے میں استعمال کر دیا۔ یہ ترکیب عوام الناس تو کجا اچھے خاصے اردو داں کے لیے بھی اجنبی اور ناقابلِ مفہوم ہے۔ اس ترجمے سے معنی و مفہوم کے ساتھ اردو زبان کا اسلوب بھی متاثر ہوا۔ یہی کیفیت ایک اور شعر کے ترجمے میں پائی جاتی ہے۔

غنيٌ بلا مال عن الناس كلِّهمُ   وليس الغنىٰ الا عن الشئ لا به

اب میں مالدی کے بغیر بھی سب لوگوں سے بے پرواہوں اور اصل غنیٰ مال سے نہیں اعراض عن المال سے حاصل ہوتا ہے۔149؎

دوسرے مصرے کے ترجمے میں اردو اور اہل اردو کے لیے بالکل نامانوس عربی ترکیب 'اعراض عن المال' کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے استعمال سے تفہیم و ترسیل معنی پر کافی اثر پڑا ہے۔ جو شخص عربی سے واقف نہ ہو اس کے معنی کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔

اسلوب کا ایک جز لہجہ بھی ہے۔ کسی تحریر و تقریر کا اسلوب نگارش، اسلوب بیان، پیرایہ اظہار بہت معنی رکھتا ہے۔ دراصل جب کوئی اسلوب تشکیل پا جاتا ہے تو اس سے ایک لہجہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ لہجہ بایں معنی کلی اور جزوی ہوتا ہے کہ ایک لہجہ پوری تحریر کو حاوی ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریر کا موڈ کیا ہے۔ جزوی اس طور پر کہ ہر پیراگراف یا جملہ کا بھی لہجہ ہوتا ہے۔ ترجمے میں بھی لہجہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے؛ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ترجمے میں لہجے کی منتقلی مترجم کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مترجم کو لہجے کی شناخت اور پھر اس کی بازیافت دہری ذمے داری ادا کرنی ہوتی ہے۔ مترجم کبھی اس منزل کو سر کر لیتا ہے اور کبھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لہجہ یا لہجے کے فرق کو بیان کرنے سے زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کسی بھی تحریر یا تقریر کو پڑھنے یا سننے کے بعد قاری یا سامع کے ذہن پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے؛ یہ کیفیت لہجے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ لہجے کے فرق کو ایک ترجمے سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

> وكـان هـذا الأسـد منـفـرداً بـرأيـه دون أخذ بـرأي أحد من أصحابه۔150

خورشید انور ندوی نے اس جملے کا ترجمہ کیا ہے:

> یہ شیر خود رائے تھا، اپنے درباریوں میں سے کسی کی رائے اور مشورہ کو اختیار نہیں کرتا تھا۔151

اسی جملے کا ترجمہ رفیع الدین حنیف نے کچھ اس انداز سے کیا ہے:

> یہ شیر تنہا اپنی رائے کا مالک تھا، اسے اپنی [اپنے] کسی ساتھی سے رائے لینے کی ضرورت نہ تھی۔152

دونوں ترجموں کا بغور مطالعہ کرنے اور اصل سے تقابل کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ الفاظ کے انتخاب اور محل استعمال سے دونوں کے لہجے الگ الگ کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ پہلے ترجمے سے یہ کیفیت برآمد ہو رہی ہے کہ شیر کے ساتھی یا درباری اسے رائے دیتے تھے لیکن وہ ان کی رائے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا۔اس جملے سے شیر کے رویے میں خودسری اور منفیت جھلکتی ہے۔اس کے برعکس دوسرے ترجمے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیر رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے میں اس مقام کو پہنچا ہوا تھا کہ اسے کسی اور کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر اصل سے تقابل کرتے ہیں تو اول الذکر ترجمہ اصل عبارت کے لہجے سے قریب اور ہم آہنگ نظر آتا ہے؛ گویا دوسرے جملے میں اسلوب کے اعتبار سے مداخلت سے کام لیا گیا ہے۔

اصناف میں مداخلت

ہر زبان میں یکساں اصناف سخن کا ہونا ضروری نہیں ہے مثلاً اردو میں افسانہ، داستان، قصہ، غزل، نظم، رباعی، مرثیہ وغیرہ جیسی اصناف موجود ہیں تو دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی یہ اصناف موجود ہوں ایسا ہونا لازم نہیں ہے۔ ہو بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ زبان میں اصناف کی تعداد میں کمی و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کمی اس اعتبار سے کہ ہر زمانے میں اصناف سخن کا مذاق بدلتا رہتا ہے۔ کسی عہد میں لوگ کسی خاص صنف کو پسند کرتے ہیں اسے استعمال کرتے ہیں پھر بعد کے ادوار میں کوئی نئ صف یا دوسری صنف کا رواج عام ہونے لگتا ہے تو پہلی صنف کی مقبولیت میں رفتہ رفتہ کمی ہو جاتی ہے حتی کہ وہ آہستہ آہستہ زوال پذیری کی منزل میں داخل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے اصناف شعر میں ریختی بھی شامل تھی، بہت سے شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی؛ لیکن بعد کے زمانے میں اس کا استعمال تقریباً معدوم ہو گیا۔ یہی معاملہ قصیدہ کا بھی رہا کہ درباروں اور شاہوں کے خاتمے کے ساتھ قصائد کا دور بھی ختم ہو گیا؛ حتی کہ اب شخصی قصیدے بھی نہیں نظر آتے۔

اصناف میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا میں اردو میں ناول، ناولٹ وغیرہ اصناف کا وجود نہیں تھا بعد کے ادوار میں ان کا اضافہ ہوا۔ اصناف میں اضافہ کا سبب عام طور پر ترجمہ و تلخیص ہی ہوتا ہے۔ دوسری زبان میں موجود اصناف کو اپنی زبان میں برتنے کوشش کی جاتی ہے اور پھر وہ زبان کے مزاج میں ڈھل کر دیگر اصناف ہی کی طرح جزو زبان بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو میں ناول، افسانہ، آزاد نظم، نظم معرا، نثری نظم وغیرہ جیسی اصناف کی آمد ترجموں کے ذریعہ ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی روایت مضبوط ہوتی گئی۔ اس وقت ناول و دیگر اصناف اسی طرح اردو زبان کا حصہ ہیں جس طرح داستان ہے۔ ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اصناف کی آمد و قبول میں زبان کے مزاج کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر کوئی صنف زبان کے مزاج کے موافق یا ہم آہنگ نہیں ہوتی تو لاکھ کوشش کی جائے زبان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور وہ صنف زبان کا جزو خاص نہیں بن پاتی۔ مثلاً ناول اردو زبان کی مزاجی کیفیت سے ہم آہنگ تھا لہذا وہ زبان کے اندر سما گیا لیکن ہائیکو، نثری نظم وغیرہ اردو کے لسانی مزاج سے اختلاف کے باعث اردو میں رواج نہ پا سکیں۔

ترجمہ کے عمل کے دوران مترجم کو اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ کس صنف کا ترجمہ کر رہا ہے کیوں کہ ہر صنف کے اپنے تقاضے، لوازمات، صفات، عناصر ترکیبی، اسلوب و ترکیب ہوتی ہے۔ ناول کی خصوصیات افسانہ سے جدا ہوں گی، افسانہ کی ناولٹ سے، ناولٹ کی انشائیہ سے، انشائیہ کی رپورتاژ سے۔ اگر مترجم جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اس میں یہ اصناف سخن موجود ہیں تو بہت زیادہ دشواری نہیں ہوتی، صرف لسانی، سماجی، ثقافتی عناصر و اجزا کے ترجمہ کے وقت مشکل ہوتی ہے۔ بقیہ صنف کی جو صفات ہیں اس میں بہت کچھ مماثلت میسر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ناول میں پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ وغیرہ اردو اور انگریزی دونوں میں ہی ہوگا۔ رپورتاژ کے جو تقاضے انگریزی میں ہوں گے وہی اردو میں بھی ہوں گے۔

اصل مشکل اور دشواری اس وقت پیش آتی ہے جب مترجم کی زبان میں وہ صنف ہی موجود نہیں ہوتی ہے۔ مثال کے طور کسی زبان میں ناول جیسی کسی صنف کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اس زبان میں اگر کسی ناول کا ترجمہ کرنا پڑے تو مترجم کے سامنے دو راستے ہوں گے۔ ایک یہ کہ وہ اسی صنف یعنی ناول کی تمام صفات کو برتنے کی کوشش کرے لیکن اس صورت میں یہ مشکل پیش آئے گی کہ اگر اس زبان میں ناولوں کے تراجم نہیں ہوئے اور یہ اولین ترجمہ ہے تو مترجم ان تمام صفات کو برت ہی نہیں سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہدفی زبان کی لسانی ساخت اس کے لیے بالکلیہ موافقت کرے، ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ دوسرے یہ کہ ہدفی قارئین کے لیے بالکل اجنبی چیز ہوگی، وہ اس کی طرف کس حد تک متوجہ ہوں گے یہ قابل غور بات ہے۔ اس لیے اسے کسی نہ کسی حد تک اپنے، اپنے قارئین اور زبان کے مزاج کا لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ اس صنف کا ترجمہ اپنی زبان میں اس سے ملتی جلتی یا قریبی صنف میں یا اس صنف سے قریب قریب کرے۔ اگر ہدفی زبان میں کوئی قریبی صنف میں ترجمہ کیا جائے تو مسئلہ یہ ہوگا کہ اصل متن جس صنف میں ہے وہ حارج ہوگی کیوں کہ اس کی خصوصیات و صفات قریبی صنف میں کہاں سما سکتی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی زبان کی صنف کا بھی لحاظ رکھے اور اصل صنف کا بھی۔

مترجم جس راستے پر چلے اور ترجمہ کے لیے جو تکنیک بھی اختیار کرے گا صنف کی عدم موجودگی میں تو بہر حال اسے مداخلت کرنی ہی پڑے گی۔ بغیر مداخلت کے متن کی تشکیل تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہ مترجم کو

ترجمہ کر کے ہدفی قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔

صنف و ہیئت کی تقسیم موضوع اور اس کی ساخت (ہیئت) کے اعتبار کی جاتی ہے؛ لیکن یہ تقسیم نہایت پیچیدہ اور مبہم ہے۔ کہیں تقسیم کی بنیاد موضوع ہے تو کہیں اس کی ساخت، کہیں موضوع مختلف ہے ہیئت ایک جیسے قصیدہ اور غزل اور کہیں موضوع ایک ہے اور ہیئت مختلف جیسے ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچہ۔ تنقید ادب کی اس پیر پیچ گفتگو سے بچتے ہوئے یہاں صنف کی تقسیم ادب کی بنیادی درجہ بندی سے کی جائے گی اور اس کو صرف نثر و نظم کے نثری و منظوم ترجمے تک محدود رکھا جائے گا۔ اگر نظم کا ترجمہ نثر میں ہو اور نثر کا ترجمہ نظم میں تو اسے صنف میں مداخلت کے تحت درج کیا جائے گا۔

ترجمے میں صنف کی سطح پر مداخلت کی صورت اس وقت سامنے آتی ہے جب نظم کا ترجمہ نثر میں اور نثر کا ترجمہ نظم میں کیا جائے۔ مثالی صورت تو یہ ہے کہ نثر کا ترجمہ نثر میں ہو اور شاعری کا ترجمہ شاعری میں؛ لیکن حقیقی صورت ایسی نہیں ہے۔ نثر کا ترجمہ یوں تو زیادہ تر نثر میں ہی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی نظم میں بھی کیا جاتا ہے اور نظم کا ترجمہ عموماً نثر میں کیا جاتا ہے؛ ہاں کبھی کبھی نظم میں بھی کیا جاتا ہے۔

نثر کو نظم کے پیرائے میں ادا کرنے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس ضمن میں عربی ادب کے منزل من اللہ شاہکار قرآن کریم کے منظوم تراجم پر کافی توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ سترھویں صدی کے آواخر اور اٹھارھویں صدی کے ابتدا میں اس کے اولین نقوش ملتے ہیں۔ منظوم تفاسیر قرآن میں غلام مرتضٰی جنون الہ آبادی کی تفسیر مرتضوی کو اولیت حاصل ہے۔ یہ پورے قرآن کی تفسیر ہے جس کی تکمیل 1780 میں ہوئی۔ بعد کے ادوار میں بہت سے شعرا نے قرآن حکیم کے منظوم ترجمے کیے جن میں مکمل قرآن کے منظوم تراجم بھی تھے اور مختلف سورتوں اور پاروں کے تراجم بھی۔ منظوم ترجمہ نگاروں کی فہرست بہت طویل ہے۔ اہم ترجمہ نگاروں میں محمد شمس الدین شائق ایزدی، آغا شاعر قزلباس دہلوی، مطیع الرحمان خادم، سیماب اکبرآبادی، محمد ادریس کیف بھوپالی، نیساں اکبرآبادی، انجم عرفانی، مخدوم علی ممتاز، دلاور فگار اور انور جلال پوری شامل ہیں۔ 153

قرآن کریم کا ایک منظوم ترجمہ سیماب اکبرآدی نے وحی منظوم کے نام سے کیا ہے۔ بطور مثال ترجمہ پیش ہے:

﴿انا اعطیناك الکوثر☆ فصل لربك وانحر﴾۔154؎

(اے پیمبر) ہم نے بے شک تم کو کوثر دے دیا

پس پڑھو رب کی نماز، اور پھر کروشکر خدا

155؎

قاضی عطاء اللہ عطاء نے قرآن کا ایک منظوم ترجمہ مفہوم القرآن کے نام سے کیا ہے۔ یہ ترجم اگست 2003 سے جون 2004 تک تین جلدوں میں طبع ہوا۔ اسے ادبی سبھا پسرور نے شائع کیا۔ ترجمے کی مثال ملاحظہ ہو:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ساری تعریفیں ہیں اللہ تعالیٰ کے لیے

جو کہ ہے پالنے والا سبھی دنیاؤں کا

156؎

اسی طرح انہوں نے مَالِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ کا ترجمہ کیا ہے:

ہے وہی روز جزا اور سزا کا مالک

دن قیامت کا اور فنا اور بقا کا مالک

157؎

قرآن کے منظوم تراجم کی مثالوں سے نثر سے نظم میں ترجمے کی مثال سامنے آ گئی۔ نثر سے نظم ترجمے کی مثالیں ذرا کم ملتی ہیں؛ البتہ نظم سے نثر میں ترجمے کی مثالیں بکثرت مل جائیں گی۔ نظم کے منثور ترجمے کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عبداللہ کاپودروی نے دیوان امام شافعی کا نثر میں ترجمہ کیا ہے۔

دَعِ الأیَّامَ تَفۡعَلُ مَا تَشَاءُ

وَطِبۡ نَفۡساً اِذَا حَکَمَ القَضَاءُ

وَلَا تَجۡزَعۡ لِحَادِثَةِ اللَّیَالِيۡ

فَمَا لِحَوَادِثِ الدُّنیا بَقَاءُ

زمانہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے جو چاہے کرتا رہے اور تقدیر نے جو فیصلہ کر دیا
اس پر خوش دلی سے راضی رہ۔
اور زمانہ کے حوادثات سے بے قرار نہ ہو جا اس لیے کہ حوادثات دنیا ہمیشہ نہیں
رہتے۔158

دیوان حماسہ عربی ادب کا مشہور زمانہ شعری انتخاب ہے۔ اس کتاب کے پانچ ترجمے میرے پاس دستیاب ہیں۔ یہ تمام ترجمے صنف میں مداخلت کے ذیل میں آتے ہیں کیوں کہ سب میں نظم کا ترجمہ نثر میں کیا گیا ہے۔ اس کی مثال اس طرح پیش کی جائے گی کہ عربی کے دو اشعار درج کیے جائیں گے اور انہیں اشعار کے کچھ ترجمے یکے بعد دیگرے درج ہوں گے۔

لَوْ كُنْتُ مِنْ مَازِنٍ لَمْ تَسْتَبِحْ اِبِلِي
بَنُوْ اللَّقِيْطَةِ مِنْ ذُهْلِ ابْنِ شَيْبَانَا
اِذَا لَّقَامَ بِنَصْرِى مَعْشَرٌ خُشُنٌ
عِنْدَ الْحَفِيْظَةِ اِنْ ذُوْ لُوْثَةٍ لَانَا

دیوان حماسہ کے ایک ترجمے میں ان دو ابتدائی اشعار کا ترجمہ نے یوں کیا گیا ہے:
اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو مجہول النسب یعنی ذہل بن شیبان میرے اونٹوں کو
مباح نہ سمجھتے۔
تب تو میری مدد کے لیے بہادروں کی ایک ایسی جماعت کھڑی ہوتی جو واجب
الحفاظت چیز کی حفاظت کے وقت سخت ہے اگر کمزور لوگ نرمی کا مظاہرہ
کرتے۔159

مذکورہ بالا دونوں اشعار کا ترجمہ معروف ادیب و مترجم ابن الحسن عباسی نے یوں کیا ہے:
اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو گری پڑی عورت کی اولاد یعنی ذہل بن شیبان
میرے اونٹوں کو مباح نہ سمجھتے۔
اس وقت میری مدد کے لیے ایک ایسی قوم کھڑی ہو جاتی جو حمیت کے وقت

کھر دری ہے، اگر کمزور آدمی نرم پڑ جائے (تو وہ سختی سے پیش آتے ہیں اور اپنی عزت کی حفاظت میں کسی قسم کی نرمی سے کام نہیں لیتے ہیں)۔160

انہیں اشعار کا ترجمہ مطر السماء نامی ترجمے میں بھی نثر میں یوں کیا گیا ہے:

کاش! اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا تو گری پڑی عورت کے بچے یعنی ذھل بن شیبان، میرے اونٹوں کو مباح نہ سمجھتے۔(یعنی غصب کر کے نہ لے جاتے)۔
(اگر میں قبیلہ مازن سے ہوتا) تو اس وقت میری مدد کے لیے ایک کھر دری بہادر جماعت کھڑی ہو جاتی، غصہ و حفاظت کے وقت اگر ضعیف و کمزور آدمی بھی نرم ہو جائے پھر بھی یہ (جماعت) مضبوط و کھر دری رہتی ہے۔161

عربی نظم کے جو ترجمے تلاش و جستجو کے بعد میسر آ سکے وہ زیادہ تر قدیم عربی ادب کے تراجم ہیں۔ یہ تراجم زیادہ تر مدارس سے تعلق رکھنے والے افراد غالباً درسی ضرورت کے پیش نظر کیے ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام کے تمام ترجمے نثر میں ہی ہیں۔ چنانچہ دیوان متنبّی کے چھ دستیاب تراجم: (۱) دیوان المتنبی، محمد اعزاز علی، (۲) شرح اردو دیوان المتنبی، نظام الدین اسیر ادروی، (۳) توضیح القصائد المنتخبہ از نور عالم خلیل امینی (۴) شرح دیوان متنبّی از محمد یار خاں قادری (۵) دیوان متنبّی از محمد امین کھوکھر، محمد یاسین قصوری (۶) شرح الدیوان فی تسہیل البیان از ذوالفقار علی دیوبندی، یہ تمام ترجمے نثر میں ہی ہیں۔ بطو مثال دو ترجمے ملاحظہ ہوں:

يــالائــمي كف الـمـلام عـن الــذي
أضـنــاه طـول سـقـامـه وشقـائـه
عـذل الـعـواذل حـول قلبي التَّائـه
وهـوى الأحبة مـنــه فـي سـودائـه

مذکورہ بالا اشعار دیوان متنبّی کے قافیہ ہمزہ کے ابتدائی دو اشعار ہیں۔ یکے بعد دیگرے اس کے دو تراجم درج کیے جاتے ہیں۔ پہلا ترجمہ نظام الدین اسیر ادروی کا ہے:

اے ملازمت کرنے والے ! اس شخص سے ملامت کو روک لے جس کو اس کی
بیماری اور بدنصیبی کی درازی نے لاغر کردیا ہے۔
ملامت کرنے والیوں کی ملامت مرے پریشان دل کے گرد ہیں اور دوستوں کی
محبت سودائے قلب میں ہے۔162

محمد اعزاز علی کے ترجمے دیوان المتنبی سے ترجمہ ملاحظہ کریں:

اے میرے ملامتگر! روک تو اپنی ملامت کو اس شخص سے کہ لاغر کردیا ہے اس کو اس
کے مرض اور اس کی بدبختی کے طویل ہونے نے۔
ملامت کرنے والی عورتوں کی ملامت میرے متحیر دل کے گردوپیش ہے اور
محبوبوں کی چاہت اس کے وسط قلب میں (پس ملامت کی تاثیر محبت کے خلاف
کچھ نہیں ہوسکتی ہے)۔163

دیوان امام شافعی کے دو ترجمے دستیاب ہوئے۔ ایک ترجمہ عبداللہ کاپودروی نے اور دوسرا ترجمہ طاہرالاسلام قاسمی نے کیا ہے۔ دونوں میں نظم کا ترجمہ نثر میں ہی کیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے الصبر علی فقد الأحباء کے عنوان سے دو شعر کہے ہیں، وہ شعر اور پھر اس کے بعد دونوں ترجمے درج کیے جاتے ہیں۔

ومن يتمن العمر فليدرع

صبراً على فقد أحبائه

ومن يعمر يلق في نفسه

مايتمنّاه لأعدائه

عبداللہ کاپودروی کا ترجمہ کچھ یوں ہے:

جو شخص درازی عمر کا متمنی ہو اس کو چاہیے کہ دوستوں کے فراق پر صبر کا لباس پہنے۔
اور جو شخص لمبی عمر پائیگا [پائے گا] تو اپنے لیے بھی وہی تمنا کریگا [کرے گا] جو دشمن
کے لیے تمنا کرتا تھا۔164

اب دوسرا ترجمہ جو طاہرالاسلام نے کیا ہے وہ بھی ملاحظہ کریں:

(طویل) زندگی کی خواہش ہے تو دوستوں کی جدائی پر صبر کا لباس پہن لو۔
اور جو عمر دراز پائے گا وہ ایسی چیزیں دیکھے گا، جن کی دشمنوں کے لیے تمنا کی جاتی
ہے (یعنی اپنوں کی جدائی)۔165؎

اسی طرح دیوان حضرت علیؓ کے بھی دو ترجمے دستیاب ہوئے۔ یہ دونوں ترجمے منظوم متن کے نثری ترجمے کی مثال ہیں۔ایک ترجمہ

دَعْ ذِكْـــرَهُـــنَّ فَـــمَــا لَهُـنَّ وَفَــاءُ
رِيْـحُ الــصَّبَــا وَعُهُـودُهُـنَّ سَـوَاءُ
يَـكْسِــرْنَ قَـلْبُكَ ثُـمَّ لَا يَـجْبُـرْنَــه
وَقُـــلُــوْبُهُــنَّ مِــنَ الْــوَفَـــاءِ خَلَاءُ

ان کا ذکر چھوڑ کیوں کہ ان میں کچھ بھی وفا نہیں ہے، بادصبا اور ان کے وعدے
دونونکی [دونوں کی] ایک سی حالت ہے۔
تمہارے دل کو توڑتی ہیں پھر اسکو [اس کو] چوڑتیں نہیں، اوران کے دل وفاداری
سے خالی ہیں۔166؎

دیوان علی کا ایک ترجمہ طاہر الاسلام قاسمی نے کیا ہے۔اس ترجمے سے بھی ایک مثال درج کی جاتی ہے۔

الــنَّـــاسُ مِــنْ جِهَةِ التَّــمْثِيْـلِ أَكْـفَـــاءُ
أَبُــــــوْهُـــــــمْ آدَمُ وَالْأُمُّ حَـــــوَّاءُ
نَــفْـــسٌ كَــنَــفْـــس وَأَرْوَاحٌ مُشَــاكِـلَةٌ
وَأَعْــظُــمٌ خُــلِــقَــتْ فِيْهَــا وَأَعْـضَـــاءُ

لوگ (ظاہری شکل و) شباہت (اوراصل) کے اعتبار سے ایک (دوسرے) جیسے
ہیں، (اور کیوں نہ ہوں کہ) ان (سب) کے باپ اور ماں، آدم وحوا (علیہا
السلام) ہیں۔

(ان کی) جانیں، روحیں (طبیعتیں) ملتی جلتی ہیں، تو ان کے اعضاوعظام بھی

ایسے ہی پیدا کیے گئے۔ 167

منتخب عربی کے نام سے پروفیسر مولانا محمد رفیق نے عربی زبان کے قدیم ومعروف اور عمدہ اشعار کا انتخاب کر کے اس کو اردو کے جامہ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے بھی اشعار کا ترجمہ نثر میں ہی کیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

فَـارْضَـوْا بِـمَـا قَسَـمَ الْـمَـلِيْكُ، فَاِنَّمَا

قَسَـمَ الْـمَـعِيْشَةَ بَيْـنَـنَـا قَسَّـامُهَـا

یہ لبید ابن ربیعہ کا شعر ہے، مترجم نے اس کا ترجمہ نثر میں یوں کیا ہے:

جو کچھ بادشاہ حقیقی نے مقدر میں لکھ دی اہے، اس پر راضی رہو، کیونکہ قسمت بنانے

والے نے ہمارے درمیان روزی تقسیم کر دی ہے۔ 168

ہیئت میں مداخلت

ہیئت کے لغوی معنی حالت، صورت اور ساخت کے ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ اور صاحب نور اللغات نے ہیئت کے صورت، شکل، چہرہ مہرہ، ڈول، ساخت، بناوٹ، دھج، حال، حالت، کیفیت، ڈھنگ، طور، طریق وغیرہ معانی درج کیے ہیں۔

صنف اور ہیئت ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ صنف کا تعلق کسی فن پارے کے مواد اور موضوع سے ہے جب کہ ہیئت کسی تخلیق کے ظاہری ڈھانچے اور صورت کا نام ہے۔ ہیئت ایک ایسی کثیر المعنی اور ہشت پہلو ادبی اصطلاح ہے جس کے معنی ومفہوم کی واضح اور حتمی حدود مقرر نہیں کی جاسکتیں۔ ہیئت اپنے محدود اصطلاحی مفہوم کے مطابق ایسا پیمانہ یا سانچا ہے جسے فن کار اپنے جذبات اور خیالات کی تشکیل کے لیے استعمال میں لاتا ہے۔ مگر وسیع تر مفہوم میں ہیئت، تکنیک اور اسلوب کو بھی محیط ہے۔ احتشام حسین ہیئت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہیئت اپنے وسیع مفہوم میں ایک طرف تو وہ طریق اظہار ہے جو فن کار استعمال کرتا ہے اور دوسری جانب جذبات سے بھرا ہوا وہ پر اثر اور کسی حد تک مانوس انداز بیان ہے جو شاعر اور سامع کے درمیان رابطہ اور رشتہ کا کام دیتا ہے۔ اس میں زبان، زبان کی آرائش، اثر اندازی کے تمام طریقے، مواد کے تمام سانچے، حسن اور لطافت پیدا کرنے کے تمام ذریعے اور ان سب سے بڑھ کر مواد کے ساتھ ہم آہنگی کا احساس دلا کر ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا سبھی کچھ شامل ہے''169؎

شعری ہیئت ایک مخصوص طرز اظہار ہے۔ جس کی اپنی ایک قابل شناخت ظاہری شکل ہوتی ہے جو کسی مخصوص نظام کے تحت تشکیل پاتی ہے۔ شعری ہیئت کی تشکیل کا نظام یا تو قوافی کی کسی مخصوص ترتیب (مثلاً غزل کے تمام ثانی مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا) پر مبنی ہوگا یا ابیات (مثلاً مثنوی میں ہر دو مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا) پر مشتمل ہوا، یا مصرعوں کی تعداد (مثلاً مسمط کی مختلف شکلیں) پر انحصار کرے گا یا قوافی کی نفی (نظم معریٰ) یا مصرعوں کے ارکان میں کمی بیشی (آزاد نظم) سے ترتیب پائے گا۔ اسے مختصراً ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ہر شعری

ہیئت قابل شناخت ظاہری شکل ضرور رکھتی ہے جسے ہم دیکھتے ہی فوراً پہچان لیں کہ یہ فلاں ہیئت ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہیئت کے خد و خال تہذیبی اور تمدنی زندگی میں بھی پیوست ہوتے ہیں۔ یوں ہیئت کے آئینے میں تہذیب وتمدن کے نقوش جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ہیئت خیال کے اظہار کے ساتھ ساتھ اپنے عصری معیارات کے تشخص کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔فن کار چوں کہ معاشرے اور عصر کا آئینہ بردار ہوتا ہے اس لیے ہیئت کی تخلیق کے وقت وہ عصری میلانات اور تہذیبی معیارات کو پیش نگاہ رکھتا ہے۔یہی سبب ہے کہ تہذیب وتمدن کی تبدیلی سے ہیئتوں کا اثر کم ہونے لگتا ہے اور ان کی تازگی ماند پڑنے لگتی ہے۔ ہیئت قاری کے ذہن میں کچھ شعری امکانات پیدا کر دیتی ہے جو اسے فن پارہ کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں۔مثال کے طور پر غزل کا نام آتے ہی قاری کے ذہن میں واردات حسن وعشق، حکایات وصال وہجر، ردیف وقافیہ کی تکرار، تغزل، ایجاز واختصار اور دیگر غزلیہ عناصر بیدار ہوجاتے ہیں اور وہ غزل کے مطالعے یا سماعت کے دوران میں ایک خاص لذت کشید کرتا ہے۔

تہذیب اور معاشرے کی تبدیلی سے خیال میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور خیال کی تبدیلی بعض اوقات ہیئت میں تبدیلی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ نیا خیال اپنے آپ کو منوانے اور مقبول بنانے کے لیے پُرانی ہیئت کا سہارا لیتا ہے کیوں کہ ہیئت کا قاری کے ساتھ ایک دیرینہ تعلق ہوتا ہے۔اور آزمودہ کاری، ذہنی قربت اور افادۂ قدیم کے پیشِ نظر ہی ہیئت نئے خیال کو قاری تک پہنچانے کا اہتمام کرتی ہے، اگر خیال کے ساتھ ہیئت بھی نئی ہو تو شاید معاشرہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے یا بہت دیر بعد جا کر اس کے اثرات ظاہر ہوں۔ بعض اوقات خیال کی فرسودگی اور کہنگی کو چھپانے کے لیے بھی ہیئت کی تازگی کو کام میں لایا جاتا ہے چوں کہ ہیئت کوئی جامد یا معین چیز نہیں ہوتی اس لیے اگر تجربات اور واردات میں تبدیلی پیدا ہوتی رہے تو ہیئت میں تبدیلی بھی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ تجربات کا نیا رنگ وآہنگ اظہار کے لیے مناسب اور تازہ ہیئتوں کا تقاضا کرتا ہے۔اس موڑ پر فن کار یا تو پُرانی ہیئت میں جزوی تبدیلیاں کرتا ہے یا پھر کسی نئی ہیئت کی تعمیر کرتا ہے، یہاں یہ کہنا خارج از آہنگ نہیں کہ نئی ہیئتوں کی تلاش صرف جدت کی خواہش نہیں ہوتی کیوں کہ ہیئت برائے ہیئت سے فن کار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہیئت میں تبدیلی یا تصرف کے وقت شاعر کے پیشِ نظر اپنی

زبان کی جملہ شعری روایت ہونی چاہیے اور اسے از سرِ نو شاعرانہ ہیئتوں کے امکان کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان میں نئے افکار کو پیش کرنے کی صلاحیت کس حد تک ہے اور اس میں کس طرح کے تغیرات مفیدِ مطلب اور منفعت رساں ہو سکتے ہیں۔ اگر فن کار بلا سوچے سمجھے اور اپنی شعری روایت کو نظر میں رکھے بغیر ہیئت میں تبدیلی یا تصرف کرے گا تو اس سے نہ تو کوئی مقصد پورا ہوگا اور نہ اس کی تبدیل شدہ یا وضع کردہ ہیئت کو معاشرے میں بہ نگاہِ استحسان دیکھا جائے گا۔ یہ درست ہے کہ ابتدا میں ہر نئی ہیئت اپنی نا مانوسیت کے باعث مقبولِ زمانہ نہیں ہو جاتی لیکن اگر اس میں دم خم ہو اور خیال کو بہتر شکل میں پیش کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو رفتہ رفتہ اسے قبولِ عام ملتا رہتا ہے اور قاری اس کے آئینے میں اپنے عصر کے نقوش دیکھنے لگتا ہے یوں ہیئت کی نا مانوسیت مانوسیت میں تبدیل ہو جاتی ہے، ہیئت کے تجربات سے تخلیق کا دھارا رواں دواں رہتا ہے اور اگر ہیئت کے تجربات کا سلسلہ رک جائے تو تخلیقی جمود طاری ہو جائے کیوں کہ ایک ہیئت ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتی، تخلیقی تجربوں میں جدت، وسعت اور پیچیدگی کے نتیجے میں ہیئت میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دوسری زبانوں کی شاعرانہ ہیئتوں سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ زبان بھی فن کار کی زبان سے تہذیبی مماثلت یا تمدنی علاقہ رکھتی ہو، اگر دونوں زبانوں میں کوئی قدر مشترک نہ ہو تو ہیئتوں کا مستعار لینا کارِ بے فائدہ ہوگا۔

اردو زبان و ادب کی تشکیل میں ہندوستانی زبانوں کا رنگ روپ بھی شامل ہے اور عربی و فارسی جیسی توانا زبانوں کا خون بھی اس کی رگوں میں موج زن ہے، اس لیے اُردو نے اپنے ادبی آغاز میں ہی جہاں ہندوستانی زبانوں کی شاعرانہ ہیئتوں مثلاً جکری، بارہ ماسہ، اشلوک، بھجن، کبت، دوہا وغیرہ کو قبول کیا وہاں عربی و فارسی کی شاعرانہ ہیئتوں اور اصناف جیسے مثنوی، رُباعی، قصیدہ، غزل، مسمط وغیرہ کو بھی اپنایا۔ ان اصناف اور ہیئتوں میں سے جو اُردو کے تہذیبی مزاج کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ تھیں انہیں مختصر عرصہ میں ہی قبولِ عام کا شرف نصیب ہوا اور جو اس کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں وہ بہت جلد دم توڑ گئیں۔ بعد میں مخصوص تہذیبی اور معاشرتی حالات کی تبدیلی نے بھی اُردو کی کئی مقبول اصناف کو کم رواج کر دیا جن میں قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ شامل ہیں۔ 1857 کے بعد جب ہندوستان پر انگریزوں کا باقاعدہ اقتدار قائم ہوا تو انگریزی زبان و ادب

کے اثرات یہاں کی مقامی زبانوں پر پڑے۔ اُردو پر انگریزی ادب کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزی کی کئی شعری اصناف اور ہیئتیں جیسے سانیٹ، لمرک، کینٹوز، آزاد نظم، نظم معریٰ وغیرہ اردو میں تخلیقی سانچے کے طور پر اپنالی گئیں مگر نظمِ آزاد اور نظمِ معریٰ کے علاوہ باقی ہیئتیں وقتی طور پر اپنی چمک دمک دکھا کر ختم ہو گئیں کیوں کہ یہ ہیئتیں اُردو کے تہذیبی رچاؤ کو اس کی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ظاہر کرنے سے قاصر رہیں۔

ہیئت کے ترجمے سے سابقہ عموماً شاعری کے ترجمہ میں پڑتا ہے اور یہی ترجمہ کا سب سے کٹھن بلکہ بعض ماہرین کی نظر میں ناممکن عمل ہے۔ شاعری کو ناقابل ترجمہ قرار دینے کی اہم وجہ بھی ہیئت ہی ہے۔ شاعری میں ہیئت کی اہمیت بہت زیادہ اور ترجمہ میں اس کو برتنا یا برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ شاعری کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ نظم کی مختلف ہیئتیں ہوتی ہیں مثلاً غزل، قصیدہ، رباعی، مرثیہ، نظم وغیرہ۔ اصناف کی طرح یہ بھی ترجموں کے سہارے دوسری زبان میں داخل ہوتی ہیں۔ جیسے اردو میں آزاد نظم، نظم معرا، نثری نظم، سانیٹ انگریزی سے جب کہ ہائیکو جاپانی سے آئی ہے۔ لیکن ہر زبان اپنے مخصوص مزاج کے باعث ہر ہیئت کو قبول نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام ہیئتوں کو اردو میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔

ہیئت کی سطح پر کافی مداخلت ہوتی ہے۔ غزل کا ترجمہ انگریزی میں کرنا ہو تو مترجم کو اس کی ہیئت تبدیل کرنی ہی پڑے گی۔ اگر وہ غزل کی ہی ہیئت میں ترجمہ کرتا ہے تو نہ صرف ہدفی قارئین کے ذوق پر گرانی ہوگی ہوگی بلکہ اس کی وہ اہمیت بھی باقی نہیں رہے گی جو اصل زبان میں ہے۔ ردیف، قافیہ، بحر و اوزان کا جو نظام اردو، عربی، فارسی میں رائج ہے وہ انگریزی میں نہیں ہے لامحالہ انگریزی مترجم کو مداخلت کرنی پڑے گی۔ یہی صورت حال اس وقت پیش آئے گی جب انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے گا۔ اس کے متعلق شیخ غلام محی الدین دو آتشہ کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

> ''انگریزی نظموں کا ترجمہ جنہیں بہ لحاظ اردو اوزان کے نظم کہنا ہی نہ چاہیے ٹیڑھی کھیر ہے۔ ان کے دو مصرعے بمشکل ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے اور ایک پیمانہ میں نپے ہوئے ملیں گے، ایک اگر انگل بھر کا ہوگا تو دوسرا چار انگل کا، کہیں ایک بند میں تین مصرعے ہوں گے کہیں پانچ، ایسی بے قاعدہ نظموں کا اردو جیسے نپے

تلے اوزان میں تولنا اور پھر اس طرح سے کہ شعرا کی نکتہ سنج جماعت اس کو قبولیت کی نظر سے دیکھے کوئی آسان کام نہیں ہے۔'' 170؎

اردو شاعری کے متعلق گفتگو کریں تو یہاں رائج اصناف میں کئی کا ترجمہ آسان ہے جب کہ کئی کا بہت مشکل ہے۔اس میں سب سے سرفہرست غزل ہے۔ پروفیسر رشید امجد لکھتے ہیں:

نظم کے برعکس غزل کا ترجمہ کہیں مشکل ہے کہ غزل کے خیال کو تو آسانی سے دوسری زبان میں منتقل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی مزاجی کیفیت اور ہیئتی دبازت کو ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے۔'' 171؎

ہدفی میں زبان میں اگر اصل کی ہیئت موجود ہو تو مترجم کو دشواری نہیں ہوتی ہے البتہ اس صورت میں بھی اصل زبان کی ہیئت کی کلی مطابقت تو مشکل ہی سے ہو پاتی ہے۔اس کی تمام تر صفات کی درآمد نہیں ہو سکتی کیوں کہ ہدفی زبان اور قارئین کا تقاضہ مختلف ہوتا ہے۔اگر ہیئت موجود نہ ہو تو مترجم اپنی زبان کی قریبی ہیئت میں ترجمہ کرتا ہے یا اصل زبان کی ہیئت کو اپنی زبان میں برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مرحلہ بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔زبان کا مزاج اس راہ میں رکاوٹ حائل کرتا ہے۔ یہ رکاوٹ کبھی تو رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے، جیسے آزاد نظم کی ہیئت ہمارے یہاں آہستہ آہستہ قابل قبول ہو گئی اور کبھی اس کو مقبولیت نہیں مل پاتی جیسے ہمارے یہاں ہائیکو کو وہ حیثیت نہیں مل سکی۔

يـــالائـــمي كف الـمـلام عـن الـذي
أضـنـــاه طـول سـقـامـه وشقـائـه

اے مجھے ملامت کرنے والے روک لے تو ملامت کو اس شخص سے کہ جس کو لاغر کر دیا اس کی طویل بیماری اور بدنصیبی نے۔

ملامت گر! ملامت روک لے تو ایسے عاشق سے
جسے طول مرض اور بد نصیبی نے کیا لاغر

ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں:

عـذل الـعـواذل حـول قلبي التَّائـه

وهـوى الأحبة مـنــه فـي سـودائـه

ملامت کرنے والیوں کی ملامت میرے حیران دل کے آس پاس ہےاور محبوبوں

کی محبت دل کے سوداء(بیچ میں جاگزین ہے۔

ملامت ہے اعداء کی دل کے کنارے

اور انکی جگہ ہے سویدائے دل میں

172ء

یہ متنبّی کا ابتدائی قصیدہ ہےاوراس کا قافیہ ہمزہ ہے۔ترجمے میں قافیے کی کوئی رعایت نہیں کی گئی ہے۔

پھر دونوں اشعار کے ردیف وقوافی مختلف ہیں۔

حوالہ جات

1. گوپی چند نارنگ، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، ص40
2. اقتدار حسین، صوتیات اور فونیمیات، (مقدمہ) ص9
3. اقتدار حسین، صوتیات اور فونیمیات، ص75
4. (انتظار حسین، سعید کی پُراسرار زندگی، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور)
5. (ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی، عربی ادبیات کے اردو تراجم، ص43-142)
6. ایضاً ص145)
7. اقتدار حسین، صوتیات اور فونیمیات، (مقدمہ) ص65
8. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص41، مکتبہ مصر
9. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص10، الفیصل لاہور 2010
10. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص44-43، مکتبہ مصر
11. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص13، الفیصل لاہور، 2010
12. Hasan Ghazala, Translation as Problems and Solution, Pg. 300
13. ایضاً
14. ایضاً
15. (سورہ بقرہ، آیت 6)
16. (اثر زبیر لکھنوی، سحر البیان، ص4، الحجاز پبلشرز، کراچی)
17. https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_English_words_of_Arabic_origin_(A-B)
18. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات من ادب العرب (جلد اول) ص29، مجلس نشریات اسلام، کراچی پاکستان، 1991)
19. (خالد محمود، انوارات، ص19، درالقلم لاہور پاکستان)
20. ابواسامہ عبدالرحمٰن، مبشرات فی حل مختارات میں ادب العرب، ص109، مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)
21. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات، ص30، مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991)
22. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب، ص94، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)
23. (خالد محمود، انوارات، ص20، دارالقلم لاہور پاکستان)
24. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی، ص50، شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

25. وحیدالزماں کیرانوی،القاموس الوحید،ص1084،مکتبہ حسینیہ دیوبند،2007

26. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب (جل اول)ص،29،مجلس نشریات اسلام،کراچی پاکستان،1991)

27. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

28. (عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب فی شرح مختارالادب،ص92،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

29. (حافظ بلال اشرف،بیان المختارات،ص21،دارالکتب السّلفیہ لاہور پاکستان،2010)

30. (خالدمحمود،انوارات،ص19،دارالقلم لاہور پاکستان)

31. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص99،دارالمسیرہ بیروت،1980

32. خورشیدانورندوی،دلچسپ اورسبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

33. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص77،قباگرافکس حیدرآباد،2014

34. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(اول)ص29،مجلس نشریات اسلام،ناظم آبادکراچی،1991)

35. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

36. (حافظ بلال اشرف،بیان المختارات،ص21،دارالکتب السّلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

37. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(اول)ص29،مجلس نشریات اسلام،ناظم آبادکراچی،1991)

38. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(جلداول)ص29،مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان،1991)

39. (حافظ بلال اشرف،بیان المختارات،ص21،دارالکتب السّلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

40. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

41. (عتیق الرحمٰن سیف،لمعات الذہب،ص93،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

42. (خالدمحمود،انوارات،ص20-19،دارالقلم لاہور پاکستان)

43. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص94،دارالمسیرہ بیروت،1980

44. خورشیدانورندوی،دلچسپ اورسبق آموز کہانیاں،ص65،مکتبہ خورشیدندوی نہٹور،2016

45. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص74،قباگرافکس حیدرآباد،ص2014

46. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص97،دارالمسیرہ بیروت،1980

47. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص76-75،قباگرافکس حیدرآباد،2014

48. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص99-98،دارالمسیرہ بیروت،1980

49. خورشیدانورندوی،دلچسپ اورسبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

50. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص76،قبا گرافکس حیدرآباد،2014

51. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص99،دارالمسیر ہ بیروت،1980

52. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

53. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص77،قبا گرافکس حیدرآباد،2014

54. علی احمد باکثیر،قطط وفیران،ص5،مکتبہ مصر

55. عبیدالرحمٰن طیب، رشتوں کے رنگ،ص 121،البلاغ پبلی کیشنز نئی دہلی،2012

56. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات،ص30،مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991)

57. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب،ص94،ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

58. علی احمد باکثیر،من فوق سبع ساوات،ص45،مکتبہ مصر

59. قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں،ص14،الفیصل لاہور،2010

60. مولوی فیروزالدین، فیروزاللغات،ص912،زکریک ڈپو دیو بند سہارنپور

61. عبدالحفیظ بلیاوی،مصباح اللغات،ص594،مکتبہ برہان دہلی

62. (سورہ بقرہ،آیت نمبر185،سورہ حدید،آیت نمبر20)

63. سورہ فاطر،آیت نمبر5

64. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب(اول)،ص29،مجلس نشریات اسلام،ناظم آباد کراچی، 1991)

65. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

66. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص21،دارالکتب السّلفیہ،لاہور پاکستان،2010)

67. (خالد محمود،انوارات،ص19،دارالقلم لاہور پاکستان)

68. (فیضان اللہ بیگ،آئین نو،ص4،شعبۂ عربی،اےایم یوعلی گڑھ،2010)

69. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات من ادب العرب(جلداول)،ص29،مجلس نشریات اسلام،کراچی پاکستان، 1991)

70. (حافظ بلال اشرف، بیان المختارات،ص21،دارالکتب السّلفیہ لاہور پاکستان،2010)

71. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات فی حل مختارات،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

72. (خالد محمود،انوارات،ص19،دارالقلم لاہور پاکستان)

73. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب،ص92،ایچ ایم سعید کمپنی،کراچی پاکستان)

74. عبداللہ ابن المقفع،کلیلہ ودمنہ،ص96،دارالمسیر ہ بیروت،1980

75. خورشیدانور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص66، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

76. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص75، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

77. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص96، دار المسیرہ بیروت، 1980

78. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص75، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

79. خورشیدانور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص66، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

80. Mona Baker, In Other Words, Pg. 83

81. ایضاً، ص83-84

82. مولوی عبدالحق، اردو صرف ونحو، ص26

83. In other words, Mona Baker, pg, 87

84. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص99، دار المسیرہ بیروت، 1980

85. خورشیدانور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص68، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016

86. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص77، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

87. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص44، مکتبہ مصر

88. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص14، الفیصل لاہور، 2010

89. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص5-6، مکتبہ مصر

90. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص45-46، الفیصل لاہور، 2010

91. مولوی عبدالحق، اردو صرف ونحو، ص14

92. Mona baker, In Other Words, pg, 91

93. ایضاً، ص90

94. محد حسن یوسف، کیف تترجم؟، ص 119

95. مولوی عبدالحق، اردو صرف ونحو، ص42

96. Mona Baker, In Other words, pg, 110

97. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص94، دار المسیرہ بیروت، 1980

98. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص74، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

99. خورشیدانور ندوی، دلچسپ وسبق آموز کہانیاں، ص65، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

100. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص94،دارالمسیر ہ بیروت،1980

101. خورشیدانور ندوی،دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص65،مکتبہ خورشید ندوی نہٹور،2016

102. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص98،دارالمسیر ہ بیروت،1980

103. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص76،قبا گرافکس حیدرآباد،2014

104. خورشیدانور ندوی،دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی،2016

105. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص8،مکتبہ مصر

106. قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص48،الفیصل لاہور،2010

107. عبداللہ کاپودروی،دیوان امام شافعی،ص50،شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

108. (ابوالحسن علی ندوی،مختارات من ادب العرب (جلداول)ص30-29،مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان،1991)

109. (ابواسامہ عبدالرحمٰن،مبشرات،ص109،مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

110. (حافظ بلال اشرف،بیان المختارات،ص22،دارالکتب السلفیہ لاہور پاکستان،2010)

111. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص41،مکتبہ مصر

112. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص10،الفیصل لاہور،2010

113. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص41،مکتبہ مصر

114. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص10،الفیصل لاہور،2010

115. علی احمد باکثیر،من فوق سبع سماوات،ص8،مکتبہ مصر

116. قلب بشیر خاور بٹ،عالم بالا کے سائے میں،ص47،الفیصل لاہور،2010

117. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص96،دارالمسیر ہ بیروت،1980

118. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص75،قبا گرافکس حیدرآباد،2014

119. خورشیدانور ندوی،دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص67،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

120. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص98،دارالمسیر ہ بیروت،1980

121. خورشیدانور ندوی،دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

122. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص76،قبا گرافکس حیدرآباد،2014

123. عبداللہ کاپودروی (مترجم)،دیوان امام شافعی،ص44،شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

124. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص100،دارالمسیر ہ بیروت،1980

125. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص69، مکتبہ خورشید مدنی نہٹور، 2016

126. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، 77، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

127. وحید الزماں کیرانوی، القاموس الوحید، ص1632، کتب خانہ حسینیہ دیوبند، 2007

128. طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، ص،

129. Gazala Hasan, Translation as problems and solutions, pg, 222

130. رشید امجد، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل، مرتب اعجاز راہی، ص45

131. (قرآن حکیم کے ترجمے کے اصول وقوانین اور ترجمہ نگاری کی روایت کا تسلسل، مفتی عبدالخالق آزاد)

http://www.darululoom-deoband.com/urdu/magaznew//tmp/07-Quran%20Hakim%20

)Ke%20Tarjume_MDU_10-11_Oct%20&%20Nov_ 12.ht(

132. مرزا حامد بیگ، مغرب سے نثری تراجم، ص32

133. عبداللہ ابن المقفع، کلیلہ ودمنہ، ص96، دار المسیرہ بیروت، 1980

134. خورشید انوراندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں، ص66، مکتبہ خورشید ندوی نہٹور، 2016

135. رفیع الدین حنیف، کلیلہ ودمنہ، ص75-74، قبا گرافکس حیدرآباد، 2014

136. (ابوالحسن علی ندوی، مختارات، ص30، مجلس نشریات اسلام کراچی پاکستان، 1991)

137. (ابواسامہ عبدالرحمٰن، مبشرات، ص110، مکتبہ امدادیہ ملتان پاکستان)

138. (عتیق الرحمٰن سیف، لمعات الذہب، ص93، ایچ ایم سعید کمپنی کراچی پاکستان)

139. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص41، مکتبہ مصر)

140. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص10، الفیصل لاہور، 2010

141. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص45-44، مکتبہ مصر

142. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص14، الفیصل لاہور، 2010

143. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص6-5، مکتبہ مصر

144. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص46-45، الفیصل لاہور، 2010

145. وحید الزماں قاسمی، القاموس الوحید، ص1907، کتب خانہ حسینیہ دیوبند، 2007

146. علی احمد باکثیر، من فوق سبع سماوات، ص6، مکتبہ مصر

147. پروفیسر قلب بشیر خاور بٹ، عالم بالا کے سائے میں، ص46، الفیصل لاہور، 2010

148. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی، ص40، شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

149. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی ،ص53،شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

150. عبداللہ ابن المقفع ،کلیلہ ودمنہ،ص99،دار المسیرہ بیروت،1980

151. خورشید انور ندوی، دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں،ص68،مکتبہ خورشید مدنی نہٹور،2016

152. رفیع الدین حنیف،کلیلہ ودمنہ،ص76،قبا گرافکس حیدر آباد،2014

153. (اسد قیوم، حافظ محمد سجاد، قرآن مجید کے پانچ منظوم اردو تراجم کا تعارف وتجزیہ، جرنل آف اسلامک اینڈ ریلیجس اسٹڈیز، جنوری- جون2018)

154. سورۃ الکوثر،آیت1-2

155. سیماب اکبرآبادی، وحی منظوم،ص969

156. عطاء قاضی، مفہوم القرآن، جلد اول،ص9، ادبی سبھا پسرور،2003

157. ایضاً

158. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی ،ص35،شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن، جمبوسر

159. مجلس المدینۃ العلمیہ (دعوت اسلامی)، اتقان الفراسۃ فی شرح دیوان الحماسہ،ص25-26، مکتبہ المدینہ باب المدینہ کراچی،2012

160. ابن الحسن عباسی، توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ،ص33-34، مکتبہ عمر فاروق کراچی،2008

161. محمد نور حسین قاسمی، محمد صدیق ارکانی، مطر السماء شرح باب الحماسہ،ص6-7، دار الاشاعت کراچی،2009

162. دیوان المتنبی، نظام الدین اسیر ادروی،ص50، قدیمی کتب خانہ کراچی

163. محمد اعزاز علی، دیوان المتنبی،ص1، مکتبہ حقانیہ ملتان پاکستان،

164. عبداللہ کاپودروی، دیوان امام شافعی ،ص43،شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن جمبوسر

165. طاہر الاسلام قاسمی، دیوان امام شافعی،ص37، دار المعارف دیوبند،2008

166. ناشر، مصطفیٰ وحید،ص4، لاہور1995

167. طاہر الاسلام قاسمی، دیوان حضرت علیؓ،ص39، دار المعارف دیوبند2007

168. محمد رفیق، منتخب عربی اشعار،ص9، مکتبہ قرآنیات لاہور2014

169. ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، اردو غزل، تکنیک اور ہیئت کے خدوخال،

170. حسن الدین احمد، انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،ص33

171. رشید امجد، فن ترجمہ کے اصولی مباحث، مشمولہ اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل مرتب اعجاز راہی،ص44

172. اسد اللہ قاسمی، المتجلی شرح اردو منتخبات دیوان متنبیؔ،ص30، مکتبہ صوت القرآن دیوبند

اختتامیہ

ہر صاحب علم پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ترجمہ ہمیشہ سے وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ کثیر لسانی معاشرے یا ذولسانی تعامل کی صورت میں اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہندوستان اور افریقہ جیسے کثیر لسانی ملکوں میں ترجمہ کی ضرورت بالکل ظاہر ہے جہاں ذرائع ابلاغ، عدلیہ، انتظامیہ میں سینکڑوں زبانیں مستعمل ہیں۔ ہزاروں مترجمین مقرر کئے جاتے ہیں جو ہر روز ترجمہ کا عمل انجام دیتے ہیں۔ تاریخ کے نامعلوم دور سے ترجمہ کی سرگرمی جاری وساری ہے۔ کوئی ایسا زمانہ نہیں گزرا جب ترجمہ نہ ہوا ہو۔ فلسفہ، طب، کیمیا، طبعیات، حیاتیات، نباتیات، ریاضی، ہندسہ دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں؛ تمام علوم پر لکھی جانے والی اہم کتابوں کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے۔ مذہب کی فطرت میں ہی ترویج و اشاعت کا عنصر شامل ہے کہ یہ راہ نجات ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام مذاہب کی اہم کتابوں کے تراجم دنیا کی بے شمار زبانوں میں کئے گئے۔ عہد حاضر میں ہونے والی علمی وسائنسی ترقیات سے مختلف اقوام کے استفادہ کی راہ ترجمہ ہی ہموار کررہا ہے۔

ترجمے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علم وفن اور مذہب کے تراجم کے علاوہ سب سے زیادہ جس جانب توجہ دی گئی وہ ادب کا ترجمہ ہے۔ ادب کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ دنیا کی تمام ہی زبانوں میں ادب تخلیق کیا جاتا ہے؛ کیونکہ ادب کا راست تعلق زندگی اوراس میں رونما ہونے والے واقعات سے ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وقوع پذیر ہونی والی کیفیات کو ادب کے سانچے میں مشترک تجربہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایک زبان کے ادبی رس دوسری زبانیں کشید کر کے اپنے دامن کو شیریں و پر بہار بناتی ہیں۔ کسی بھی زبان کا بہترین سرمایہ ادب صرف اسی زبان تک محدود نہیں رہتا؛ بلکہ دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جاتا ہے تاکہ استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، تہذیبی خلیج میں کمی واقع ہو، دوسری زبان کے رجحانات، تخیلات، مزاج نیز لسانی خوبیوں سے اپنے اندر مزید وسعت پیدا کی جائے، نئی ادبی اصناف کا اضافہ ہو اور دیگر زبانوں کے فنی معیارات سے واقفیت کا موقع ملے۔

ادب احساس جمال کی تسکین کرتا ہے۔ادب مسرت آمیز بصیرت عطا کرتا ہے۔اس لیے میراث ادب ہر زبان میں تقسیم ہوتی ہے۔اس معاملے میں ہماری اردو زبان کو یک گونہ فوقیت حاصل رہی ہے۔اردو زبان میں دوسری زبانوں سے استفادہ کی صلاحیت بھی موجود ہے اور لوگوں نے اس کے مواقع بھی خوف مہیا کیے۔ترجمے کی سرگرمی کا سراپندرھویں صدی کے نصف سے جاملتا ہے۔ابتدا میں مذہب وفلسفہ کے ترجمے سے اعتناء کیا گیا، پھر ادب میں داستانوی ادب کے ترجمے پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔اس زمانے میں زیادہ تر ترجمے عربی اور فارسی سے کیے گئے۔انگریزوں کے تسلط کے ساتھ انگریزی زبان سے رابطہ استوار ہوا۔اس دور میں ترجمے کی بڑی تیز لہر چلی۔اردو زبان مغربی ادب کے بیش قیمتی موتی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نئی اصناف سے بھی روشنا ہوئی۔فورٹ ولیم کالج، دلی کالج، سائنٹفک سوسائٹی، دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ جیسے اداروں نے ترجمے کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔

ترجمے کی اہمیت مسلم، ضرورت ناگزیر، روایت مسلسل اور فائدے بے شمار؛ اس کے باوجود مترجم کی سعی نامشکور ہی رہتی ہے۔ترجمہ کو وہ مقام نہ ملتا جو دنیا کی دوسری اہم علمی سرگرمیوں کے حصے میں آتا ہے۔ترجمہ اب تک اس صورت حال سے دوچار کیوں رہا ہے۔اس کی سب سے اہم اور بنیادی یہ بنفس نفیس تخلیق نہیں بلکہ بازتخلیق ہوتا ہے۔اس لیے ہمیشہ سے ترجمہ کو مقابلہ وموازنہ کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور اس میں کمی بیشی اور تغیر وتبدل کی شکایت کی گئی۔مترجم کو موردالزام ٹھہرایا گیا اور تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

جب ترجمہ تخلیق نہیں بلکہ بازتخلیق ہے تو تخلیق وترجمہ میں کلی مماثلت ومطابقت کیسے پید ہوسکتی ہے۔ترجمہ منتقلی کا عمل ہے اور منتقلی متقاضی ہے تغیر وتبدل کی۔جب بھی کوئی چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی جائے گی اور جس جگہ منتقل کیا جارہا ہے وہ سابق سے مختلف ہے تو دوران منتقلی تبدیلی آنا لازمی ہے۔ترجمہ کی اصطلاح میں یہی تغیر وتبدل مداخلت سے عبارت ہے۔ترجمہ اور مداخلت دونوں لازم وملزوم ہیں۔کچھ مداخلتیں شعوری ہوتی ہیں اور کچھ غیر شعوری۔غیر شعوری مداخلت میں مترجم کی ذات، اس کی شخصیت اور زبان کے مزاج کو کافی دخل ہوتا ہے۔شعوری مداخلت میں مترجم کے ارادہ واختیار کا عمل دخل ہوتا ہے۔ترجمے کا مقصد اور پالیسی، ہدفی قارئین کا وقوفی ماحول، زبان ومخاطب کا ڈسکورس، سیاسی نظریات وتعلقات، رجحانات

وروّیے کی رعایت و پاسداری میں مترجم ترجمے میں مداخلت کرتا ہے جو مثبت و منفی دونوں ہو سکتی ہے۔

کسی بھی ترجمے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مداخلت سے پاک ہیں۔ نیز یہ ممکن بھی نہیں کہ کوئی ایسا ترجمہ وجود میں آ جائے جس میں مداخلت نہ ہو؛ البتہ ایسے تراجم ضرور مل سکتے ہیں جن میں کم سے کم مداخلت ہوئی ہو، خصوصاً علمی تراجم میں یہ صفت زیادہ پائی جا سکتی ہے۔ جہاں تک ادبی تراجم کا تعلق ہے ان میں مداخلت کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ترجمے کو قابل رسا، قابل قبول اور قابل استفادہ بنانے کے لیے مداخلت کے راستے سے سفر طے کرنا پڑتا ہے۔وقوفی قارئین کے لیے حظ ادب برقرار رکھنے کے لیے مترجم درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے تا کہ نہ اصل سے بے گانگی رہے اور نہ ترجمے میں اجنبیت۔

زیرِ نظر مقالے نظریہ مداخلت کا جائزہ عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ کتابوں کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ مداخلت کے ضمن میں ایک بات یہ ضرور ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اصل اور ہدفی زبان میں جس قدر لسانی و مزاجی قربت و یکسانیت ہوگی مداخلت کے اسباب اور صورتیں اتنی ہی کم ملیں گی؛ لیکن اس سے قطعی یہ مراد نہیں ہے کہ مداخلت نہیں ہوگی۔ مثال کے طور پر عربی اور اردو زبان کو ہی دیکھ لیجئے۔ اردو نے عربی زبان سے اخذ و استفادہ کیا، اسی کے بازو تھام کر چلنا شروع کیا اور اسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ زبانوں کے درمیان تاثیر و تاثر کے تمام اسباب و علل موجود رہے۔ براہ عربی زبان کے اثرات پڑے، فارسی کے جو اثرات پڑے اس میں بھی عربی کا اثر شامل ہے۔عربی اسلام و قرآن کی زبان ہے، دنیا کی فائق زبانوں میں سے ایک ہے، عرب حکومت بھی قائم رہی، عرب و ہند کے درمیان قدیم تعلقات رہے ہیں۔عربی اور اردو دونوں تقریباً مسلمانوں کی ہی زبان ہے۔جن علماء نے اردو زبان میں خدمات انجام دیں ان کی اکثریت عربی داں تھی۔ادب، تنقید، قواعد اور زبان کا ایک بڑا ذخیرہ عربی سے ہی مستعار ہے۔روزمرہ کی زبان کے بھی ہر جملے میں عربی الفاظ سموئے ہوتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اردو میں عربی سے ترجمے کی قدیم روایت موجود ہے۔ مذہب، فقہ، فلسفہ، حکمت، تاریخ، تصوف، سیرت، مغازی، سوانح، ادب اور علوم وفنون کی بے شمار کتابیں اردو میں منتقل کی گئیں۔کئی علوم تو ایسے جن کا بنیادی اور واحد ماخذ عربی زبان ہی ہے۔صرف ادب کے حوالے سے گفتگو تب بھی قدیم ادب سے لے کر جدید ادب تک نثری و منظوم دونوں ادبی شہ پاروں کو اردو کا جامہ پہنایا گیا؛ بالخصوص درسی ضروریات کے باعث

ایک ایک متن کے کئی کئی تراجم کیے گئے، الگ الگ مترجمین نے الگ الگ عہد اور علاقے میں ترجمے کیے۔

عربی ادب کی اردو میں ترجمہ کردہ کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مترجمین نے ترجمے کے نظریات کی بابت کچھ خاص اظہار خیال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ترجمے پر بحیثیت شعبہ علم گفتگو کا آغاز ابھی بہت جلد ہی ہوا ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ تقریباً تمام مترجمین نے ترجمے کی نوعیت اور ہیئت ضرور ذکر کی ہے خواہ چند لفظوں میں ہی بیان کی ہو۔ ان تراجم کی روشنی میں نظریات یا اظہار خیال کو مداخلت کے پس منظر میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ مترجمین کو ترجمے کی اس دشواری کا علم ہے۔ اسی ساتھ تمام تراجم کو مترجم کے قول کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی چنانچہ ترجمے اور قول میں یکسانیت کم ہی ملی۔ تمام ہی ترجموں میں مداخلت کے شواہد ملے۔ مترجمین نے ترجمے کو زیادہ سے زیادہ قابل استفادہ اور زود فائدہ بنانے کے لیے تسہیل، توضیح، تبیین اور سلاست و روانی سے کام لیا ہے۔ زیادہ تر ترجموں میں عربی اسلوب کی جھلک نظر آئی۔ یوں بھی دیکھنے آیا کہ بعض جگہ بالکل ہی بامحاورہ ترجمہ کیا گیا ہے اور بعض جگہ بالکل ہی متن کی پیروی کی گئی ہے۔

ترجمے میں مداخلت ہونے کے کئی اسباب ہوسکتے ہیں۔ زیر نظر مقالہ میں ان اسباب کو سمیٹ کر چار اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ یہی اسباب بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں دیگر اسباب کی حیثیت ذیلی اور ضمنی ہے جو ان بنیادی اسباب کے تحت شامل ہوسکتے ہیں۔ ان اسباب پر گفتگو کا طریقہ کار یہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے نظریاتی بحث کی گئی اور دوران بحث ہی ہر شق کو مثال کے ذریعہ مضبوطی فراہم کی گئی ہے۔

مداخلت کے مذکورہ اسباب میں پہلا سبب وقوفی ماحول ہے جو عموماً اصل متن کے وقوفی ماحول سے مختلف ہوتا ہے مترجم ترجمہ شدہ متن کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ ان کے لیے نہ نا قابل فہم اور نہ اجنبی ہو۔ اگر ان کو رعایت نہ کی جائے تو ترجمہ قارئین پر بار ہوگا اور اجنبیت و نامانوسیت ان کو شاق گزرے گی۔ مترجم کے سامنے یہ دشواری بھی ہوتی ہے کہ وہ اصل یا ہدفی زبان میں سے صرف کسی ایک کی رعایت نہیں برت سکتا؛ چنانچہ اسے درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے دونوں کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے جس کے لیے اسے مداخلت سے کام لینا پڑتا ہے۔

دوسرا سبب متن کی تسہیل کاری ہے۔ اصل زبان کا متن اپنے مزاج و ماحول کے رنگ میں رچا بسا ہوتا

ہے۔اسے اصل زبان کے قارئین تو بہ آسانی سمجھ جاتے ہیں لیکن ہدفی قارئین کے تفہیمی مرحلہ کو آسان کرنے کے لیے مترجم متن میں سہل کاری کرتا ہے۔ یوں تو یہ کوئی حتمی قاعدہ نہیں ؛ البتہ تجربہ یہی ثابت کرتا ہے کہ ترجمہ شدہ متن عموماً اصل متن کے مقابلے میں آسان ہوتا ہے۔عربی سے اردو میں ادبی تراجم کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوا کہ یہ مداخلت کا ایسا سبب ہے جس کی مثالیں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں۔ مترجم آسان اظہار بیان اختیار کرتا ہے،طویل جملوں کو چھوٹے چھوٹے کئی جملوں میں تقسیم کر دیتا ہے، اگر جملہ مبہم یا پیچیدہ یا پیچیدہ نہ ہو پھر بھی اس کو اچھی طرح واضح کرنے کے لیے توضیحی طریقہ اختیار کرتا ہے، پس منظر میں کوئی واقعہ تو اس کو بیان کر دیتا ہے، عربی میں محذوفات کا رواج بہت ہے جب کہ اردو میں ایسا نہیں ہے چنانچہ ان محذوفات کو ذکر کر دیتا ہے، رموز اوقاف کا التزام نہ کیا گیا ہو تو اس کو درست کر دیتا ہے، یا رموز کے مترشح ہونے والی کیفیت کو الفاظ میں ذکر کر دیتا ہے۔تسہیل متن ترجمہ کا یہ پورا عمل مداخلت کا متقاضی ہوتا ہے۔اردو میں مخففات کی تکمیل کے لیے مداخلت کی جاتی ہے لیکن زیرِ نظر مطالعہ میں عربی ادب سے کوئی ایسی مثال نہیں مل سکی۔ وہ اس لیے بھی کیونکہ مخففات کا استعمال زیادہ تر علمی وسائنسی کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

تیسرا سبب ہدفی زبان کا ڈسکورس ہے۔اگر دونوں زبانوں میں کسی چیز یا معاملہ کے متعلق نقطۂ نظر جدا گانہ ہے تو ترجمہ میں بھی تغیر وتبدل ہونا فطری بن جاتا ہے۔ڈسکورس کا فرق عام طور پر نظریاتی، سیاسی اور عقائد کی سطح پر تفریق کی حامل زبانوں یا تحریروں میں دیکھنے کو مل سکتا ہے۔سیاسی نظریات اس کا ایک اہم سبب ہوتے ہیں چناچہ سیاسی اور صحافتی تحریروں میں میں اس کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ادب میں اس کے کم امکانات ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں تو ایسی زبانوں میں جن میں سیاسی ونظریاتی اختلاف ہو۔ جہاں تک عربی سے اردو میں ترجمے کا معاملہ ہے تو اولاً زیادہ تر تراجم قدیم ادب کے ہیں جدید ادب کے تراجم کی طرف خاطر خواہ توجہ مرکوز نہیں کی گئی ہے، جو ترجمے ہوئے بھی ہیں ان کی دستیابی مشکل رہی۔ نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اردو زبان نظریاتی اور عقائد کی سطح پر عربی سے قریب ہے؛ اس لیے اس کی مثالیں کم مل سکیں۔

چوتھا اور ایک اہم سبب ثقافت ہے۔ثقافت اور زبان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے جو کسی بھی حال میں نہیں چھوٹتا۔ یہ امر دونوں زبانوں کے ساتھ منسلک ہوتا ہے۔ثقافتی عناصر کو منتقل کرنا مترجم کے لیے جوئے

شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ترجمہ کی یہ ایسی منزل ہے جہاں سے مترجم کا سرخرو لوٹنا بڑی کامیابی مانی جاتی ہے۔ایک مخصوص تہذیب وثقافت میں رچی بسی تحریر کو دوسری ثقافہ کا جامہ پہنانا انتہائی دشوار کام ہے۔ثقافتی طور پر بُعد رکھنے والی زبانوں میں ترجمے کے عمل میں یہ منزل بہت کٹھن ہوتی ہے۔لسانی، ثقافتی اور جغرافیائی اعتبار سے قربت رکھنے والی زبانوں میں قدرے آسانی تو ہوتی ہے؛لیکن مکمل ہم آہنگی اور یکسانیت ہوایسا ممکن نہیں ہے۔عربی اور اردو زبان میں بھی کئی اعتبار سے قربت پائی جاتی ہے اس کے باوجود ثقافتی افتراقات موجود ہیں جن کی بہت سی مثالیں بھی دیکھنے کو ملیں۔

جب سبب ہے تو مسبب بھی موجود ہوگا۔علت ہو اور معلول نہ ہو ایسا ممکن ہی نہیں ہے؛ چنانچہ ان اسباب کا اثر اور نتیجہ مداخلت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔سب سے پہلی صورت تو صوتیات ہے۔ زبانوں کا صوتیاتی نظام مختلف ہوتا ہے۔آوازیں اور ان کو ظاہر کرنے والی تحریری علامتیں یعنی حروف تہجی مختلف اور کم وزیادہ ہوتے ہیں۔یہ صورت زیادہ تر ناموں یا ان الفاظ میں پیش آتی ہے جن کو ترجمے میں بعینہ نقل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔عربی کے تمام حروف تہجی اردو میں موجود ہیں اس لیے ایسی دشوار کا امکان بہت ہی کم ہے؛البتہ اس کی کچھ ایسی مثالیں سامنے آئیں کہ عربی کتاب کا اردو ترجمہ انگریزی کے وسیلے سے گیا ایسے تراجم میں تبدیلی در آئی ہے۔اسی طرح فوق قطعاتی صوتیات اور آہنگ کا فرق کی صورت میں بھی مداخلت سے سابقہ پڑتا ہے۔

دوسری صورت ہے الفاظ کی۔ ہر زبان کا معیار مختلف ہوتا ہے،کوئی زبان ترقی یافتہ ہوتی ہے،کوئی ترقی پذیر اور کوئی کم ترقی یافتہ۔زبانوں کے معیار کا اثر ان کے ذخیرہ الفاظ پر پڑتا ہے۔بعض زبانوں میں ذخیرہ الفاظ زیادہ ہوتا ہے بعض میں کم۔ نیز بعض زبانوں میں کسی خاص مضمون و کیفیت کے متعلق الفاظ زیادہ ہوتے ہیں کسی میں دوسرے مضمون و کیفیت کے متعلق ؛ چنانچہ دوران ترجمہ متبادلات کی تلاش کا مرحلہ بہت دشوار گزار بن جاتا ہے۔کبھی لفظ ملتا ہے کبھی مترجم کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ایسی صورت میں وہ لفظ تراشتا یا قریبی الفاظ سے کام چلا لیتا ہے۔یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی لفظ دونوں زبانوں میں استعمال ہوتا لیکن الگ الگ معنوں میں ایسی جگہوں پر معنوی چوک ہوجاتی ہے۔ایک لفظی کے ایک سے زائد

متبادل پیش کر دیے جاتے ہیں حتیٰ کہ ایک متن کے ہم ترجموں میں ایک لفظ کے بالکل متضاد اور بعید المعنی متبادل استعمال کر لیے جاتے ہیں۔

تیسری صورت ہے معنی کی۔ ترجمہ دراصل کیا ہی جاتا ہے معنی ومفہوم کی منتقلی و بیان کے لیے۔ جب مترجم کو الفاظ نہ ملیں وہ دوسرے متبادلات کا استعمال کرے تو ظاہر ہے کہ اصل مفہوم تو متاثر ہوگا ہی۔ دوسرے مترجم کا اپنا نقطۂ نظر، ترجمہ کی پالیسی اور مقصد بھی تو شامل ہوتا ہے۔ ایسا بہت ممکن ہوتا ہے کہ اس طرح کے حالات میں مصنف اور مترجم کے درمیان تضاد قائم ہو، اگر ایسا ہوگا تو اس کا اثر مفہوم پر پڑنا لازمی ہے۔ معنی میں مداخلت کی دو قسم ہے ایک لفظ کی سطح پر یعنی مترجم نے کسی مخصوص لفظ کے معنی ومفہوم میں تبدیلی کر دی، دوسری جملے کی سطح پر۔ جملے کی سطح پر دو طرح کی مداخلت کا امکان ہے: بعض جملے ثقافتی و استعاراتی کیفیت کی وجہ سے نا قابل منتقلی ہوتے ہیں؛ چنانچہ مترجم کو مداخلت کرنی پڑتی ہے، جب کہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا کہ جملے بہ آسانی منتقل ہوسکتا اس کے باوجود مداخلت ہوئی ہے۔ ایک ہی جملے کے ترجمے دو الگ الگ ترجموں میں بالکل متضاد ومختلف معنوں میں کے گئے۔ بعض مقامات پر مترجم ترجمہ کرنے میں جملوں کو حذف بھی کر دیتا ہے۔

چوتھی صورت ہے زبان کے قواعد کی۔ ہر زبان کا اپنا قاعدہ ہوتا ہے جس کے تحت الفاظ تشکیل پاتے ہیں، الفاظ کی بندش اور جملوں کی ترتیب کا نظام بنتا ہے۔ ہر زبان میں عدد کا تصور مختلف ہوتا ہے مثلاً عربی میں تثنیہ کا صیغہ ہے اردو میں نہیں ہے؛ لہذا مترجم یا تو اسے جمع میں تبدیل کر دیتا ہے یا تثنیہ کو عدد میں ظاہر کرتا ہے۔ زبانوں میں تذکیر وتانیث کے نظام میں فرق پایا جاتا ہے، کسی زبان میں دو صنف ہے، کسی میں تین اور کسی میں ہے ہی نہیں۔ عربی اردو ترجمے کے مطالعے میں اس کی مثال دیکھنے کو نہیں ملی کیونکہ اس معاملے میں دونوں زبانیں تقریباً ہم پلہ ہیں۔ قواعد میں جملے کی ترکیبی ساخت کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس طرح کی بہت سے مداخلتوں سے سابقہ پڑا مثال کے طور پر جملے کی ترکیب بدل دی گئی، نکرہ کو معرفہ سے یا معرفہ کو نکرہ سے بدل دیا گیا، مجہول کا معروف سے یا معروف کا مجہول سے ترجمہ کر دیا گیا، موصول، صلہ اور صفت موصوف میں تبدیلی کی گئی، افعال کے زمانے بدل دیے گئے، فاعل ومفعول بدل دیے گئے،

فعل لازم کو فعل متعدی سے بدل دیا گیا۔

پانچویں سطح ہے اسلوب کی ۔ ہر زبان اور ہر مصنف کا اپنا خاص انداز بیان ہوتا ہے۔ ترجمے میں یہ دونوں یکسر بدل جاتی ہیں؛ چنانچہ انداز بیان یا اسلوب کی تبدیلی ایک فطری عمل کی طرح ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات مترجم، مصنف کے طرز تحریر کو گرفت کرنے کوشش کرتا ہے لیکن بہر حال ہدفی زبان اور مترجم کا اپنا رنگ آ ہی جاتا ہے۔ تصنیف اور ترجمے کے پس پشت کارفرما مقاصد بھی اسلوب پر انداز ہوتے ہیں۔ عربی سے اردو میں ترجمہ کے مطالعہ میں طرز کا اختلاف کافی نظر آیا۔

چھٹیں صورت ہے اصناف کی۔ اس کا تعلق ادبی ترجمے کے ساتھ خاص ہے۔ ہر زبان میں یکساں اصناف سخن نہیں پائی جاتی ہیں نیز اصناف سخن ترجمے کے وسیلے سے ایک زبان سے دوسری زبان کا حصہ بھی بنتی ہیں۔ زیر نظر مطالعہ میں صنف کو صرف ادب کی بنیادی تقسیم یا نظم و نثر تک محدود رکھا گیا ہے۔ مثالی صورت حال تو یہ ہے کہ نثر کا ترجمہ نظم میں ہو اور نظم کا نظم میں لیکن حقیقی صورت حال ایسی نہیں ہے۔ نثر کے منظوم تراجم اور نظم کے نثری تراجم کی روایت عام ہے۔ تجربہ و مشاہدہ یہ ثابت کرتا ہے کہ نثر کے منظوم ترجمے کم ہوتے ہیں جب کہ نظم کے نثری ترجمے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کا برعکس قسم میں ترجمہ مداخلت کے ذیل میں آتا ہے۔ نثر کے منظوم ترجموں میں قرآن کے تراجم دیکھنے کو ملے۔ قدیم و جدید نظم کے نثری تراجم بہت ملے۔

ساتویں اور آخری صورت ہے ہیئت کی۔ اس کا بھی تعلق ادبی ترجمے بالخصوص شعری ترجمے سے ہے۔ اس کی مثال اسی صورت میں مل سکتی ہے جب نظم کا منظوم ترجمہ کیا جائے اور ایسے مواد دستیاب نہیں ہوئے اس لیے کی مثال دیکھنے کو کم ملی۔ صرف متنبّی کا ایک منظوم ترجمہ نظر سے گذرا۔ اس میں بھی شعر کا شعر میں ترجمہ کرنے کے بجائے پہلے نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے اور پھر اس ترجمے کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں مذکورہ بحث سے اتنی بات تو ظاہر ہوگئی کہ مداخلت ترجمہ کا ناگزیر حصہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ یہ کوئی ایسا عمل نہیں ہے جو ترجمہ کو ناپسندیدہ ناقابل اعتماد بناتا

ہے؛ بلکہ حقیقی بات تو یہ ہے کہ اسی عمل کی وجہ سے ترجمہ کی روایت زندہ ہے۔اسی گنجائش کی وجہ سے زبانیں ایک دوسرے سے استفادہ کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔اگر اصل متن کا ہو بہو عکس ہدفی زبان میں پیش کر دیا جائے (اگر ایسا کرنا ممکن ہو پائے) تو ہدفی زبان کے لیے نا قابل قبول ہوگا اور اگر صرف ہدفی زبان کے ہی تقاضوں کو پورا کیا جائے تو ترجمہ کا فائدہ ہی کیا ہوگا،اس سے بہتر تو تخلیق ہے۔مداخلت ایک درمیانی اور متوسط راستہ اور صورت حال پیدا کرتی ہے۔جس سے آہستہ آہستہ ہدفی زبان شہد کی مکھی کی مانند رس چوستی ہے اور پھر ایک وقت وہ آتا ہے کہ شہد کا ایک چھتہ تیار ہو جاتا ہے۔

ترجمہ مداخلت میں بالذات کوئی منفی عمل نہیں ہے۔الا یہ کہ مترجم بالارادہ کسی مقصد براری کے لیے متن کو توڑ مروڑ کر پیش کرے۔مداخلت کا عمل دراصل کسی بے آب و گیاہ،چٹیل میدان میں شدت بھوک میں کسی باغ سے بلا اجازت پھل کھا لینے کا نام ہے۔دراصل زبانیں علمی،لسانی اور ادبی بھوک میں مبتلا ہوتی ہیں۔انہیں ایسی زبانیں نظر آتی ہیں جن کا دامن بھرا ہوتا ہے۔وہ وہاں سے استفادہ کرنا چاہتی ہیں لیکن اس راہ میں مختلف قسم کی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں وہ ان رکاوٹوں سے سمجھوتہ کر کے اپنے مقصد کی چیز حاصل کر لیتی ہیں۔ظاہر ہے کہ ان کا یہ عمل فی نفسہ غلط و ناجائز نہیں ہے۔البتہ اس قدر مداخلت نہ کی جائے کہ اصل متن کا مفہوم ومنشاء ہی غارت ہو جائے۔

یہ ایک اطلاقی مطالعہ ہے۔نظریہ مداخلت کے اطلاق کے لیے عربی سے اردو میں ترجمہ کردہ منتخب ادبی کتب کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔محض عربی زبان اور ادبی کتب تک محدود ہونے کی وجہ سے کچھ شقوں میں مداخلت کی مثالیں کم دیکھنے کو ملیں؛ کیونکہ مداخلت کے اجزا کے وقوع کا انحصار موضوع پر بھی ہے اور مضمون پر بھی ہے۔علمی تحریروں میں کچھ خاص طرح کی مداخلت دیکھنے کو ملے گی،صحافتی تحریروں میں کچھ اور ادبی میں کچھ۔مطالعہ کو مزید جامع اور مدلل بنانے کے لیے زائد از ایک زبان اور مضمون کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح مداخلت کسی ایک شق پر تفصیلی تحقیق ہو مثال کے طور پر ثقافت اور مداخلت کو الگ الگ زبان کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے اور صرف ثقافت تک ہی محدود رہتے ہوئے ہر نوعیت سے مطالعہ کیا جائے۔

زیرنظر تحقیق اپنی نوعیت کے اولین مطالعہ میں سے ایک ہے، خصوصاً اردو زبان کا دامن تو اس سے بالکل ہی خالی ہے۔ اس لیے بنیادی مباحث پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ آئندہ اگر اس کام کو آگے بڑھایا جائے تو ہر ہر جز کو تمام تر ممکنہ تفصیل کے ساتھ مزید جامعیت کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مداخلت کے اطلاقی ساتھ اس کی حدود و قیود قائم کرنے کی بھی پیش رفت کی جا سکتی ہے؛ کیوں کہ مداخلت کو بے لگام کر دینا مستحسن نہیں ہے۔ اتنی بات ضرور ہے کہ یہ کام کسی ماہر و مشاق اور تجربہ کار محقق کے لیے ہی ممکن و مناسب ہے۔

لسانی حیثیت سے اردو اور عربی کے تعلقات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور مختلف نوعیّتوں سے اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مذہبی ترجموں کی روایت پر بھی کام ہوا ہے اور ان کا تقابلی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ لیکن ادبی ترجموں کی روایت اور ان کی فنی قدر و قیمت پر کوئی باضابطہ کام نہیں ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو میں عربی زبان سے کئے گئے ادبی ترجموں کی روایت کا باضابطہ جائزہ لیا جائے تا کہ یہ بات کھل کر سامنے آ سکے کہ کس دور میں عربی ادب کے ترجمہ کیا صورت حال رہی ہے وہ کون کون سی کتابیں ہیں جن کے ترجمے ہوئے ہیں اور ترجمہ کا یہ عمل کن لوگوں نے انجام دیا ہے۔ کن کن اصناف سخن کا ترجمہ ہوا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا سے لے کر اب تک ترجمے کا کیا تسلسل رہا ہے۔ قدیم ادب کے ساتھ ساتھ جدید ادب کے ترجموں کی کیا صورت حال ہے۔ تا کہ اس میدان میں جو بھی کوششیں ہوئی ہیں اس کو منظر عام پر لایا جائے، اور جن شخصیات نے اس سلسلہ میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کو یکجا پیش کر کے ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا جائے۔ نیز ان ترجموں کا ادبی وفنی تجزیہ بھی پیش کیا جائے تا کہ ان ترجموں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو۔ اور اردو کے عربی سے ادبی استفادہ کی واضح نشان دہی ہو۔

ترجمہ میں مداخلت: ایک اطلاقی مطالعہ

(اردو میں عربی ادب کی ترجمہ کردہ منتخب کتابوں کے حوالے سے)

مقالہ برائے

پی ایچ ڈی

2015-2019

تحقیق کار

محمد طارق

رول نمبر A161122

نگران کار

ڈاکٹر سید محمود کاظمی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ ترجمہ

شعبہ ترجمہ

اسکول برائے السنہ، لسانیات و ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد

500032

کتابیات

اردو، عربی اور ترجمہ شدہ کتابیں

1. ابن المقفع، عبداللہ۔(1980)۔کلیلہ ودمنہ۔ بیروت: دار المسیرہ
2. اجراوی، ابرار احمد۔(2018)۔عربی ادبیات کے اردو تراجم تحقیق وتنقید۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
3. احمد، جمشید (مرتب)۔الکمالات الوحیدیہ شرح المقامات الحریریہ۔ کراچی: مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ
4. احمد، حسن الدین۔(1984)۔انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ۔ چارکمان حیدرآباد: نیشنل پریس
5. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر۔اردو غزل کی تکنیک اور ہیئت کے خدوخال
6. اسداللہ قاسمی۔المتجلی شرح اردو منتخبات دیوان متنبیؔ۔ دیوبند: مکتبہ صوت القرآن
7. اسیر، نظام الدین ادروی۔ دیوان المتنبی، کراچی: قدیمی کتب خانہ
8. اشرف، بلال۔(2010)۔بیان المختارات ترجمہ مختارات من ادب العربی۔ لاہور: دار الکتب السّلفیہ
9. اشعر، حبیب۔(1954)۔شہناز۔ دہلی: یونین پریس
10. اشعر، حبیب۔(1950)۔رخسانہ۔ چوک انارکلی لاہور: مکتبہ ادب
11. اعجاز راہی۔(1986)۔اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل (روداد سیمینار)۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان
12. اقتدار حسین۔(1994)۔صوتیات وفونیمیات۔نئی دہلی: ترقی اردو بیورو
13. اقتدار احسین۔(1998)۔اردو صرف ونحو۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
14. امین، محمد کھوکھر، یسین، محمد قصوری۔ دیوان المتنبی۔اردو بازار لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز
15. انجم، خلیق۔(1996)۔فن ترجمہ نگاری۔نئی دہلی: ثمر آفسٹ پرنٹرز
16. انور، خورشید۔(2016)۔دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں۔نہٹور: مکتبہ خورشید مدنی
17. باکثیر، علی احمد۔من فوق سبع سماوات۔مصر: مکتبہ مصر
18. باکثیر، علی احمد۔قطط وفیران۔مصر: مکتبہ مصر
19. بیگ، فیضان اللہ۔(2010)۔آئین نو۔علی گڈھ: اے ایم یو شعبہ عربی
20. جائسی، علیم اشرف۔فصول فی التعریف بالھند العربیہ الاسلامیہ
21. چند، گیان۔(1987)۔اردو کی نثری داستانیں۔لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی
22. حامد بیگ، مرزا۔(2005)۔ترجمہ کا فن۔ دہلی: کتابی دنیا
23. حامد بیگ، مرزا۔(2016)۔اردو ترجمے کی روایت 1786 تا حال۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
24. حسین، احتشام۔(1971)۔ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔لکھنؤ: دانش محل امین الدولہ پارک
25. حسین، اقتدار۔(1994)۔صوتیات وفونیمیات۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
26. حسین، انتظار۔سعید کی پراسرار زندگی۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز
27. حسین، سجاد۔(1357ھ)۔التوشیحات علی السبع العلقات، آرام باغ کراچی: میر محمد کتب خانہ

28. حسین، محمد نور۔(2011)۔تشریحات شرح اردو مقامات حریری۔اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی: دارالاشاعت

29. حسین، محمد نور، ارکانی، محمد صدیق۔(2009)۔مطر السماء شرح باب الحماسہ۔اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی: دارالاشاعت

30. حمزہ، میمونہ۔(2014)۔صرف پانچ منٹ۔نئی دہلی: منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

31. حنیف، رفیع الدین۔(2014)۔کلیلہ ودمنہ۔حیدرآباد: قبا گرافکس

32. حنیف، محمد۔(1997)۔تحفۃ الادب شرح اردو نفحۃ العرب۔اردو بازار کراچی: دارالاشاعت

33. خاور بٹ، قلب بشیر۔(2010)۔عالم بالا کے سائے میں۔لاہور: الفیصل

34. رفیق، محمد۔(2014)۔منتخب عربی اشعار۔لاہور: مکتبہ قرآنیات

35. سعید، طارق۔(1996)۔اسلوب اور اسلوبیات۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

36. سیف، عتیق الرحمٰن۔(1426ھ)۔لمعات الذہب فی شرح مختارات الادب۔کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی

37. شہیم خان، ڈاکٹر۔(2009)۔کلام فیض کے انگریزی تراجم (محاسن ومعائب)۔دہلی: کاک آفسیٹ پرنٹرس

38. صالح صبحی۔(1962)۔دراسات فی فقہ اللغۃ (طبع دوم)۔بیروت: منشورات المکتبہ الاہلیہ

39. طاہر الاسلام قاسمی۔(2008)۔دیوان امام شافعی۔دیوبند: دارالمعارف

40. طاہر الاسلام قاسمی۔(2007)۔دیوان حضرت علیؓ۔دیوبند: دارالمعارف

41. طیب، عبدالرحمٰن۔(2012)۔رشتوں کے رنگ۔نئی دہلی: البلاغ پبلی کیشنز

42. عابد علی عابد۔(1960)۔اصول انتقاد ادبیات۔لاہور: مجلس ترقی ادب

43. عباسی، ابن الحسن۔(2009)۔درس مقامات۔کراچی: مکتبہ فاروقیہ شاہ فیصل ٹاؤن

44. عباسی، ابن الحسن۔(2008)۔توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ (گیارھواں ایڈیشن)۔شاہ فیصل کالونی کراچی: مکتبہ عمر فاروق

45. عبدالحفیظ۔اشرف الادب مترجم وشرح اردو نفحۃ العرب۔آرام باغ کراچی: قدیمی کتب خانہ

46. عبدالحق، مولوی۔(2001)۔اردو صرف ونحو۔انجمن ترقی اردو (ہند)

47. عبدالخالق آزاد، مفتی۔قران حکیم کے ترجمے کے اصول وقوانین اور ترجمہ نگاری کی روایت کا تسلسل

48. عبدالرحمٰن، ابواسامہ۔(2006)۔مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب۔ملتان: مکتبہ امدادیہ

49. عبدالغفور۔(2008)۔تیسیر مقامات۔کراچی: دارالقلم سائٹ

50. عبداللہ، سید۔کشاف تنقیدی اصطلاحات

51. عبداللہ کاپودروی۔دیوان امام شافعی۔جمبوسر: شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن

52. عبدالواحد وافی، علی۔(1962)۔علم اللغہ (طبع پنجم)۔مصر: مکتبہ نہضہ

53. عزیزی، صادق الامین (مولف)۔دروس مقامات۔کراچی: مکتبہ الاسلام

54. علی، ابوالحسن۔(1991)۔مختارات من ادب العرب۔کراچی: مجلس نشریات اسلام

55. علی، محمد اعزاز۔دیوان المتنبی۔ملتان: مکتبہ حقانیہ

56. فاروقی، محمد ابوبکر (مرتب)۔(2016)۔تراجم کے مباحث۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ

57. قمر رئیس، ڈاکٹر۔(2004)۔ترجمہ کا فن اور روایت۔علی گڈھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس

58. کمال، عائشہ۔(2002)۔بارش تلے محبت۔بھوپال: برکت اللہ یونیورسٹی

59. مجلس المدینۃ العلمیہ (دعوت اسلامی)۔(2008)۔اتقان الفراسہ فی شرح دیوان الحماسہ، باب المدینہ کراچی: مکتبہ المدینہ

60. محمد حسن، یوسف۔(2006)۔کیف تترجم؟

61. محمد خان، یار۔(2012)۔شرح دیوان المتنبی۔شیخوپورہ: مکتبہ اشرفیہ

62. محمد رابع حسنی۔(2005)۔غبار کارواں۔لکھنؤ: رابطہ ادب اسلامی ندوۃ العلماء

63. محمود، خالد۔(2005)۔انوارات اردو ترجمہ مختارات۔لاہور: دار القلم

64. مصلح الدین۔(2004)۔تکمیل الادب شرح اردو نفحۃ العرب۔اردو بازار لاہور: مکتبہ رحمانیہ

65. مونس، پرکاش۔(1978)۔اردو ادب میں ہندی ادب کے رجحانات (طبع اول)۔الہ آباد: مطبع نیشنل آرٹ پریس

66. نارنگ، گوپی چند۔(2004)۔ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

67. وحید، مصطفیٰ (ناشر)۔(1995)۔دیوان حضرت علی۔لاہور

68. ہبہ الدباغ، خمس دقائق وحسب

انگریزی کتابیں

69. Anthony Pym. 2014. Exploring Translation Theories. Second edition. London/New York: Routledge.

70. Baker Mona,2006. In Other Words, A Course Book on Translation, Rotledge, Tylor & Francis Group, London and New Yark.

71. Baker, Mona, and Gabriela Saldanha (eds). 2009. Routledge Encyclopedia of Translation Studies. Second edition. London/New York: Routledge.

72. Baker, Mona ed. (2001). Routledge Encyclopedia of Translation Studies. New York and London: Routledge

73. Bassnett McGurie, S. (1980), Translation Studies, London Methuen

74. Bassnett, Susan (1980/1991/2002). Translation Studies. New York and London: Routledge.

75. Benjamin, Walter (1923). "The Task of the Translator," an introduction to the translation of Les fleurs du mal by Baudelaire.

76. Bijay Kumar Das, A Handbook of Translation Studies, Atlantic Publishers & Distributors(P)LTD, 2008

77. Carter, R.(1982) Linguistics and the Teacher. London, Routledge and Kegan Paul Ltd

78. Célia Maria Magalh?es UFMG, DISCOURSE AND TRANSLATION STUDIES: A CASE STUDY OF GENRE INTERTEXTUALITY
79. Claudiu Mihaila, Traslation Studies: Simplification and Explicitation Universals
80. Divid Katan, Translating Culture, Introduction for Translators, Interpretors and Mediators, second edition, Routledge
81. David Matsumoto,Culture and Nonverbal Behavior San Francisco State University
82. Eugene Albert Nid, Llanguage Structure and Translation
83. Gambier, Yves, and Luc van Doorslaer (eds). 2010-2013. Handbook of Translation Studies. 4 vols. Amsterdam/Philadelphia: John Benjamins.
84. Ghazala, Hasan. 2008 Translation as Problems and Solution, Dar El-Ilm Lilmalayin
85. Hatim, Basil & Ian Mason (1990): Discourse and the Translator, London: Longman
86. Hatim, B. & J. Munday (2004): Translation. An advanced resource book, London: Routledge.
87. Hofstede, G. (1991). Cultures and Organizations: Software of the Mind. London, UK: McGraw-Hill.
88. Hermans, Theo. 2014 (1999). Translation in Systems. Descriptive and System-oriented Approaches Explained. Abingdon/New York: Routledge.
89. Jeremy Munday, (2008). Introducing Translation Studies. London and New York: Routledge
90. Jeremy Munday, Translation as Intervention, Continuum International, Publishing Group, London, 2007
91. Katan, David (1999): Translating cultures: an introduction for translators, interpreters and mediators, Manchester: St. Jerome.
92. Ketaki Kushari Dyson, Translation: the Magical Bridge Between Cultures.
93. Madan M. Sharma, Translating Shakespeare Intervention and Universals in Traslation.
94. Madan M. Sarma, Translating Shakespeare Intervention and Universals
95. Mason, Ian (1992) "Discourse, Ideology and Translation", Language, Discourse and Translation in the West and Middle East edited by Robert de Beaugrande, Abdullah Shunaq and Mohammed Helmy Heliel, Amsterdam/Philadelphia, John Benjamines Publishing Company, 25
96. Miletich Marko, Reading Gender in Translation: Translator's Intervention in Issac Chocron's "Pronombres Personales".
97. Nida, A. & C. R. Taber (1969): The Theory and Practice of Translation, Leiden: E. J. Brill.
98. P. K. Kalyani, Translation Studies, Creative Books, New Delhi, 2001

99. Robinson, D. (1997b):What is translation? : centrifugal theories, critical interventions Kent Ohio: Kent State University Press.
100. Robinson, Douglas. (1991). The Translator's Turn. Baltimore and London: Johns Hopkins University Press.
101. Roy Longer, The Concept of Discourse in the Analysis of Complex Communication events, january, 1998
102. Sara Laviosa, Corpus-based Translation Studies: Theory, Findings, Applications
103. S. R Faruqu, Language, Literature and Translation. R. S. Gupta(ed) Literary Translation, Creative Books, New Delhi, 1999
104. Susan Petrilli (ed.). Translation Translation. Amsterdam/New York: Rodopi, 2003
105. Toury, Gideon. 2012. Descriptive Translation Studies and Beyond. Revised edition. Amsterdam/Philadelphia: John Benjamins.
106. Venuti, Lawrence. (2012). The Translation Studies Reader, 3rd ed. London: Routledge
107. Vennuti, L. (2000): The Translation Studies Reader, London: Routledge.
108. Vinay, Jean Paul and Jean Darbelnet. "A Methodology for Translation". The Translation Studies Reader. Ed. Lawrence Venuti. London: Routledge, 2000
109. ViVian Cook and Benedetta Bassetti, Language and Bilingual Cognition,
110. Wills, W. (1996): Knowledge and Skills in Translation Behavior, Amsterdam: John Benjamins.
111. Yu Yuan, Universals of Translation: A Corpus-based Investigation of Chinese Translated Fiction.
112. Zoher Shevit, Politics of Children Literature, The University of Geargia Press, Athens and London, 1986

لغات وفرہنگ

113. فرہنگ ادبی اصطلاحات، کلیم الدین احمد، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1987
114. فرہنگ آصفیہ
115. قومی انگریزی اردو لغت، ڈاکٹر جمیل جالبی
116. فیروز اللغات، مولوی فیروز الدین
117. المورد الحدیث، قاموس انکلیزی۔عربی، منیر البعلبکی
118. The Standard Enghlish Urdu Dictionary، مولوی عبدالحق
119. The Oxford English Dictionary, second edition
120. Oxford Advanced Lerner's Dictionary, 8th edition

121. English Urdu Dictionary, Beurue for Promotion of Urdu

122. The Oxford English Urdu Dictionary، شان الحق حقی

123. وحید الزماں قاسمی کیرانوی، القاموس الوحید

124. عبدالحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات

رسائل و جرائد

125. Canadian Social Science, Vol.5 No.1 February 2009, A Cognitive-Pragmatic Model for Translation Studies Based on Relevance and Adaptation, Chang Zixia

126. الحذف فی اللغة العربية، ا۔ م۔ د۔ یونس حمش خلف محمد، مجله ابحاث كلية التربية الاساسية ،جلد10،عدد2،ص283

127. Journal of the College of Arts. University of Basrah No. (51) 2010)Discourse Analysis for Translation with Special Reference to the Consecutive Interpreter's Training, Abdul Salam Abdul Majeed Sayfuldeen.

128. Journal of Academic and Applied Studies (Special Issue on Applied Linguistics) Vol. 3 (8) August 2013, pp. 13-21, The Role of Culture in Translation, Monireh Akbari,Franco Aixela (1996)

129. Academic Journal of Interdisciplinary Studies Published by MCSER-CEMAS-Sapienza University of Rome, Vol 2, No 1,March 2013. Applying Critical Discourse Analysis in Translation of Political Speeches and Interviews

130. V. N. Komissarov TTR: traduction, terminologie, rédaction, vol. 4,n 1,1991,Language and Culture in Translation: Competitors or Collaborators?

131. ELT Journal Volume 54/4 October 2000 © Oxford University Press 2000, Wenying Jiang, The relationship between culture and language.

132. INJAl, vol.XX,no. 4, 1954, J.B.Casagrande, "TheEnds of Translation."

133.
جرنل آف اسلامک اینڈ ریلیجس اسٹیڈیز، جنوری-جون، 2018

ویب سائٹس

134. The Importance of Translation, (posted on February 18, 2013, by Mattingdigo),http://indigotrust.org. uk/2013/02/18/the-importance-of-translation/

135. BHASHA | GANESH DEVY | PEOPLE'S LINGUISTIC SURVEY OF INDIA ,(http://blogs.reuters.com/india/2013/09/07/india-speaks-780-languages-220-lost-in-last

136. http://en.wikipedia.org/wiki/Languages_of_India

137. http://www.anukriti.net/pgdts/course411/ch1h.html
138. Zttp://translation-blog.trustedtranslations.com./translating-acronyms-and-abbreviat ions-2012-06-07.html)
139. Dealing with Abbreviations In Translation,By Adetola Bankole,Department of Foreign Languages, Lagos State University, http:// www. translationdirectory. com/ articles/article1201.h
140. http://www.wisegeek.org/what-is-discourse.htm
141. http://www.massey.ac.nz/~alock/theory/foucault.htm
142. http://go.war wic kac.uk/globalpadint ercultural)
143. http://www.startimes.com/f.aspx?t=30872875
144. http://fridayspecial.com.pk/17567
145. https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_English_words_of_Arabic_origin_(A-B)
146. http://www.darululoom-deoband.com/urdu/magaznew//tmp/07-Quran%20Hakim%20 Ke%20Tarjume_MDU_10-11_Oct%20&%20Nov_ 12.ht)

کتابیات

اردو، عربی اور ترجمہ شدہ کتابیں

1. ابن المقفع، عبداللہ۔(1980)۔کلیلہ و دمنہ۔بیروت: دارالمسیر ہ
2. اجراوی، ابرار احمد۔(2018)۔عربی ادبیات کے اردو تراجم تحقیق و تنقید۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
3. احمد، جمشید (مرتب)۔الکمالات الوحیدیہ شرح المقامات الحریریہ۔کراچی: مکتبہ خدیجۃ الکبریٰ
4. احمد، حسن الدین۔(1984)۔انگریزی شاعری کے منظوم اردو ترجموں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔چارکمان حیدرآباد: نیشنل پریس
5. ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر۔اردو غزل کی تکنیک اور ہیئت کے خدوخال
6. اسداللہ قاسمی۔المتجلی شرح اردو منتخبات دیوان متنبّی۔دیوبند: مکتبہ صوت القرآن
7. اسیر، نظام الدین ادروی۔دیوان المتنبی، کراچی: قدیمی کتب خانہ
8. اشرف، بلال۔(2010)۔بیان المختارات ترجمہ مختارات من ادب العربی۔لاہور: دار الکتب السّلفیہ
9. اشعر، حبیب۔(1954)۔شہناز۔دہلی: یونین پریس
10. اشعر، حبیب۔(1950)۔رخسانہ۔چوک انارکلی لاہور: مکتبہ ادب
11. اعجاز راہی۔(1986)۔اردو زبان میں ترجمہ کے مسائل (روداد سیمینار)۔اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان
12. اقتدار حسین۔(1994)۔صوتیات و فونیمیات۔نئی دہلی: ترقی اردو بیورو
13. اقتدار احسین۔(1998)۔اردو صرف ونحو۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
14. امین، محمد کھوکھر، یسین، محمد قصوری۔دیوان المتنبی۔اردو بازار لاہور: شیخ محمد بشیر اینڈ سنز
15. انجم، خلیق۔(1996)۔فن ترجمہ نگاری۔نئی دہلی: ثمر آفسٹ پرنٹرز
16. انور، خورشید۔(2016)۔دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں۔نہٹور: مکتبہ خورشید مدنی
17. باکثیر، علی احمد۔من فوق سبع سماوات۔مصر: مکتبہ مصر
18. باکثیر، علی احمد۔قطط و فیران۔مصر: مکتبہ مصر
19. بیگ، فیضان اللہ۔(2010)۔آئین نو۔علی گڈھ: اے ایم یو شعبہ عربی
20. جائسی، علیم اشرف۔فصول فی التعریف بالھند العربیہ الاسلامیہ
21. چند، گیان۔(1987)۔اردو کی نثری داستانیں۔لکھنؤ: اترپردیش اردو اکادمی
22. حامد بیگ، مرزا۔(2005)۔ترجمہ کا فن۔دہلی: کتابی دنیا
23. حامد بیگ، مرزا۔(2016)۔اردو ترجمے کی روایت 1786 تا حال۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
24. حسین، احتشام۔(1971)۔ہندوستانی لسانیات کا خاکہ۔لکھنؤ: دانش محل امین الدولہ پارک
25. حسین، اقتدار۔(1994)۔صوتیات و فونیمیات۔نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
26. حسین، انتظار۔سعید کی پراسرار زندگی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز
27. حسین، سجاد۔(1357ھ)۔التوشیحات علی السبع العلقات، آرام باغ کراچی: میر محمد کتب خانہ

28. حسین، محمد نور۔(2011)۔تشریحات شرح اردو مقامات حریری۔اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی: دارالاشاعت

29. حسین، محمد نور، ارکانی، محمد صدیق۔(2009)۔مطر السماء شرح باب الحماسہ۔اردو بازار ایم اے جناح روڈ کراچی: دارالاشاعت

30. حمزہ، میمونہ۔(2014)۔صرف پانچ منٹ۔نئی دہلی: منشورات پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

31. حنیف، رفیع الدین۔(2014)۔کلیلہ ودمنہ۔حیدرآباد: قبا گرافکس

32. حنیف، محمد۔(1997)۔تحفۃ الادب شرح اردو نفحۃ العرب۔اردو بازار کراچی: دارالاشاعت

33. خاور بٹ، قلب بشیر۔(2010)۔عالم بالا کے سائے میں۔لاہور: الفیصل

34. رفیق، محمد۔(2014)۔منتخب عربی اشعار۔لاہور: مکتبہ قرآنیات

35. سعید، طارق۔(1996)۔اسلوب اور اسلوبیات۔دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

36. سیف، عتیق الرحمٰن۔(1426ھ)۔لمعات الذہب فی شرح مختارات الادب۔کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی

37. شہیم خان، ڈاکٹر۔(2009)۔کلام فیض کے انگریزی تراجم (محاسن ومعائب)۔دہلی: کاک آفسیٹ پرنٹرس

38. صالح صبحی۔(1962)۔دراسات فی فقہ اللغہ (طبع دوم)۔بیروت: منشورات المکتبہ الاہلیہ

39. طاہر الاسلام قاسمی۔(2008)۔دیوان امام شافعی۔دیوبند: دارالمعارف

40. طاہر الاسلام قاسمی۔(2007)۔دیوان حضرت علیؓ۔دیوبند: دارالمعارف

41. طیب، عبدالرحمٰن۔(2012)۔رشتوں کے رنگ۔نئی دہلی: البلاغ پبلی کیشنز

42. عابد علی عابد۔(1960)۔اصول انتقاد ادبیات۔لاہور: مجلس ترقی ادب

43. عباسی، ابن الحسن۔(2009)۔درس مقامات۔کراچی: مکتبہ فاروقیہ شاہ فیصل ٹاؤن

44. عباسی، ابن الحسن۔(2008)۔توضیح الدراسہ فی شرح الحماسہ (گیارھواں ایڈیشن)۔شاہ فیصل کالونی کراچی: مکتبہ عمر فاروق

45. عبدالحفیظ۔اشرف الادب مترجَم وشرح اردو نفحۃ العرب۔آرام باغ کراچی: قدیمی کتب خانہ

46. عبدالحق، مولوی۔(2001)۔اردو صرف ونحو۔انجمن ترقی اردو (ہند)

47. عبدالخالق آزاد، مفتی۔قران حکیم کے ترجمے کے اصول وقوانین اور ترجمہ نگاری کی روایت کا تسلسل

48. عبدالرحمٰن، ابواسامہ۔(2006)۔مبشرات فی حل مختارات من ادب العرب۔ملتان: مکتبہ امدادیہ

49. عبدالغفور۔(2008)۔تیسیر مقامات۔کراچی: دارالقلم سائٹ

50. عبداللہ، سید۔کشاف تنقیدی اصطلاحات

51. عبداللہ کاپودروی۔دیوان امام شافعی۔جمبوسر: شعبہ نشر واشاعت جامعہ علوم القرآن

52. عبدالواحد وافی، علی۔(1962)۔علم اللغہ (طبع پنجم)۔مصر: مکتبہ نہضہ

53. عزیزی، صادق الامین (مولف)۔دروس مقامات۔کراچی: مکتبہ الاسلام

54. علی، ابوالحسن۔(1991)۔مختارات من ادب العرب۔کراچی: مجلس نشریات اسلام

55. علی، محمد اعزاز۔دیوان المتنبی۔ملتان: مکتبہ حقانیہ

56. فاروقی، محمد ابوبکر (مرتب)۔(2016)۔تراجم کے مباحث۔کراچی: سٹی بک پوائنٹ

57. قمر رئیس، ڈاکٹر۔(2004)۔ترجمہ کا فن اور روایت۔علی گڈھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس

58. کمال، عائشہ۔(2002)۔بارش تلے محبت۔بھوپال:برکت اللہ یونیورسٹی

59. مجلس المدینہ العلمیہ (دعوت اسلامی)۔(2008)۔اتقان الفراسہ فی شرح دیوان الحماسہ،باب المدینہ کراچی:مکتبہ المدینہ

60. محمد حسن، یوسف۔(2006)۔کیف تترجم؟

61. محمد خان، یار۔(2012)۔شرح دیوان المتنبی۔شیخوپورہ:مکتبہ اشرفیہ

62. محمد رابع حسنی۔(2005)۔غبار کارواں۔لکھنؤ:رابطہ ادب اسلامی ندوۃ العلماء

63. محمود، خالد۔(2005)۔انوارات اردو ترجمہ مختارات۔لاہور:دار القلم

64. مصلح الدین۔(2004)۔تکمیل الادب شرح اردو نفحۃ العرب۔اردو بازار لاہور:مکتبہ رحمانیہ

65. مونس، پرکاش۔(1978)۔اردو ادب میں ہندی ادب کے رجحانات (طبع اول)۔الہ آباد:مطبع نیشنل آرٹ پریس

66. نارنگ، گوپی چند۔(2004)۔ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

67. وحید، مصطفیٰ (ناشر)۔(1995)۔دیوان حضرت علی۔لاہور

68. ہبہ الدباغ، خمس دقائق وحسب

انگریزی کتابیں

69. Anthony Pym. 2014. Exploring Translation Theories. Second edition. London/New York: Routledge.

70. Baker Mona,2006. In Other Words, A Course Book on Translation, Rotledge, Tylor & Francis Group, London and New Yark.

71. Baker, Mona, and Gabriela Saldanha (eds). 2009. Routledge Encyclopedia of Translation Studies. Second edition. London/New York: Routledge.

72. Baker, Mona ed. (2001). Routledge Encyclopedia of Translation Studies. New York and London: Routledge

73. Bassnett McGurie, S. (1980), Translation Studies, London Methuen

74. Bassnett, Susan (1980/1991/2002). Translation Studies. New York and London: Routledge.

75. Benjamin, Walter (1923). "The Task of the Translator," an introduction to the translation of Les fleurs du mal by Baudelaire.

76. Bijay Kumar Das, A Handbook of Translation Studies, Atlantic Publishers & Distributors(P)LTD, 2008

77. Carter, R.(1982) Linguistics and the Teacher. London, Routledge and Kegan Paul Ltd

78. Célia Maria Magalh?es UFMG, DISCOURSE AND TRANSLATION STUDIES: A CASE STUDY OF GENRE INTERTEXTUALITY
79. Claudiu Mihaila, Traslation Studies: Simplification and Explicitation Universals
80. Divid Katan, Translating Culture, Introduction for Translators, Interpretors and Mediators, second edition, Routledge
81. David Matsumoto,Culture and Nonverbal Behavior San Francisco State University
82. Eugene Albert Nid, Llanguage Structure and Translation
83. Gambier, Yves, and Luc van Doorslaer (eds). 2010-2013. Handbook of Translation Studies. 4 vols. Amsterdam/Philadelphia: John Benjamins.
84. Ghazala, Hasan. 2008 Translation as Problems and Solution, Dar El-Ilm Lilmalayin
85. Hatim, Basil & Ian Mason (1990): Discourse and the Translator, London: Longman
86. Hatim, B. & J. Munday (2004): Translation. An advanced resource book, London: Routledge.
87. Hofstede, G. (1991). Cultures and Organizations: Software of the Mind. London, UK: McGraw-Hill.
88. Hermans, Theo. 2014 (1999). Translation in Systems. Descriptive and System-oriented Approaches Explained. Abingdon/New York: Routledge.
89. Jeremy Munday, (2008). Introducing Translation Studies. London and New York: Routledge
90. Jeremy Munday, Translation as Intervention, Continuum International, Publishing Group, London, 2007
91. Katan, David (1999): Translating cultures: an introduction for translators, interpreters and mediators, Manchester: St. Jerome.
92. Ketaki Kushari Dyson, Translation: the Magical Bridge Between Cultures.
93. Madan M. Sharma, Translating Shakespeare Intervention and Universals in Traslation.
94. Madan M. Sarma, Translating Shakespeare Intervention and Universals
95. Mason, Ian (1992) "Discourse, Ideology and Translation", Language, Discourse and Translation in the West and Middle East edited by Robert de Beaugrande, Abdullah Shunaq and Mohammed Helmy Heliel, Amsterdam/Philadelphia, John Benjamines Publishing Company, 25
96. Miletich Marko, Reading Gender in Translation: Translator's Intervention in Issac Chocron's "Pronombres Personales".
97. Nida, A. & C. R. Taber (1969): The Theory and Practice of Translation, Leiden: E. J. Brill.
98. P. K. Kalyani, Translation Studies, Creative Books, New Delhi, 2001

99. Robinson, D. (1997b):What is translation? : centrifugal theories, critical interventions Kent Ohio: Kent State University Press.
100. Robinson, Douglas. (1991). The Translator’s Turn. Baltimore and London: Johns Hopkins University Press.
101. Roy Longer, The Concept of Discourse in the Analysis of Complex Communication events, january, 1998
102. Sara Laviosa, Corpus-based Translation Studies: Theory, Findings, Applications
103. S. R Faruqu, Language, Literature and Translation. R. S. Gupta(ed) Literary Translation, Creative Books, New Delhi, 1999
104. Susan Petrilli (ed.). Translation Translation. Amsterdam/New York: Rodopi, 2003
105. Toury, Gideon. 2012. Descriptive Translation Studies and Beyond. Revised edition. Amsterdam/Philadelphia: John Benjamins.
106. Venuti, Lawrence. (2012). The Translation Studies Reader, 3rd ed. London: Routledge
107. Vennuti, L. (2000): The Translation Studies Reader, London: Routledge.
108. Vinay, Jean Paul and Jean Darbelnet. “A Methodology for Translation”. The Translation Studies Reader. Ed. Lawrence Venuti. London: Routledge, 2000
109. ViVian Cook and Benedetta Bassetti, Language and Bilingual Cognition,
110. Wills, W. (1996): Knowledge and Skills in Translation Behavior, Amsterdam: John Benjamins.
111. Yu Yuan, Universals of Translation: A Corpus-based Investigation of Chinese Translated Fiction.
112. Zoher Shevit, Politics of Children Literature, The University of Geargia Press, Athens and London, 1986

لغات وفرہنگ

113. فرہنگ ادبی اصطلاحات،کلیم الدین احمد،ترقی اردو بیورو،نئی دہلی،1987
114. فرہنگ آصفیہ
115. قومی انگریزی اردو لغت،ڈاکٹر جمیل جالبی
116. فیروز اللغات،مولوی فیروز الدین
117. المورد الحدیث،قاموس انکلیزی۔عربی،منیر البعلبکی
118. The Standard Enghlish Urdu Dictionary،مولوی عبدالحق
119. The Oxford English Dictionary, second edition
120. Oxford Advanced Lerner's Dictionary, 8th edition

121. English Urdu Dictionary, Beurue for Promotion of Urdu

122. The Oxford English Urdu Dictionary، شان الحق حقی

123. وحید الزماں قاسمی کیرانوی، القاموس الوحید

124. عبد الحفیظ بلیاوی، مصباح اللغات

رسائل و جرائد

125. Canadian Social Science, Vol.5 No.1 February 2009, A Cognitive-Pragmatic Model for Translation Studies Based on Relevance and Adaptation, Chang Zixia

126. الحذف فی اللغة العربیة، ا۔ م۔ د۔ یونس حمش خلف محمد، مجله ابحاث کلیة التربیة الاساسیة ،جلد10،عدد2،ص283

127. Journal of the College of Arts. University of Basrah No. (51) 2010)Discourse Analysis for Translation with Special Reference to the Consecutive Interpreter's Training, Abdul Salam Abdul Majeed Sayfuldeen.

128. Journal of Academic and Applied Studies (Special Issue on Applied Linguistics) Vol. 3 (8) August 2013, pp. 13-21, The Role of Culture in Translation, Monireh Akbari,Franco Aixela (1996)

129. Academic Journal of Interdisciplinary Studies Published by MCSER-CEMAS-Sapienza University of Rome, Vol 2, No 1,March 2013. Applying Critical Discourse Analysis in Translation of Political Speeches and Interviews

130. V. N. Komissarov TTR: traduction, terminologie, rédaction, vol. 4,n 1,1991,Language and Culture in Translation: Competitors or Collaborators?

131. ELT Journal Volume 54/4 October 2000 © Oxford University Press 2000, Wenying Jiang, The relationship between culture and language.

132. INJAl, vol.XX,no. 4, 1954, J.B.Casagrande, "TheEnds of Translation."

133.
جرنل آف اسلامک اینڈ ریلیجس اسٹیڈیز، جنوری-جون، 2018

ویب سائٹس

134. The Importance of Translation, (posted on February 18, 2013, by Mattingdigo),http://indigotrust.org. uk/2013/02/18/the-importance-of-translation/

135. BHASHA | GANESH DEVY | PEOPLE'S LINGUISTIC SURVEY OF INDIA ,(http://blogs.reuters.com/india/2013/09/07/india-speaks-780-languages-220-lost-in-last

136. http://en.wikipedia.org/wiki/Languages_of_India

137. http://www.anukriti.net/pgdts/course411/ch1h.html
138. Zttp://translation-blog.trustedtranslations.com./translating-acronyms-and-abbreviat ions-2012-06-07.html)
139. Dealing with Abbreviations In Translation,By Adetola Bankole,Department of Foreign Languages, Lagos State University, http:// www. translationdirectory. com/ articles/article1201.h
140. http://www.wisegeek.org/what-is-discourse.htm
141. http://www.massey.ac.nz/~alock/theory/foucault.htm
142. http://go.war wic kac.uk/globalpadint ercultural)
143. http://www.startimes.com/f.aspx?t=30872875
144. http://fridayspecial.com.pk/17567
145. https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_English_words_of_Arabic_origin_(A-B)
146. http://www.darululoom-deoband.com/urdu/magaznew//tmp/07-Quran%20Hakim%20 Ke%20Tarjume_MDU_10-11_Oct%20&%20Nov_ 12.ht)